برصغیر میں فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید: جہات واثرات کا تجزیاتی مطالعہ

(مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی علومِ اسلامیہ)

مقالہ نگار

صائمہ بشیر

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

رجسٹریشن نمبر:739-PhD/IS/S18

شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

مئی، 2025ء

برصغیر میں فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید: جہات واثرات کا تجزیاتی مطالعہ

(مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی علومِ اسلامیہ)

مقالہ نگار

صائمہ بشیر

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اسلامی فکر وثقافت

رجسٹریشن نمبر:739-PhD/IS/S18

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی

پروفیسر، شعبہ اسلامی فکر وثقافت

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

شعبہ اسلامی فکر وثقافت

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

سیشن 2018ء-2024ء

©صائمہ بشیر

بسم الله الرحمن الرحيم

منظوری فارم برائے مقالہ و دفاع مقالہ

(Thesis and Defence Approval Form)

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالہ کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف سوشل سائنسز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالہ بعنوان: **برصغیر میں فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید: جہات واثرات کا تجزیاتی مطالعہ**

Translation of Title in English & Roman:
The Reconstruction of Islamic Thought in the Subcontinent: An Analytical Study of Aspects and Effects
Bar-e-Sagheer Mein Fikr-e-Islami Ki Tashkeel-e-Jadeed: Jahat o Asraat Ka Tajziyati Mutala

نام ڈگری: ڈاکٹر آف فلاسفی علوم اسلامیہ

نام مقالہ نگار: صائمہ بشیر

رجسٹریشن نمبر: 739-PhD/IS/S18

رول نمبر: PD-IS-S18-111

پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی
(نگران مقالہ) ____________________ دستخط نگران مقالہ

ڈاکٹر ریاض احمد سعید
(صدر، شعبہ اسلامی فکر و ثقافت) ____________________ دستخط صدر، شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

پروفیسر ڈاکٹر ریاض شاد
(ڈین، فیکلٹی آف سوشل سائنسز) ____________________ دستخط ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز

میجر جنرل (ر) شاہد محمود کیانی (ہلال امتیاز ملٹری)
(ریکٹر، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد) ____________________ دستخط ریکٹر نمل

تاریخ: ____________________

حلف نامہ فارم

(Canidate Declaration Form)

میں: **صائمہ بشیر** ولد: **بشیر احمد ناصر**

رول نمبر:111-PD-SP-19 رجسٹریشن نمبر739 -PhD/IS/S-18

طالبہ، پی ایچ ڈی، شعبہ علوم اسلامیہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (نمل) اسلام آباد حلفا اقرار کرتی ہوں کہ

مقالہ بعنوان: **برصغیر میں فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید: جہات و اثرات کا تجزیاتی مطالعہ**

Translation of Title in English & Roman:
The Reconstruction of Islamic Thought in the Subcontinent: An Analytical Study of Aspects and Effects
Bar e Sagheer main Fikr e Islami ki Tashkeel e Jadeed: Jihat o Asrat ka Tajziyati Mutalah

پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے سلسلہ میں پیش کیا گیا ہے اور **پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی** کی نگرانی میں تحریر کیا گیا ہے۔ راقم الحروف کا اصل کام ہے، اور یہ کہ مذکورہ کام نہ تو کہیں اور جمع کرایا گیا ہے، اور نہ ہی پہلے سے شائع شدہ ہے، اور نہ ہی مستقبل میں کسی بھی ڈگری کے حصول کے لئے کسی دوسری یونیورسٹی یا ادارے میں میری طرف سے پیش کیا جائے گا۔

نام مقالہ نگار: **صائمہ بشیر**

دستخط نگران تحقیق: ____________

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

Abstract

This research examines the reconstruction of Islamic Thought in the Indian Subcontinent, through a comprehensive analytical study of its various aspects and effects. Using a qualitative research methodology, incorporating discourse analysis and content analysis, the study investigates how Islamic Thought has evolved and adapted in response to modern challenges while maintaining its fundamental principles. The research addresses the critical challenge of reconciling traditional Islamic concepts with modern demands, particularly during the significant transformations of the nineteenth through twenty-first centuries, examining how this process of reconstruction has influenced social, political, and cultural dynamics in the region. The study posits that the reconstruction of Islamic thought in the subcontinent represents a continuous process of adaptation and renewal, shaped by both internal religious dynamics and external socio-political factors, leading to distinctive intellectual movements that have significantly influenced Muslim society's development. Through analysis of primary sources - including classical Islamic texts, historical documents, and contemporary scholarly works - the research investigates the advent of Islam and its propagation mechanisms in the subcontinent. It further examines the necessity for reform, analyzes dimensions of Islamic thought's revival, and studies the role of key personalities in this process. The findings reveal that the reconstruction of Islamic thought in the subcontinent has been characterized by a continuous dialogue between traditional Islamic scholarship and modern intellectual challenges, the emergence of distinct schools of thought addressing various aspects of religious reform, and significant contributions by key reformist figures who developed new methodologies for interpreting Islamic principles. The research outlines how educational institutions and movements facilitated this process of intellectual renewal, fostering new approaches to religious understanding. The study concludes that this reconstruction process has dynamically influenced Muslim society's social, political, and religious dimensions yet maintains its connection to fundamental Islamic principles, thereby contributing to the understanding of how religious thought adapts to evolving societal contexts whilst safeguarding its essential character.

Keywords: *Reconstruction, Islamic Thought, Reform Movements, Indian Subcontinent, Modern Challenges, Socio-political dynamics*

ملخص مقالہ

یہ تحقیق برِ صغیر میں اسلامی فکر کی تشکیلِ نو کا جامع تجزیاتی مطالعہ ہے، جو اس کے مختلف پہلوؤں اور اثرات کا احاطہ کرتی ہے۔ تحقیق میں معیاری (Qualitative) تحقیقاتی طریقہ کار اپنایا گیا ہے، جس میں خطابی تجزیہ (Discourse Analysis) اور مواد کا تجزیہ (Content Analysis) شامل ہے۔ اس کے ذریعے یہ جائزہ لیا گیا ہے کہ اسلامی فکر کس طرح جدید چیلنجز کے تناظر میں اپنی بنیادی اقدار کو برقرار رکھتے ہوئے ارتقاء پذیر ہوئی اور اس نے خود کو ہم آہنگ کیا۔ تحقیق کا مرکزی موضوع یہ ہے کہ کس طرح روایتی اسلامی تصورات کو جدید تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے، بالخصوص انیسویں سے اکیسویں صدی تک آنے والی بڑی تبدیلیوں کے دوران، اور اس تشکیلِ نو کے عمل نے اس خطے کی سماجی، سیاسی اور ثقافتی حرکیات پر کیا اثرات مرتب کیے۔

تحقیق یہ مفروضہ پیش کرتی ہے کہ برصغیر میں اسلامی فکر کی تشکیلِ نو ایک مسلسل جاری رہنے والا عمل ہے، جو اندرونی مذہبی عوامل اور بیرونی معاشرتی و سیاسی اثرات سے تشکیل پاتا رہا ہے، اور اس کے نتیجے میں منفرد فکری تحریکیں سامنے آئیں جنھوں نے مسلم معاشرے کی تشکیل و ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔

تحقیقی عمل میں بنیادی ماخذات کا تجزیہ کیا گیا ہے، جن میں کلاسیکی اسلامی متون، تاریخی دستاویزات، اور معاصر علمی تحریریں شامل ہیں۔ اس میں برصغیر میں اسلام کے ورود اور اس کے پھیلاؤ کے ذرائع کا جائزہ لیا گیا ہے، اصلاح کی ضرورت پر بحث کی گئی ہے، اسلامی فکر کی تجدید کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کیا گیا ہے، اور اس عمل میں اہم شخصیات کے کردار کو اجاگر کیا گیا ہے۔

تحقیق کے نتائج سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فکر کی تشکیلِ نو کا یہ عمل روایتی اسلامی علم اور جدید فکری چیلنجز کے درمیان مسلسل مکالمے پر مشتمل ہے۔ اس دوران مختلف مکاتبِ فکر اور اصلاحی تحریکیں ابھریں جنھوں نے مذہبی اصولوں کی نئی تعبیرات پیش کیں۔ اہم مصلح شخصیات نے اسلامی اصولوں کی تعبیر کے لیے نئے طریقہ کار متعارف کرائے۔ تعلیم کے اداروں اور تحریکوں نے اس فکری تجدید کے عمل میں اہم کردار ادا کیا اور دینی فہم کے نئے زاویے سامنے لائے۔

تحقیق اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ اسلامی فکر کی یہ تشکیلِ نو مسلم معاشرے کے سماجی، سیاسی اور مذہبی پہلوؤں کو متحرک انداز میں متاثر کرتی رہی ہے، تاہم اس کے باوجود اس کا تعلق اسلامی اصولوں کی اساس سے مضبوطی سے قائم رہا، اور یہی بات اس امر کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے کہ دینی فکر وقت کے بدلتے حالات سے ہم آہنگ ہو کر بھی اپنی اصل شناخت کو کیسے برقرار رکھتی ہے۔

کلیدی الفاظ: تشکیلِ نو، اسلامی فکر، اصلاحی تحریکیں، برصغیر، جدید چیلنجز، سماجی و سیاسی حرکیات۔

فہرست

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار
II	منظوری فارم برائے مقالہ و دفاع مقالہ(Thesis Acceptance Form)	1.
III	حلف نامہ(Declaration)	2.
IV	ملخص(Abstract)	3.
VI	فہرست مضامین(List of Contents)	4.
XV	اظہار تشکر(Acknowledgement)	5.
XVI	انتساب(Dedication)	6.
1	**باب اول: موضوعِ تحقیق سے متعلق تعارفی مباحث**	7.
2	**فصل اول: موضوع تحقیق کا تعارف اور ضرورت و اہمیت**	8.
2	موضوع تحقیق کا تعارف	9.
3	فکر اسلامی کی تعریفات	10.
6	فکر اسلامی بر صغیر میں	11.
8	تحقیق ہٰذا کی ضرورت و اہمیت	12.
10	**فصل دوم: سابقہ تحقیقی کام کا جائزہ اور جوازِ تحقیق**	13.
10	**سابقہ تحقیقی کام(Review of Literature)**	14.
10	تاریخی پس منظر اور تعلیمی اصلاحات سے متعلق اہم کتب	15.
13	تحقیقی مضامین	16.
14	اجتہاد اور تجدیدی فکر پر تحقیقی کام	17.
17	اسلامی تحریکات اور شخصیات سے متعلق کام	18.
22	مغربی اثرات کے مطالعہ پر تحقیق	19.
25	**جوازِ تحقیق(Rationale of the Study)**	20.

27	**فصل سوم: بنیادی سوالات، مقاصد اور منہجِ تحقیق**	.21
27	بیان مسئلہ اور مقاصد تحقیق	.22
27	بنیادی سوالات	.23
28	منہج تحقیق	.24
29	حدوود اور دائرہ کار	.25
30	ابواب و فصول کی تقسیم و ترتیب	.26
32	**باب دوم: بر صغیر میں اسلام کی آمد اور فکر اسلامی کی ترویج**	.27
34	**فصل اول: فکرِ اسلامی کا توضیحی مطالعہ**	.28
36	فکر اسلامی کا تصور اور نوعیت	.29
38	فکر اسلامی کی تاریخ	.30
41	فکر اسلامی کی وسعت	.31
46	فکر اسلامی کے بنیادی مآخذ	.32
47	قرآن حکیم فکر اسلامی کی بنیاد	.33
51	حدیث و سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بطور ماخذ فکر	.34
56	اجتہاد اور فکر اسلامی	.35
61	فکر اسلامی کے بنیادی عناصر	.36
63	ایمانیات	.37
66	عبادات	.38
68	اخلاق و معاملہ	.39
69	خلاصہ بحث	.40
70	**فصل دوم: بر صغیر میں اسلام کی آمد اور فکر اسلامی کی ترویج** (ساتویں سے پندرہویں صدی عیسوی تک کا دور)	.41
70	اہل عرب کے بر صغیر سے تعلقات اور عرب تجار	.42

43.	برصغیر میں اسلام کی ابتدائی کرنیں	72
44.	مسلم فاتحین کا کردار	73
45.	قطب الدین ایبک سے سلطنت دہلی کا آغاز	76
46.	علماء کا کردار	78
47.	صوفیاء کا کردار	79
48.	خلاصہ بحث	83
49.	**باب سوم: برصغیر میں فکر اسلامی کی اصلاح وتجدید کے محرکات اور ابتدائی تحریکات** (سولھویں سے اٹھارہویں صدی تک کی کاوشوں کا جائزہ)	85
50.	**فصل اول: برصغیر میں فکر اسلامی کی تجدید واصلاح کا جواز اور پس منظر**	87
51.	داخلی وخارجی عناصر	87
52.	تہذیبی عدم فعالیت	88
53.	لامرکزیت اور سماجی انتشار	89
54.	اخلاقی انحطاط	90
55.	ضعیف الاعتقادی اور مذہبی بے اعتدالی	91
56.	فکری زوال کے نمایاں اسباب	91
57.	نوآبادیاتی نظام کے اثرات	93
58.	حفاظت دین کا خدائی اہتمام	95
59.	فکر اسلامی کی اصلاح وتجدید کی حقیقت ونوعیت	95
60.	احیائے فکر کی مساعی	97
61.	**فصل دوم: اصلاح وتجدید کی ابتدائی تحریکات کے کارنامے**	100
62.	تحریک اصلاح کا آغاز	100
63.	**شیخ عبدالحق محدث دہلوی(1551ء–1642ء) کے اصلاحی تحریک**	101

102	**شیخ احمد سرہندی(1564ء–1625ء)اور ان کا تجدیدی کام**	.64
104	شیخ سرہندی کے کام کی نوعیت	.65
105	شیخ کا تجدیدی کارنامہ	.66
107	**حضرت شاہ ولی اللہ(1703ء–1762ء)کا تجدیدی کارنامہ**	.67
108	قرآن و سنت کی طرف رجوع	.68
109	فکر اسلامی کی تشکیل و تجدید	.69
111	عدل اجتماعی کے لیے فکری نظام	.70
113	شاہ ولی اللہ کے تجدیدی کام کی نوعیت و وسعت	.71
117	**باب چہارم: برصغیر میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی جہات** (انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کا جائزہ)	.72
119	**فصل اول: روایت پسند علماء کی تحاریک**	.73
119	**سید احمد شہید(1786ء–1831ء)اور ان کی تحریک مجاہدین**	.74
120	بدعات کے خلاف مزاحمت	.75
122	فکری اور عملی اصلاح کی تحریک	.76
123	شریعت الٰہیہ کے نفاذ کی کوشش	.77
124	قوت و اختیار کا حصول برائے عملی اصلاح	.78
125	تحریک جہاد اور اس کا مرکزی نقطہ	.79
126	**مولانا رشید احمد گنگوہی(1829ء–1905ء)اور اصلاح فکر اسلامی میں ان کی کاوشیں**	.80
127	تزکیہ باطن اور فکری تعلیم و تربیت	.81
130	تصنیفی خدمات کے ذریعے اصلاحی کام	.82
133	**مولانا قاسم نانوتوی(1833ء–1880ء)اور دارالعلوم دیوبند**	.83
133	علمی و تعلیمی اِصلاحات	.84

85.	قدیم وجدید کا امتزاج	134
86.	دینی مستقبل کی تعمیر	136
87.	دارالعلوم دیوبند کے کام کی نوعیت	137
88.	**مولانا محمود الحسن (1851ء-1920ء) اور ان کے اصلاحی کارنامے**	139
89.	تعلیمی وتدریسی خدمات	139
90.	اصلاح وتزکیہ کی مساعی	140
91.	علمی تصانیف کے ذریعے تجدید واصلاح	141
92.	**مولانا احمد رضا بریلوی (1856ء-1921ء) اور ان کی فکری واصلاحی جدوجہد**	145
93.	احمد رضا بریلوی کا فکری اور اصلاحی کارنامہ	146
94.	علم حدیث وفقہ کے ذریعے تجدیدی کام	149
95.	**مولانا سید حسین احمد مدنی (1879ء-1957ء) اور ان کا اجتہادی کام**	152
96.	تحریکوں کی قیادت اور مجاہدانہ کارنامے	154
97.	تلخیص مطالعہ	156
98.	**فصل دوم: تجدد پسند مفکرین کے فکری رجحانات**	158
99.	تعارف وپس منظر	158
100.	**سرسید احمد خان (1817ء-1898ء) اور ان کی تعلیمی اور فکری تحریک**	159
101.	جدت فکر کے داعی	160
102.	سرسید کا سیاسی وسماجی نظریہ	160
103.	مسلم سماج کے فکری احیاء کی مساعی	162
104.	عقلی تفہیم قرآن اور اصول تفسیر	164
105.	آیات کی مختلف فیہ تعبیرات	167
106.	نقد حدیث میں سرسید کا نظریہ	169
107.	ولیم میور کے الزامات کا جواب	171

174	**مولوی چراغ علی(1844ء-1895ء)کا فکری رجحان**	.108
175	اسلامی قانون کے منابع سے متعلق نقطہ نظر	.109
177	اجماع اور اجتہاد سے متعلق عقلیت پسندانہ نقطہ نظر	.110
178	اسلامی فقہ کی تدوین نو کی ضرورت	.111
180	**سید امیر علی(1849ء-1928ء)کے فکری رجحانات**	.112
181	مذہبی فکر کا زاویہ	.113
182	اسلامی فکر کا دفاع	.114
183	مسئلہ غلامی اور تعدد ازواج	.115
184	اسلام میں عورت کا مقام	.116
185	**غلام احمد پرویز(1903ء-1984ء)کے فکری رجحانات**	.117
186	پرویز کا طرز فکر	.118
188	اسلامی معاشرہ کی تشکیل و تجدید کے لیے قرآنی لائحہ عمل	.119
189	تفہیم و تفسیر قرآن کا منفرد عقلی رجحان	.120
189	عقائد کی کلامی توضیحات	.121
191	مرکز ملت کا تصور	.122
191	**علامہ عنایت اللہ مشرقی(1888ء-1963ء)کی فکری تحریک**	.123
191	تعقل پرست مفکر	.124
192	تحریک خاکسار	.125
196	**مولانا عبد اللہ چکڑالوی(1903ء-1976ء)کا طرز فکر**	.126
196	تصور قرآن و حدیث	.127
198	عقائد اور معجزات سے متعلق نقطہ نظر	.128
199	تلخیص بحث	.129
201	**فصل دوم: جدت پسند علماء و مفکرین کی تجدیدی کاوشیں**	.130
201	تعارف و تبصرہ	.131

202	**مولانا شبلی نعمانی (1857ء-1914ء) اور ان کا مکتب تجدید**	.132
202	سیرت و تاریخ کا مطالعہ جدید	.133
203	غیر مسلموں کے ساتھ موالات کا معاملہ	.134
204	کلاسیکی علوم کی تجدید کی ضرورت	.135
206	ندوہ العلماء کی فکری جدوجہد	.136
208	**علامہ اقبال (1876ء-1938ء) اور مسلم نشاۃ ثانیہ**	.137
208	اسلامی اقدار کی عالمگیری	.138
210	اسلام کا علمی و فکری رویہ	.139
211	تصور زمان و مکان، حرکت اور انقلاب	.140
212	توحید مرکز فکر	.141
213	تخلیق آدم اور ہبوط کا مقصد عالی	.142
214	تصور اجتہاد کے ذریعے سماجی ارتقاء	.143
214	نبی آخر الزماں ﷺ انسان کامل	.144
216	قرآن کے ذریعے مسائل کا حل	.145
217	سامراج کا زوال اور امت مسلمہ کی بیداری	.146
218	**مولانا ابوالکلام آزاد (1888ء-1958ء) کی تحریک فکر**	.147
219	ابوالکلام اور مسلم تحریکات	.148
219	قرآن کی روشنی میں فکری جدیدیت	.149
221	مذاہب کا تقابل اور مخلوط قومیت کا نظریہ	.150
222	تحریک نظم جماعت اور اصلاح فکر	.151
224	مسئلہ نظم جماعت اور جمعیت علمائے ہند	.152
225	**سید ابوالاعلیٰ مودودی (1903ء-1979ء) اور احیاء و اقامت دین کی تحریک**	.153
226	فکر اسلامی کی تجدید میں سب سے توانا تحریک	.154
227	قرآن کا تصور الٰہ اور تصور کائنات، بطور محرک عمل	.155

.156	جہاد فی سبیل اللہ کی ضروری توضیح	228
.157	احیائے امت کے لیے موزوں قیادت کی تیاری	229
.158	تجدید واحیائے دین کا لائحہ عمل	230
.159	اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں	235
.160	**مولانا وحید الدین خان (1925ء-2024ء) کی دعوت فکر**	236
.161	دینی فکر اور عملی خدمات	237
.162	دعوت فکر اور دعوت دین بالقرآن	239
.163	امت وسط کا مرتبہ اور فریضہ	240
.164	مولانا وحید الدین خان کی تجدیدی فکر	242
.165	**علامہ جاوید احمد غامدی (1951ء---) اور ان کے افکار**	244
.166	علمی وفکری خدمات	245
.167	جاوید احمد غامدی کی فکر جدید اصلاح و تعبیر اور تشریح	247
.168	تعبیر و تشریح کے اصول	248
.169	**باب پنجم: برصغیر پر فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید کے اثرات کا جائزہ**	250
.170	**فصل اول: معاشرتی فکر پر اثرات**	251
.171	قومی دینی ادب	251
.172	اسلامی قومیت	253
.173	تنظیم اور تبلیغ کی تحاریک	254
.174	تحریک علی گڑھ کے ثقافتی وسماجی اثرات	256
.175	تحریک ریشمی رومال کے سماجی و تہذیبی اثرات	262
.176	تلخیص بحث	265
.177	**فصل دوم: سیاسی فکر پر اثرات**	266
.178	طرز فکر اور طرز سیاست میں تبدیلی	266

179.	اسلام کے سیاسی افکار کا احیاء	268
180.	سیاسی شعور اور تحریک جہاد	270
181.	1857ء کی تحریک بغاوت	271
182.	تحریک علمائے ہند کے سیاسی اثرات	277
183.	تصور خلافت کا احیاء و تحریک	279
184.	تحریک احرار اور جمعیت علمائے ہند	280
185.	علماء کی معاشرتی تحریک کے سیاسی اثرات	281
186.	فکر اقبال پر مبنی تحریک ملت اور پاکستان	284
187.	تلخیص بحث	286
188.	**فصل سوم: دینی فکر پر اثرات**	287
189.	اصلاح فکر و عمل	287
190.	سماجی و معاشرتی اصلاحات	289
191.	روایتی علوم اور عصری علوم کی ترویج	292
192.	فکر اسلامی کی تجدید و تطہیر	295
193.	احیائے اسلام کا مراکز	299
194.	**خلاصہ بحث**	300
195.	**نتائج تحقیق**	301
196.	**سفارشات**	306
197.	فہرستِ آیات	307
198.	فہرستِ احادیث	311
199.	فہرستِ اصطلاحات	312
200.	مصادر و مراجع	314

اظہارِ تشکر(Acknowledgement)

بے حد عجز و انکسار، محبت اور تشکر کے ساتھ، تمام تعریفیں اُس ربِ کریم، اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے لیے، جو دلوں کے بھید جانتا ہے، جو ہماری کاوشوں کو ثمر بخشتا ہے، اور جس کی رحمت و محبتِ کاملہ کے بغیر کوئی کام ممکن نہیں۔ اسی رب کی عنایتوں اور فضل کے طفیل یہ تحقیقی مقالہ اپنی تکمیل کو پہنچا۔ اور بے شمار درود و سلام ہو رحمۃ للعالمین، معلمِ انسانیت، سیدنا محمدِ مصطفی ﷺ پر، جن کی فکرِ مقدس نے تاریک ذہنوں کو نورِ بصیرت عطا کیا، دلوں کو سکون بخشا، اور انسانیت کو امن، رواداری، اخوت، اور محبت کی ابدی تعلیمات سے روشناس فرمایا۔

میں انتہائی محبت اور خلوص کے ساتھ اپنے محترم، مشفق، اور قابلِ قدر استاد ڈاکٹر پروفیسر مستفیض احمد علوی صاحب کی شکر گزار ہوں، جنہوں نے اپنی شفقت، رہنمائی، اور محبت سے میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے اس علمی سفر کو مکمل کرنے میں مدد دی۔ اسی طرح، صدرِ شعبہ اسلامی فکر و ثقافت، جامعہ نمل اسلام آباد، ڈاکٹر ریاض احمد سعید صاحب کی بے حد ممنون ہوں، جن کی رہنمائی، محبت، اور مؤثر تعاون نے میرے تحقیقی مراحل کو آسان بنایا۔ اور اپنے تمام قابلِ احترام اساتذہ، شعبہ اسلامی فکر و ثقافت، کی محبت، شفقت، اور حوصلہ افزائی کے لیے دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس جامعہ کو مزید عزت، مقام، اور ترقی عطا فرمائے۔

علاوہ ازیں اپنے تمام احباب اور معاون رفقاء کی ممنون ہوں، جنہوں نے اس علمی سفر میں میرا ساتھ دیا۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی لائبریری (فیصل مسجد) اور ڈاکٹر حمید اللہ لائبریری (جامعہ نمل) کے تمام عملے کی بھی تہہ دل سے مشکور ہوں، جنہوں نے مطلوبہ کتب اور مواد کی فراہمی میں بھرپور تعاون کیا۔

بالخصوص میری پیاری امی جان، جن کی دعائیں میرا سب سے بڑا سہارا رہیں، آپ کی محبت اور قربانیوں کا قرض کبھی ادا نہیں ہو سکتا۔ میرے محترم ابو جان، جنہوں نے مجھے علم کی روشنی سے آشنا کروایا، اللہ تعالیٰ آپ کو اس محبت کے بدلے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ اپنے شفیق ساس، سسر اور اپنے عزیز ترین ساتھی محمد سعد چیمہ کی بے حد شکر گزار ہوں، جنہوں نے محبت اور تعاون سے مجھے گھریلو ذمہ داریوں سے آزاد رکھا، تاکہ میں یکسوئی کے ساتھ اپنی تحقیق مکمل کر سکوں۔

جزاکم اللہ خیراً کثیراً

صائمہ بشیر

پی ایچ ڈی اسکالر

جامعہ نمل اسلام آباد

انتساب(Dedication)

بصد خلوص و محبت،

معلمِ انسانیت، سید الانبیاء، رحمۃ للعالمین، **حضرت سیدنا محمدِ مصطفی ﷺ** کے نام، جن کی فکرِ مقدس نے تاریک ذہنوں کو نورِ بصیرت عطا کیا، دلوں کو سکونِ حقیقی بخشا، اور انسانیت کو امن، رواداری، اخوت، محبت، اور اخلاص کی ابدی تعلیمات سے روشناس کیا۔ اور ان عظیم المرتبت، وفا شعار، محبت گزار **بنینِ امت کے نام**، جنہوں نے فکرِ اسلامی کے احیاء، حفاظت، اور سربلندی کی خاطر اپنی زندگیاں وقف کر دیں، اور جن کی قربانیاں تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ سنہری حروف سے لکھی جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

باب اول: موضوعِ تحقیق سے متعلق تعارفی مباحث

فصل اول: موضوع تحقیق کا تعارف اور ضرورت واہمیت

فصل دوم: سابقہ تحقیقی کام کا جائزہ اور جوازِ تحقیق

فصل سوم: سوالاتِ تحقیق، مقاصد اور منہجِ تحقیق

باب اول:

موضوعِ تحقیق سے متعلق تعارفی مباحث

زیر نظر تحقیق کا پہلا باب موضوع سے متعلق تعارفی مباحث پر مشتمل ہے۔ فصل اول میں ایک تو موضوع تحقیق کا تعارف اور اس کی علمی و فکری اہمیت سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرا، فکر اسلامی کا تعارف اور تعریفات شامل کی گئی ہیں اور تیسرا بر صغیر میں اسلامی فکر کی تاریخ کا مختصر طور پر جائزہ لیا گیا ہے، اور تحقیق مزید کی ضرورت کو واضح کیا گیا ہے۔ فصل دوم میں موضوع تحقیق سے متعلق سابقہ اور معاصر تحقیقات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، جس میں بر صغیر میں اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید کے حوالے سے موجود تحقیقی کام کو پرکھا گیا ہے اور اس ضمن میں مزید تحقیق کے جواز کی نشاندہی کی گئی ہے۔ فصل سوم میں تحقیقی مقالہ کے منہجی اور تکنیکی پہلوؤں کی وضاحت کی گئی ہے، جس میں بنیادی مسئلے کی نوعیت، مقاصد، بنیادی سوالات، اور ان کے جوابات کے حصول کے لیے اختیار کیے جانے والے طریقہ کار کی تفصیلات شامل ہیں۔

فصل اول:

موضوع تحقیق کا تعارف اور ضرورت و اہمیت

موضوع تحقیق کا تعارف:

انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہدایت اور راہنمائی ہے، اور اسلامی فکر اسی ہدایت کی سب سے بڑی داعی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَى﴾[1]

(کہہ دو کہ ہدایت کا راستہ وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے۔)

بلاشبہ اسلامی فکر کا سرچشمہ قرآن و حدیث ہے۔ ان میں پیش کی گئی فکر جب تک غیر اسلامی اثرات سے محفوظ رہی، اس میں کسی قسم کی پیچیدگی یا تضاد پیدا نہیں ہوا۔ تاہم، جب اسلام کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور مختلف تہذیبوں اور اقوام سے مکالمہ یا مقابلہ ہوتا ہے، اور زمانے کے تقاضے سامنے آتے ہیں تو فکرِ اسلامی کی تعبیرات اور تشریحات کی تطبیق میں اختلافات در آتے ہیں، جس کا ایک نتیجہ تو مثبت اور تعمیری ارتقا کی صورت میں نکلتا ہے تو دوسری طرف بعض اوقات منفی صورت بھی پیدا ہوتی ہے جس سے فکری اضمحلال یا پھر انتشار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو امت مسلمہ کے زوال کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔

برصغیر قرن اول سے اسلامی تہذیب کے ساتھ مکالمے میں آگیا۔ لہٰذا، یہاں کی مخصوص مذہبی و تہذیبی روایت کے ساتھ مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان بھی جڑی ہوئی ہے۔ برصغیر پاک و ہند اس لحاظ سے بھی ایک منفرد خطہ ہے کہ جہاں مختلف تہذیبوں اور مذاہب کا ملاپ ہوا ہے۔ یہاں اسلامی فکر نے اپنی ایک منفرد شکل اختیار کی، مگر ہندو سماج کے اثرات اور پھر مغربی استعمار کے دور میں یہ فکر شدید چیلنجز کا شکار ہوگئی۔

لہٰذا، برصغیر میں اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید ایک مسلسل جاری و ساری فکری اور سماجی عمل رہا ہے، جو مختلف تاریخی، ثقافتی، اور علمی عوامل کے زیرِ اثر پروان چڑھا۔ ہر دور میں، اسلامی فکر نے اپنی اصل کو برقرار رکھتے ہوئے نئے فکری اور سماجی چیلنجز کا سامنا کیا اور خود کو ان کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔

اسی وجہ سے برصغیر میں اسلامی فکر کے عروج و زوال کی داستان کے ساتھ اس کی تشکیلِ جدید کے سفر کا مطالعہ بھی ضروری ہے تاکہ جدید دور میں اسلامی فکر کو درپیش مسائل کو بہتر طور پر سمجھا جاسکے کیونکہ اکیسویں صدی میں عالمی سطح پر تیزی سے ہونے والی سماجی، سیاسی، اور علمی تبدیلیوں نے اسلامی فکر کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی

---

1 البقرۃ 120:2

ضرورت کو مزید بڑھادیا ہے۔

تحقیق ہٰذا کا کلیدی کام یہ ہے کہ برصغیر میں اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید کے مختلف دھاروں کو ایک مربوط تحقیقی تناظر میں پیش کیا جائے، جو معاصر تحدیات کے پیمانے پر پورے اترتے ہوں۔ اس لیے زیر نظر تحقیق برصغیر میں اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے، خصوصاً معاشرتی، ثقافتی اور سیاسی اثرات کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتی ہے۔

یہ مطالعہ نہ صرف برصغیر میں اسلامی تعلیمات کے علمی و فکری ارتقاء کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے، بلکہ عصرِ حاضر کے فکری و نظریاتی چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے علمی راہِ کار بھی فراہم کرتا ہے۔ اس تحقیقی مقالہ کے ذریعے برصغیر میں اسلامی فکر کی تاریخی ترقی کا مطالعہ کیا گیا ہے تاکہ جانا جاسکے کہ کس طرح مختلف ادوار میں اسلامی فکر کا ارتقاء ہوا اور اس نے یہاں کی تہذیب و تمدن کو کیسے متاثر کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان اہم شخصیات اور تحریکات کے کردار کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے، جنہوں نے اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

دراین بیان یہ تحقیق برصغیر میں فکرِ اسلامی کے مختلف پہلوؤں کا جامع تجزیہ پیش کرتی ہے۔ اس مطالعے کے ذریعے ماضی کی علمی و عملی مساعی کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ موجودہ دور کے چیلنجز اور مسائل کے حل کے لیے بھی رہنمائی فراہم کی گئی ہے۔

فکرِ اسلامی کی تعریفات:

انسان اپنی قوتِ فکر و نظر کے باعث دیگر مخلوق سے ممتاز ہے۔ یہی اوصاف اسے افضلیت کے مقام پر فائز کرتے ہیں اور اس سے تقاضا کرتے ہیں کہ وہ اپنے مقصدِ حیات کو سمجھے اور اس کے مطابق عمل کرے۔ نیز اس امتیازی وصف کا اولین تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے مقصدِ حیات کو سمجھے اور خلافتِ ارضی کے فرائض کو کماحقہ ادا کرے۔ یہ غور و فکر انسان کو زندگی کے مسائل کے حل اور کائنات کے نظام کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں یہی تدبر و تفکر، انسان کو اللہ کی وحدانیت، کائنات کے مقصد، اور اپنے فرائض کی ادائیگی کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں بار بار انسان کو غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے تاکہ اس کی فکری بنیادیں مستحکم ہوں اور وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بہتر طور پر سنوار سکے۔ غور و فکر، عقل کے استعمال، اور اجتہاد کو اسلام میں ایک بنیادی اصول کے طور پر پیش کیا گیا ہے تاکہ انسان نہ صرف دین کو بہتر انداز میں سمجھے بلکہ عملی زندگی میں بھی راہنمائی حاصل کرے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ﴾[1]

---

1 محمد 47:24

(کیا یہ لوگ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے)

اسی طرح حدیثِ نبی ﷺ میں فرمایا کہ:

((إذا اجتهد الحاكم فأصاب فله أجران، وإذا اجتهد فأخطأ فله أجر واحد))[1]

(اگر کوئی مجتہد اجتہاد کرے اور درست نتیجے پر پہنچے تو اسے دوہرا اجر ملے گا، اور اگر غلطی کرے تو بھی اسے ایک اجر ضرور ملے گا۔)

بلاشبہ انسان کے لئے راہِ ہدایت کا بنیادی سرچشمہ قرآن و حدیث ہیں۔ اسلام نے انسانیت کو وہ فکرِ اسلامی عطا کی، جس نے فرد کی سوچ اور معاشرت کے خدوخال کو یکسر تبدیل کر دیا۔ یہی فکرِ اسلامی نے قدامت پسند عرب معاشرے کو علم اور فہم کی نئی راہوں سے روشناس کیا اور ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں ایسا انقلاب برپا کیا جو آج تک روشن ہے۔ علاوہ زیں اس آفاقی فکر نے امن، رواداری، اخوت، محبت اور عدل و انصاف کے ایسے اصول دیے جو افراط و تفریط سے پاک ہیں اور ہر زمانے اور ہر معاشرے کے لیے قابلِ عمل ہیں۔

اسلامی فکر کا مفہوم بنیادی طور پر ان خیالات، تصورات اور تفکرات پر مشتمل ہے جو اسلامی اصولوں، عقائد اور تعلیمات سے ماخوذ ہوں۔ قرآن، حدیث اور اسلامی روایات کی روشنی میں جو عقلی اور فکری سرگرمیاں انجام دی جاتی ہیں، وہ اسلامی فکر کے دائرہ کار میں آتی ہیں۔ گویا اصطلاحی اعتبار سے، اسلامی فکر سے مراد اسلامی تعلیمات کے ساتھ منظم اور علمی سطح پر مشغولیت ہے، جس میں وحی اور عقل کے امتزاج سے الٰہیاتی، فلسفیانہ اور قانونی ابعاد کا تجزیہ کیا جاتا ہے[2]۔

یہ ایک جامع علمی روایت ہے[3] جس میں اسلامی اصولوں کی بنیاد پر عقلی، روحانی اور سائنسی علوم کو مربوط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسلامی فکر محض دینی معاملات تک محدود نہیں بلکہ اخلاقیات، سیاست، فلسفہ اور سائنس جیسے متنوع شعبوں پر بھی اثرانداز ہوتی ہے۔ اسی طرح فلسفے کے دائرہ کار میں، اسلامی فکر بنیادی اسلامی عقائد کے عقلی اور فلسفیانہ تجزیے پر مبنی ہے، جو انسانی علم، اخلاقیات اور مابعد الطبیعیات کے ساتھ اس کے تعلق کو واضح کرتی ہے۔

---

1 النووی، امام ابوزکریا یحییٰ بن شرف، **ریاض الصالحین**، (لاہور: دارالسلام، 2000ء)، حدیث نمبر 1856

2 Syed Muhammad Naquib Al-Attas, The Concept of Education in Islam: A Framework for an Islamic Philosophy of Education (*Kuala Lumpur: ISTAC*, 1991), 10–13.

Seyyed Hossein Nasr, Islamic Science: An Illustrated Study (*Bloomington: World Wisdom*, 2006), 11–18.

3 Please see: Majid Fakhry, *A History of Islamic Philosophy* (*New York: Columbia University Press*, 2004 p. 5-15

اسلامی فلسفہ، اسلامی عقائد اور فلسفیانہ منہج کے درمیان ایک ربط قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے، جس میں فارابی، ابن سینا، ابن رشد اور غزالی جیسے مفکرین نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اسلامی فقہ اور الہیات میں، اسلامی فکر کو ایک ایسی وسیع علمی روایت سمجھا جاتا ہے جو دینی عقائد کو قانونی اور اخلاقی استدلال کے ساتھ مربوط کرتی ہے تاکہ وحی الٰہی اور انسانی فہم میں ہم آہنگی پیدا کی جاسکے۔[1]

گویا اسلامی فکر (Islamic Thought) محض نظریاتی مباحث تک محدود نہیں بلکہ ایک متحرک اور عملی مظہر ہے جو انسانی زندگی کے متنوع پہلوؤں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسلامی فکر، انسانی زندگی کے تمام مسائل کے حل کے لیے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ اس فکر کی بنیاد حضرت آدم علیہ السلام سے رکھی گئی اور اس کی تکمیل نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے ذریعے ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے اسلام کے اصولِ تدریج کے تحت انسانیت کی تربیت و اصلاح فرمائی تاکہ فرد اسلامی فکر کی روشنی میں ایک کامیاب اور باکردار انسان کے طور پر سامنے آئے۔

اسلامی فکر کی بدولت دنیا نے یہ حقیقت تسلیم کی کہ اسلامی تعلیمات ہی انفرادی اور اجتماعی مسائل کا حقیقی اور پائیدار حل فراہم کرتی ہیں، بشرطیکہ ان تعلیمات کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایات کے مطابق اختیار کیا جائے۔ گویا اسلامی فکر ایک ارتقاء پذیر علمی تحریک ہے، جو اسلامی تعلیمات کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق سمجھنے اور جدید دنیا کے مسائل کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کا دائرہ کار نہ صرف مذہبی علوم بلکہ سائنسی، اخلاقی، سماجی اور سیاسی شعبوں تک پھیلا ہوا ہے، جس میں عقل و وحی کے امتزاج کے ذریعے اسلامی اقدار اور جدید چیلنجز کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنے کی سعی کی جاتی ہے[2]۔

اسلامی فکر کی تشکیل وارتقاء کو درج ذیل ادوار میں تقسیم کر کے مطالعہ کیا جاسکتا ہے:

- کلاسیکی دور (8ویں–14ویں صدی): اسلامی فلسفے اور فقہ کی تشکیل کا زمانہ
- قرون وسطیٰ (14ویں–18ویں صدی): عقلی اور روحانی تحریکوں کا عروج
- جدید دور (19ویں صدی کے اوائل سے): مغربی افکار کے ساتھ اسلامی فکر کے تقابلی مطالعات کا آغاز
- معاصر دور: جدید اسلامی فلسفے اور اجتہادی فکر کی ترقی۔

در حقیقت فکرِ اسلامی کی یہ روشنی کسی مخصوص دور تک محدود نہیں رہی۔ ہر دور میں اس فکر نے اپنے وقت

1 Wael B. Hallaq, *The Origins and Evolution of Islamic Law* (*Cambridge: Cambridge University Press*, 2005) p. 1-30

2Ali Raza Tahir, "An Introduction to Muslim Thought," *Al-Hikmat 37 (2017)*: 95-110.

کے تقاضوں کے مطابق ارتقاء اور تشکیلِ جدید کے مراحل طے کیے۔ برصغیر پاک وہند وہ منفرد خطہ ہے جہاں اسلام کی آمد نے ایک نئی فکری و تہذیبی تاریخ کی بنیاد رکھی، جس نے یہاں کے معاشرتی اور سماجی ڈھانچے کو یکسر تبدیل کر دیا۔ یہاں کے باسیوں نے مذہبی، سماجی اور سیاسی سطح پر اسلامی فکر کو اپنایا۔

فکر اسلامی برصغیر میں:

برصغیر میں اسلامی فکر کی بنیاد اس وقت پڑی جب ساتویں صدی عیسوی کے اواخر میں اسلام یہاں پر متعارف ہوا۔ ابتدائی دور میں اسلام کا تعارف عرب تاجروں اور صوفیائے کرام کے ذریعے ہوا، جنہوں نے برصغیر کے عوام میں اسلامی اخلاق و تعلیمات کو فروغ دیا۔ انہوں نے اسلامی فکر کے عملی اور روحانی پہلوؤں کو عام کیا، جو برصغیر میں اسلام کے نفوذ کا بنیادی ذریعہ بنے۔

آٹھویں صدی کے آغاز سے بارہویں صدی کے دوران میں محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور غوری جیسے فاتحین کے اثرات نے اپنا کام دکھایا[1]۔ برصغیر میں باقاعدہ مسلم حکومت قطب الدین ایبک کے ہاتھوں 1206ء میں قیام پذیر ہوئی۔ تیرہویں سے سولہویں صدی تک سلطنت دہلی (Dehli Sultanate) کا عروج اور پھر سولہویں سے انیسویں صدی تک مغلیہ سلطنت (Mughal Empire) کے ادوار برصغیر میں اسلام کے سیاسی عروج کے زمانے تھے[2]۔

یہ دور اسلامی علوم کے فروغ کا مثالی دور ثابت ہوا جس سے فکر اسلامی کی ترویج و اشاعت وسیع پیمانے پر، مستحکم بنیادوں پر قائم رہی۔ خصوصاً حدیث و فقہ کی علمی روایت کا یہ ایک اہم مرحلہ تھا۔ اس دور میں مدارس کا نظام مضبوط ہوا اور اسلامی علوم کی تعلیم و تدریس کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔ مسلمانوں کی تہذیبی ترقی کے ساتھ، برصغیر کی سماجی اور معاشی حالت میں مثالی ارتقاء اور استحکام آنے لگا۔

تاہم سترہویں صدی کے آغاز سے مغربی نو آبادیاتی نظام (Colonialism) نے، برصغیر کی مسلم سلطنت میں اپنے پاؤں جمانے شروع کر دیئے۔ کمپنی کی حکومت نے طاقت کے ایوانوں(Power Corridors)

---

1 Goetz, Hermann. "The Genesis of Indo-Muslim Civilization: Some Archaeological
Notes." *Ars Islamica* 1, no. 1 (1934): 46–50.
http://www.jstor.org/stable/4515459.

2 Stein, Burton (2010), *A History of India*, John Wiley & Sons,
ISBN 978-1-4443-2351-1, retrieved 15 July 2024
Richard, John F. (2012) *The Mughal Empire*, Cambridge University Press,
ISBN 978-0-511-58406-0

میں جگہ بنائی[1]۔

انیسویں صدی تک مغربی استعمار (Western Imperialism) اور برطانوی راج (British Raj)، مسلمانوں کو بالخصوص زیر نگیں کرنے میں کامیاب ہو گیا۔[2] یوں برصغیر کے مسلمانوں کی تہذیبی روایت کو فکری، سماجی اور سیاسی زوال کی طرف دھکیل دیا گیا۔ فکری اور تہذیبی سطح پر تحریک استشراق[3] (Orientalism) نے مسلم ذہن اسلام سے متعلق تشکیک (Skepticism) کی فضا پیدا کرنے کی کوششیں تیز کر دیں۔

بعض مستشرقین نے دوسری طرف، اسلام کے بنیادی سرچشموں قرآن کریم اور سیرت و تاریخ سے متعلق ایسے سوالات کو عام کیا جس سے عوام الناس کے ذہنوں میں بدگمانیاں جنم لیں۔ اس تاریک دور میں احیائے اسلام کی صدائیں بلند ہوئیں، اور برصغیر کی کئی بیدار مغز شخصیات اور اصلاحی اداروں نے فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کے لیے بھرپور مساعی کیں[4]۔ ان کوششوں نے بعض پہلوؤں میں کامیابی حاصل کی جبکہ بعض حوالوں سے یہ مساعی محدود رہیں۔ برصغیر میں اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید میں مختلف علمی و اصلاحی شخصیات اور اداروں نے نمایاں کردار ادا کیا، جن کی خدمات ایک تاریخی تسلسل کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔

شاہ ولی اللہ (1703-1762) نے سب سے پہلے اسلامی فکر میں احیائی روح بیدار کی، اجتہاد کی ضرورت پر زور دیا، اور قرآن و حدیث کی براہِ راست تعلیم کو فروغ دیا۔ ان کے بعد سید احمد شہید بریلوی (1786-1831) نے تحریکِ مجاہدین کی قیادت کی اور برصغیر میں اسلامی احیاء کی عملی جدوجہد کی۔ سر سید احمد خان (1817-1898) نے اسلام اور جدید سائنسی علوم میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انیسویں صدی میں مولانا رشید احمد گنگوہی (1829-1905) نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا، جہاں فقہی علوم کو مضبوط کیا گیا اور اجتہادی فکر کو تقویت ملی۔ اس دوران دارالعلوم دیوبند (1866) اور ندوۃ العلماء (1894) جیسے علمی ادارے بھی

---

1 See for details: Heathcote, T. A. (1995). *The Military in British India: The Development of British Forces in South Asia:1600–1947*. Manchester University-
Press. ISBN 978-1-78383-064-0.

2 Hirst, J. Suthren; Zavros, John (2011), Religious Traditions in Modern South Asia,
Routledge, ISBN 978-0-415-44787-4, retrieved 24 May 2024

3 Said, Edward W. (1979). *Orientalism*. New York: Vintage Books. p. 60-65.
ISBN 0-394-74067-X.

4 خالد مسعود، محمد، **اٹھارویں صدی عیسویں میں برصغیر میں اسلامی فکر کے رہنما**، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد 2018ء

احمد، تنویر وغیرہم، **جنوبی ایشیا میں اسلامی قانونی فکر اور ادارے**، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد 2023ء

وجود میں آئے جو اسلامی علوم وجدید فکری رجحانات میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں مصروف رہے۔

اسی دور میں مولانا محمود حسن (1851-1920) نے تحریکِ ریشمی رومال کے ذریعے آزادی کی تحریک کو اسلامی فکر کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی۔ مولانا شبلی نعمانی (1857-1914) اور مولانا ابو الکلام آزاد (1888-1958) نے اسی دور میں اپنی فکری اور عملی جدوجہد کے انمٹ نقوش چھوڑے۔ مفکرِ پاکستان علامہ اقبال (1877-1938) نے فکر اسلامی کی نشاۃ ثانیہ میں بے مثال کردار ادا کیا۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی (1903-1979) نے اسلامی حکومت کے قیام کے نظریے کو فروغ دیا اور "تفہیم القرآن" جیسی علمی و فکری کاوشیں انجام دیں۔ ان تمام شخصیات اور اداروں کی مشترکہ کوششوں نے برصغیر میں اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید میں ایسا کردار ادا کیا، جس کے اثرات آج بھی نمایاں ہیں۔ اس کام کا جائزہ اور تجزیاتی مطالعہ ہی تحقیق ہذا کا بنیادی محور ہے۔

تحقیق ہٰذا کی ضرورت واہمیت (Significance of the Study)

یہ امر واضح ہو چکا کہ فکرِ اسلامی ایک منفرد اور اہم موضوع ہے۔ جو ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق تحقیق و تطبیق کے مراحل سے گذرتا ہے، اور برصغیر کی اسلامی تاریخ بھی ایسے ہی کارہائے نمایاں میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مقصد شریعتِ اسلامیہ میں ترامیم لانا نہیں ہوتا بلکہ اسلامی فکر اور مسلم ذہنیت میں مثبت تبدیلی پیدا کرنا ہوتا ہے تاکہ اُمتِ مسلمہ ہر دور کے پیش آمدہ تقاضوں کے مطابق ایک حقیقت پسندانہ اور عملی راستہ اختیار کر سکے۔

عصرِ حاضر مسلم امہ کے لیے شدید فکری و نظریاتی چیلنجز لے کر آیا ہے۔ عالمی سطح پر سیکولرازم اور الحاد کے بڑھتے رجحانات نے اسلامی فکر کی نئی تعبیر کی ضرورت کو مزید بڑھا دیا ہے۔ مسلم اقوام کی سیاسی، سماجی، اور تعلیمی زوال پذیری نے اسلامی فکر کو عملی اور حقیقت پسندانہ بنیادوں پر از سرِ نو ترتیب دینے کی ضرورت پیدا کی ہے۔ ڈیجیٹل انقلاب، مصنوعی ذہانت (AI)، اور گلوبلائزیشن جیسے جدید چیلنجز کے تناظر میں اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید ناگزیر ہو چکی ہے۔

مذکورہ تحدیات سے نبرد آزما ہونے کے لیے ایک طرف تو مسلمانوں کی اجتہادی بصیرت کو بروئے کار آنا ہے، اور دوسری طرف یہ جائزہ بھی لینا ضروری ہے کہ ماضی قریب میں پیش آمدہ چیلنجز سے نمٹنے کے لیے مسلمانوں کی اجتماعی دانش نے کس نوعیت کے رجحانات تشکیل دیے اور کس منہج اور حکمت عملی کے تحت فکر اسلامی کو منظم اور منطبق کیا۔

تحقیق ہٰذا کے ذریعے ایسے ہی رجحانات اور مناہج علمی کا عمیق جائزہ لینا اور عملی کاوشوں کا تجزیہ کرنا مقصود ہے۔ اس تحقیق میں برصغیر میں اسلامی فکر کے احیاء، اس کی تشکیلِ جدید کے اسباب و محرکات، اور انفرادی واجتماعی زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات سے تفصیلی بحث کی جائے گی تاکہ آج کے دور میں ان تاریخی مساعی کی روشنی

میں موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لیے رہنمائی کے نئے امکانات تلاش کیے جائیں۔ یہ تحقیق اسی فکری و عملی داعیے کی بنیاد پر ضروری ہے، تاکہ ملت اسلامی کی ترقی اور ارتقاء کے لیے ایک مؤثر اور ہمہ گیر راستہ ہموار کیا جاسکے، جو امتِ مسلمہ کو درپیش اکیسویں کے چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کی حکمت عملی فراہم کرے۔

یہ تحقیق نا صرف تاریخی جائزے کی بصیرت عطا کرتی ہے بلکہ آئندہ نسلوں کے لیے، اپنے عہد کے مطابق اسلامی فکر کی تجدید اور احیاء کی راہیں بھی متعین کرتی ہے۔ اس مطالعے میں اسلامی فکر کے اثرات کو سماجی، ثقافتی، اور سیاسی تناظر میں پرکھا گیا ہے تاکہ برصغیر کے معاشرتی ڈھانچے میں آنے والی تبدیلیوں کو بہتر انداز میں سمجھا جاسکے اور یہ تحقیق علمی دنیا میں ایک مؤثر کردار ادا کرسکے اور فکرِ اسلامی کی آفاقیت اور عملی افادیت کو ثابت کرنے اور فروغ دینے میں معاون بنے۔

فصل دوم:

سابقہ تحقیقی کام کا جائزہ اور جوازِ تحقیق

سابقہ تحقیقی کام کا جائزہ (Literature Review)

برصغیر میں فکر اسلامی کی تشکیلِ جدید کا موضوع معاصر اسلامی فکر و عمل کے ارتقاء میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ یہ موضوع برصغیر کی مسلم تاریخ کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر اسلامی فکر کی تجدید میں برصغیر کے علماء کی نمایاں خدمات کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ موجودہ سابقی تحقیقی کام کے جائزہ کا مقصد اس موضوع پر موجود تحقیقی و علمی کام کا جامع جائزہ لینا ہے، جس میں مختلف تحقیقی مقالات، کتب، اور تحقیقی جرائد کا تجزیاتی مطالعہ شامل ہے۔

تاریخی پس منظر اور تعلیمی اصلاحات

اہم کتب:

برصغیر میں اسلامی فکر کے ارتقاء کا تاریخی مطالعہ کرنے والی سب سے اہم دستاویز مولانا سید ابوالحسن ندوی کی چھ جلدوں پر مشتمل "**تاریخ دعوت وعزیمت**"[1] ہے۔ یہ کتاب اسلامی فکر کی تشکیل نو کی تاریخ پر مشتمل ہے، جس میں عالم اسلام اور برصغیر کے نامور مفکرین و مجددین کے افکار و نظریات، علمی و فکری، اصلاحی اور تجدیدی کوششوں کے اثرات و نتائج کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے روایتی و واقعاتی انداز میں مسلم مفکرین کے محض فضائل و کمال کا تذکرہ نہیں کیا بلکہ گہرائی سے ان کا تجزیہ بھی کیا ہے اور منفی پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے دروس و عبر کے پہلوؤں کو بھی نظر میں رکھا ہے۔

مذکورہ کتاب کی پانچویں جلد میں مصنف نے شاہ ولی اللہ کی تجدید دین کی کوششوں کو نمایاں انداز میں پیش کیا ہے، عقائد وافکار کی اصلاح، حدیث و سنت کی اشاعت و ترویج، حدیث و فقہ میں مطابقت، شریعت اسلامی کی مربوط و مدلل ترجمانی اور نظریہ اجتہاد وغیرہ۔

اس کتاب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تاریخ کے ہر دور کے فکری و نظری چیلنجز اور ان کے مقابلے میں اسلامی فکر کی آفاقیت اور ندرت کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے عصر حاضر کے تناظر میں اس سے خاطر خواہ راہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس کتاب میں بیان کردہ امور کی وضاحت کی ضرورت آج پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ اس حوالے سے یہ کتاب بہت اہمیت کی حامل ہے۔ تاہم، یہ کتاب معاصر چیلنجز کے تناظر میں اسلامی فکر کی تشکیل نو کے عملی حل پیش کرنے میں محدود نظر آتی ہے۔

---

1 ندوی، سید ابوالحسن علی، **تاریخ دعوت وعزیمت**، (لکھنؤ: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام: 2006ء)

اسی طرح آپ کی دوسری کتاب[1] ***Contributions of Muslims To Indian Subcontinent*** ہے جس کا اردو ترجمہ **برصغیر میں مسلمانوں کی خدمات** کے عنوان سے محمد آصف نے کیا ہے جو 2018ء میں شائع ہوا۔ یہ کتاب برصغیر میں مسلمانوں کی علمی، تہذیبی، اور سماجی خدمات کا جائزہ پیش کرتی ہے۔ کتاب کے مختلف ابواب میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح مسلمانوں نے برصغیر میں مختلف شعبہ جات جیسے تعلیم، سیاست، اور معاشرت میں مثبت اثرات مرتب کیے۔ اس کتاب کے مترجم نے اصل مواد کی سلاست کو برقرار رکھتے ہوئے اسے قاری کے لیے مزید قابلِ فہم بنایا ہے کہ کتاب اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ مسلمانوں کی فکری تشکیلِ جدید برصغیر میں تاریخی حوالوں سے نہ صرف ضروری تھی بلکہ اس نے معاشرتی اقدار میں بھی بہتری پیدا کی۔

علاوہ زیں قاضی جاوید کی تین جلدوں پر مشتمل تصنیف "**برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقاء**"[2] برصغیر کے مسلمانوں کی مذہبی، فکری، روحانی اور ثقافتی سرگرمیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ پہلی جلد میں برصغیر میں مسلم فکر کی داغ بیل کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ اس میں سید علی ہجویری سے شاہ ولی اللہ تک کے فکری ارتقاء کو مختصرا بیان کیا گیا ہے۔ مصنف کے کہنے کے مطابق یہ کتاب ایک آزاد اور حکمران قوم کے فکری و تہذیبی حاصلات سے تعلق رکھتی ہے۔

دوسری جلد میں سر سید احمد خان سے اقبال تک برصغیر کے مسلم دانشوروں کے فکری ارتقاء کو زیر بحث لایا گیاہے۔ اس میں نو آبادیاتی نظام کے چنگل میں گرفتار قوم کی ذہنی، فکری اور روحانی کاوشوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ تیسری جلد میں پاکستان کے ارباب حکمت کی فکری مہمات کا ذکر ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے اولین تصنیف ہے۔ مصنف نے روایتی و تقلیدی اور پرجوش انداز فکر کو قطعی طور پر رد کیاہے، جو برصغیر کے مصنفین کا خاصہ رہاہے۔ تاہم، کتاب میں معاصر مسائل کے حل کے لیے عملی تجاویز کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

اسی طرح معروف سکالر اشتیاق حسین قریشی کی کتاب **برصغیر پاک وہند کی ملت اسلامیہ**[3] (جس کا انگریزی ترجمہ ہلال احمد زبیری نے کیا) نہایت اہم کتاب ہے۔ اس کتاب میں برصغیر میں مسلمانوں کے داخلے سے لے کر قیام پاکستان تک کے واقعات کو تسلسل سے بیان کیا گیاہے۔ مصنف کا مقصد برصغیر میں اسلام اور مسلمانوں کے کردار کا تجزیہ کرنا ہے، بالخصوص مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد پیدا ہونے والی صورتحال کا جائزہ لیا گیاہے۔ بقول خود

1Nadwi, Abul Hasan Ali, *Contributions of Muslims To Indian Subcontinents*, (*Translated by Muhammad Asif Kidwai, Ankara: South Asian Youth Org*., 2018)

2 قاضی جاوید، **برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقاء**، (لاہور: جہانِ دانش، 2009ء)

3 قریشی، اشتیاق حسین، **برصغیر پاک وہند کی ملت اسلامیہ** (سنگِ میل پبلیکیشنز، 1989ء)

Qureshi, Ishtiaq Husain, *The Muslim Community of the Indo-Pakistan Subcontinent, 610-1947: A Brief Historical Analysis*, (*Translated by Hilal Ahmad Zuberi, 1962*)

مصنف کے کوشش یہ کی گئی ہے کہ مسلم ملت کے ان فکری سانچوں کی تاریخ کا سراغ لگایا جائے، جن کی تشکیل اس کی مخصوص صورتحال کے نتیجے میں ہوئی تھی اور جنہوں نے اس کے مقدر اور اس کی سالمیت کے متعلق تصورات کو اپنے اندر ڈھالا تھا۔ برصغیر میں مسلمانوں کے عروج وزوال اور بیداری کے حوالے سے خصوصی اہمیت کی حاصل ہے، اس تناظر میں مصنف نے "مرض کی تشخیص" کے منفرد عنوان سے صورتحال کا تجزیہ کیا جو برصغیر کے مسلمانوں کو غوروفکر کی دعوت دیتا ہے۔

سید محمد سلیم کی تصنیف **تحریک پاکستان** [1] ایک اور اہم ترین کاوش ہے جس میں مختلف مصلحین کی ان کاوشوں کا ذکر کیا ہے، جو حصول آزادی کے لئے بنیاد بنیں۔ مذکورہ بالا کتاب میں مصنف نے مسلمانوں کو ایک اولو العزم اور غیور قوم کی حیثیت سے اس کی قومی واجتماعی فرائض اور ذمہ داریوں کی یاددہانی کرائی ہے۔ یہ کتاب نظریہ پاکستان کی تاریخی اساس اور اس کے ارتقاء پر بھرپور روشنی ڈالتی ہے۔

سید صاحب کی دوسری تصنیف **تاریخ نظریہ پاکستان**[2] میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں میں نظریاتی بیداری کیسے پیدا ہوئی اور کس طرح اسلامی فکر نے تحریکِ پاکستان میں اپنا کردار ادا کیا۔ یہ کتاب برصغیر میں اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید کو سیاسی، فکری اور تاریخی تناظر میں دیکھنے میں مدد فراہم کرتی ہے، جو اس موضوع کے مطالعے کے لیے نہایت مفید ہے۔

برصغیر میں تعلیمی اصلاحات کے حوالے سے دو اہم دستاویزات خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ برطانوی دور میں تعلیمی اصلاحات کے اثرات کا ایک جامع مطالعہ بامن داس باسو (Baman Das Basu) کی کتاب "History of Education in India under the Rule of the East India Company"[3] میں ملتا ہے۔ باسو نے نہ صرف برطانوی راج کے دوران تعلیمی نظام میں ہونے والی تبدیلیوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے خاص طور پر اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ کس طرح نئے تعلیمی نظام نے روایتی اسلامی تعلیم کی بنیادوں کو متاثر کیا اور مسلمانوں کے فکری ڈھانچے میں تبدیلی کا باعث بنا۔

اسی طرح پر ولیم بولٹس (William Bolts) کی "Considerations on India Affairs"[4] برطانوی دور کی ایک اہم دستاویز ہے۔ یہ کتاب برطانوی استعمار کے ابتدائی دور میں تعلیمی ومعاشرتی پالیسیوں کا معاصر

---

1 محمد سلیم، سید، **تحریک پاکستان**، (لاہور: ادارہ تعلیم و تحقیق، تنظیم اساتذہ، 1993ء)

2 محمد سلیم، سید، **تاریخ نظریہ پاکستان**، (لاہور: ادارہ تعلیم و تحقیق، تنظیم اساتذہ، 1993ء)

3 Basu, Baman Das, *History of Education in India under the Rule of the East India Company*, (Calcutta: Modern Review Office, 1922).

4 Bolts, William, *Considerations on India Affairs: Particularly Respecting the Present State of Bengal and Its Dependencies.* (London: J. Almon, P. Elmsley and Richardson and Urquhart, under the Royal Exchange, 1772/1775)

تجزیہ پیش کرتی ہے۔ بولٹس کے مطابق، برطانوی استعمار کے پہلے مرحلے میں ہی مسلمانوں کی تعلیمی وفکری زندگی میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہو گئی تھیں، جن کے دوررس اثرات آج تک محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

مذکورہ بالا تحقیقی مواد کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ برصغیر میں تعلیمی اصلاحات کے حوالے سے کئی اہم شعبوں میں تحقیق کی کمی ہے۔ خصوصاً برطانوی دور میں متعارف کروائی گئی تعلیمی پالیسیوں کے دوررس اثرات کا مکمل جائزہ کسی بھی مستند تحقیق میں نہیں ملتا۔ بامن داس باسو اور ولیم بولٹس نے اگرچہ برطانوی دور کی تعلیمی پالیسیوں کا ذکر کیا ہے، لیکن ان کے معاصر مسلم معاشرے پر مرتب ہونے والے گہرے اثرات کا تفصیلی مطالعہ موجود نہیں ہے۔ نیز، تعلیمی نظام میں رونما ہونے والی بنیادی تبدیلیوں کا مسلمانوں کی فکری و نظریاتی زندگی پر پڑنے والے اثرات کا تجزیہ بھی موجود نہیں ہے۔

تحقیقی مضامین:

تحقیقات اسلامی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کے تحقیقی مجلہ **فکر و نظر**[1] میں اس کے مخصوص میں موضوع کے حوالے سے مختلف مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً برصغیر میں علم حدیث کا آغاز، اصولِ حدیث میں علمائے برصغیر کی خدمات موضوع احادیث اور محدثین برصغیر نیز اس کتاب میں حدیث کی خدمت کے حوالے سے مختلف علماء مفکرین کا ذکر کیا گیا ہے۔

جس سے یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ اسلامی فکر موقع و محل کے لحاظ سے شناخت اور بنیادی کردار سے دست بردار ہوئے بغیر نئی سماجی اور تمدنی شکلیں وضع کرتی رہی ہے۔ یہ اَمر بذاتِ خود اس کے آفاقی ہونے کی دلیل ہے آج بھی فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو کے مسائل ان ہنگاموں اور دشواریوں سے الگ کر کے نہیں دیکھے جاسکتے جن سے آج کا مسلمان دوچار ہے۔

جی سی یونیورسٹی فیصل آباد میں **"برصغیر میں دینی فکر کے فروغ میں الہلال کا کردار"**[2] کے عنوان سے پیش کیے گئے مقالے میں الہلال کے تاریخی کردار اور اس کی فکری و ادبی خدمات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ مقالے میں تاریخی دستاویزات کا بھرپور استعمال اور مستند حوالہ جات کی موجودگی قابل تعریف ہے۔ تاہم معاصر اہمیت کے محدود تجزیے کی وجہ سے اس کی افادیت محدود ہو گئی ہے۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں[3] میں عقائد وایمانیات کے موضوع پر پیش کیا گیا مقالہ عقائد کے شعبے میں

---

1 فکر و نظر، **برصغیر میں مطالعہ حدیث**، (ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد)، خصوصی اشاعت، جلد 42-43، شمارہ 104

2 **برصغیر میں دینی فکر کے فروغ میں الہلال کا کردار**، (فاطمہ رحمت کا ایم فل کے لیے مقالہ، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد، 2011ء)

3 **عقائد و ایمانیات میں فکری تطور کا مطالعہ**، (علی حامد کا ایم فل مقالہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، 2005ء)

فکری تطور کی ایک اہم دستاویز ہے۔اس میں تاریخی و نظریاتی بنیادوں کا گہرا مطالعہ موجود ہے۔اسی طرح کراچی یونیورسٹی سے منظور شدہ پی ایچ ڈی کے لیے لکھے گئے مقالے میں بیسویں صدی کے منتخب مفکرین کی علمی و فکری خدمات کا، تاریخی اور معاصر تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے[1]۔یہ مقالہ اپنے وسیع تحقیقی دائرہ کار اور متنوع ذرائع کے استعمال کی وجہ سے اہمیت کا حامل ہے، لیکن منتخب مفکرین کے انتخاب کے معیار کی عدم وضاحت اور محدود تقابلی جائزہ اس کی اہم کمزوریاں ہیں۔

اسی طرح جی سی یونیورسٹی فیصل آباد میں سعید احمد نورسی کی خدمات پر مکمل کیے گئے پی ایچ ڈی مقالے میں سعید نورسی کے فکری نظام اور معاصر اسلامی فکر پر ان کے اثرات[2] کا جامع تجزیہ موجود ہے۔ متنوع ذرائع کا استعمال اور معاصر اہمیت کی وضاحت اس مقالے کی خوبیاں ہیں، لیکن موازناتی مطالعے کی کمی اور علاقائی تناظر کی عدم موجودگی اس کی کمزوریاں ہیں۔

اجتہاد اور تجدیدی فکر سے متعلق تحقیقی کام

علامہ ابن تیمیہ[3] کی تصنیف "اقتضاء الصراط المستقیم"جس کا ترجمہ مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی نے **فکر و عقیدہ کی گمراہیاں اور صراط مستقیم**، کے عنوان سے کیا اور 1998ء میں لاہور سے شائع ہوا، آج کے دور میں بھی نہایت اہم کتاب ہے۔ابن تیمیہ نے مذکورہ بالا کتاب کے ذریعے، معاشرہ میں پھیلی ہوئی بدعات و خرافات کے خلاف علمی اور قلمی جہاد کیا اور اسلام کے حقیقی عقائد کی وضاحت کی جس کے سبب اسلامی فکر نکھر کر اپنی صحیح صورت میں ظاہر ہوئی۔ اس ضمن میں قابل غور پہلو یہ ہے کہ خصوصاً بر صغیر کے معاشرہ میں امام تیمیہ کی مذکورہ بالا کتاب مسلمانوں کو غور و فکر اور اپنی تربیت و اصلاح کی دعوت دیتی ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی[4] کی اہم کتاب "مسئلہ اجتہاد" میں اسلامی نظام فکر پر بہت اچھی کاوش ہے۔ موصوف نے اسلامی فکر کو یونانی فلسفے کے اثرات سے آزاد کرنے پر زور دیتے ہوئے، عصری تقاضوں کے مطابق اجتہاد کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ مصنف نے موجودہ فقہی نظام کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی خامیوں کی نشاندہی کرتے

---

1 **بیسویں صدی کے منتخب مفکرین کی علمی و فکری خدمات کا تاریخی و معاصر تناظر میں جائزہ**،(یوسف نعمان، پی ایچ ڈی مقالہ، جامعہ کراچی، 2015ء)

2 **سعید احمد نورسی کے فکری نظام اور معاصر اسلامی فکر پر ان کے اثرات کا تجزیہ**،(علی حسن، پی ایچ ڈی مقالہ، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد، 2012)

3ابن تیمیہ، اقتضاء الصراط المستقیم، ترجمہ: **فکر و عقیدہ کی گمراہیاں اور صراط مستقیم**، از مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی، لاہور: ادارہ اسلامیات،

4ندوی، مولانا حنیف، **مسئلہ اجتہاد**،(لاہور، مکتبہ چٹان، 2010ء)

ہوئے فقہ جدید کی تدوین کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا ہے۔ یہ کتاب فکر اسلامی کی تشکیل نو کے حوالے سے اصل چیز، یعنی دین اسلام کی اصل روح، مزاج اور مقصد کو سمجھنے پر زور دیتی ہے۔

مذکورہ بالا کتاب یہ حقیقت یاد کراتی ہے کہ فکر اسلامی کی تشکیل نو کے حوالے سے اصل چیز دین اسلام کی اصل روح، مزاج اور مدعا کو سمجھنا ہے۔ انہوں نے تکمیل دین کے مفہوم کی توضیح و تشریح بڑے پر مغز دلائل کے ساتھ کی ہے جس کے بارے میں عمومی غلط فہمی کی وجہ سے شریعت اسلامی سے متعلق بعض مسائل از خود پیدا ہوئے ہیں۔ انہوں نے اس پہلو پر بھی بات کی ہے کہ "خالص اسلامی فکر" مجموعی طور پر جن تضادات کا شکار ہو کر رہ گئی ہے اس کا سبب یونانی فکر و فلسفہ کے اثرات ہیں۔

کتاب مذکورہ میں مصنف نے دین اسلام کے اصل ماخذوں کے طریقہ استنباط، اجتہاد کے دائرہ کار اور عصر حاضر کے تقاضوں کو موضوع بحث بنایا ہے۔ انہوں نے موجودہ فقہی نظام کی اہمیت و ضرورت اور خوبیوں کو اجاگر کرتے ہوئے اس کی خامیوں اور کمزوریوں پر بھی گرفت کی ہے اور فقہ کے تاریخی پس منظر کو مد نظر رکھتے ہوئے فقہ جدید کی تدوین کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیا ہے، خصوصا پاکستان کے حوالے سے، انہوں نے اس سلسلے میں کچھ اقدامات تجویز کئے ہیں جو فکر و عمل کی دعوت دیتے ہیں۔

علاوہ زیں محمد اسلم کریم[1] تصنیف، "**اسلام چند فکری مسائل**" میں عصر حاضر کے تقاضوں کے حوالے سے چند اہم فکری مسائل کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ مثلاً مسلمانوں کا حد درجہ روایتی و تقلیدی نقطہ نظر، عصر حاضر کے تقاضوں کا عدم شعور، عصر حاضر میں اسلام کی تفہیم نو، قانون و قانون سازی، علماء کا طرز استدال، تعلیمی معیار، اخلاقیات، ثبات و تغیر اور نشاۃ ثانیہ کے علاوہ عصر حاضر کے تناظر میں حقیقی اسلامی فکر تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اسلام کے بنیادی ماخذین قرآن وحدیث سے براہ راست روشنی حاصل کرنے کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

اس کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تعلیم اور نظام تعلیم جیسے اہم مسئلے کو زیر بحث لایا گیا ہے، غور کیا جائے تو اس کا اسلامی فکر کی تشکیل نو سے گہرا تعلق ہے۔ اگرچہ مذکورہ بالا کتاب کے حوالے سے مصنف کے بعض افکار و نظریات سے اختلاف کی پوری گنجائش موجود ہے لیکن یہ امر واضح ہے کہ یہ کتاب زندہ، متحرک اور فعال اسلام اور اسلامی فکر سے آگہی اور اس کی ضرورت واہمیت کی طرف توجہ دلاتی ہے۔

مولانا وحید الدین خان[2] کی "**فکرِ اسلامی، افکار اسلامی کی تشریح و توضیح**" میں دورِ حاضر کے چیلنجز، خاص طور پر علمی و سائنسی چیلنجز پر توجہ دی گئی ہے۔ مصنف نے موجودہ دور میں اجتہادی صلاحیت و بصیرت کے فقدان کے

---

1 کریم، محمد اسلم، **اسلام: چند فکری مسائل**، (لاہور: مقتدرہ قومی زبان، 2001ء)

2 خان، مولانا وحید الدین، **فکر اسلامی، افکار اسلامی کی تشریح و توضیح**، (لاہور :الفرقان پبلی کیشنز 2010ء)

مسئلے کو اجاگر کیا ہے۔ در حقیقت مصنف نے نہ صرف یہ کہ فکر اسلامی کی تشکیل نو کے حوالے سے مسئلہ کی وضاحت بڑے جامع انداز میں کی ہے بلکہ اس سے متعلق غلط فہمی کو بھی بڑے موثر انداز سے رفع کیا ہے، مصنف کی نظر میں دورِ حاضر کا سب سے بڑا چیلنج علمی و سائنسی ہے، جو مسلمانوں کو غور و فکر اور عمل کی دعوت دیتا ہے۔

مصنف نے اس کتاب میں فکری و نظریاتی قوت کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ مصنف نے موجودہ دور میں اجتہادی صلاحیت و بصیرت کے فقدان کے مسئلہ کو بھی موضوع بحث بنایا ہے اور اس کا حل بھی بیان کیا ہے، جو کہ آج کی اہم ضرورت ہے۔ مصنف کے بقول دور جدید میں مسلمانوں کے مسائل میں پہلا اور سب سے اہم مسئلہ فکر اسلامی کی تشکیل نو کا ہے۔ مصنف نے اس حوالے سے ماضی میں کی جانے والی کوششوں کا مختصر جائزہ بھی پیش کیا ہے۔

اسی طرح فضل الرحمان[1] کی تصنیف "**فکری ارتقاء اور اسلام**" میں انسان کے فکری اور سماجی ارتقا کو قرآن پاک اور سائنس کے نقطہ نگاہ سے پیش کیا ہے۔ نیز اس حوالے سے مذہبی، روحانی، اخلاقی، سماجی و معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں پر بھی بات کی ہے۔ متذکرہ بالا کتاب میں بیان کردہ نکات ہمیشہ سے انسانی زندگی کے بنیادی پہلو رہے ہیں، جنہوں نے عصر حاضر میں مختلف قسم کے چیلنجز کی شکل اختیار کرلی ہے، ان چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے لیے عصر حاضر میں جس حکمت عملی کی ضرورت ہے اس کے مختلف پہلوؤں کا مصنف نے بخوبی احاطہ کیا ہے۔

مصنف نے اسلامی فکر کے مختلف گوشوں کا جائزہ پیش کیا ہے۔ نیز اسلامی فکر کی تشکیل نو کے حوالے سے اسلام کے "اصول تدریج" کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اور جمود و تقلید پرستی کی شدید مذمت کرتے ہوئے اجتہاد کی اہمیت و ضرورت کو واضح کیا ہے۔ ان کے خیال میں عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق اسلامی اصولوں کی عقل و خرد پر مبنی دیانتدارانہ توضیح و تشریح کرنے اور زندگی کے ہر پہلو کے حوالے سے قرآنی فکر کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

توصیف **احمد** پرے (2022ء)[2] کتاب برصغیر کی اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید کی مختلف جہات پر روشنی ڈالتی ہے اور ان سوالات کا جواب دیتی ہے جو جدید دور میں مسلمانوں کو درپیش ہیں۔

اسی طرح ضیاء الدین سردار ایک معروف برطانوی مسلم مفکر، مصنف، اور ثقافتی نقاد ہیں جنہوں نے اسلام، سائنس، فلسفہ، جدیدیت، اور تہذیبوں کے مابین مکالمے کے موضوعات پر کئی اہم کتب تحریر کی ہیں۔ ان کی کتب عام طور پر فکر انگیز، تنقیدی اور جدید دور کے مسائل سے متعلق ہوتی ہیں۔ ان کی کتاب

---

1 فضل الرحمان، **فکری ارتقاء اور اسلام**، (لاہور: ادارہ معارف اسلامی، 1995ء)

2 Tauseef Ahmad Parray, ed., *Islamic Intellectual Tradition in the Indian Subcontinent: Essays in the Honour of Dr. Abdul Kader Choughley*, (Aligarh, India: Aligarh Muslim University, 2022).

" Islam, Postmodernism and Other Futures"

اس میں انہوں نے مختلف تہذیبی پہلوؤں کا جائزہ لیا اور اس ضمن میں اسلامی تصورات کو ابھارا ہے۔ جدید اسلامی فکر کی ارتقاء اور معاشرہ پر اجتہادی نظر کے اثرات کو عمیق انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے عملی اور نظریاتی پہلوؤں پر تنقیدی بحث کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اور مثبت و منفی پہلوؤں کی نشاندہی ہوتی ہے۔

دسمبر 1976ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام منعقدہ کانفرنس کے مقالات "**فکر اسلامی کی تشکیل جدید**" کے عنوان سے شائع ہوئے،[1] اہم نکات کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان مقالات میں عصر حاضر کے حوالے سے مسلمانوں میں حقیقی شعور اجاگر کرنے اور فکر اسلامی کی تشکیل نو کی ضرورت ولائحہ عمل پر روشنی ڈالی گئی ہے، ذخیرہ احادیث کی از سر نو جانچ وپڑتال اور علم الکلام کا بھی تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز اسلامی فکر کی تشکیل نو کے حوالے سے دینی مدار اس کے نصاب تعلیم کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ وقت کے تقاضوں کے حوالے سے اسلامی شریعت کے کردار کا بھی ذکر ہے۔ ایک نئی اصطلاح "نوراسخ العقیدگی" متعارف کروائی گئی۔ جس سے مراد وہ جدید ذہنی رویہ ہے جو قدیم اور راسخ عقائد کو جدید دور کے تناظر میں پرکھنے اور ان میں نیا فکری رجحان پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

محمد عابد الجابری کی کتاب "**ازمة العقل المسلم**" اردو ترجمہ "**فکر اسلامی کا بحران**" کے نام سے خرم مراد مرحوم نے کیا ہے جو کہ 1993ء میں لاہور سے شائع ہوا ہے۔[2] مذکورہ بالا کتاب میں مصنف نے فکرِ اسلامی کے روایتی و تقلیدی منہاج کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ نیز اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں مغربی غلبے کے سبب اسلامی فکر پر جو منفی اثرات مرتب ہوئے ان کا بھی تجزیہ کیا گیا۔ مصنف کا کہنا ہے کہ فکری جمود، تقلید پرستی اور پسماندگی کے لیے زرخیز مٹی کی حیثیت رکھتا ہے۔ مذکورہ بالا کتاب میں مصنف نے یہ حقیقت بھی واضح کی ہے کہ مسلمانوں کے فکری بحران کا حل اس صورت میں نکل سکتا ہے کہ مسلمان رجوع الی الاصل کی تحریک برپا کریں۔ مسلمانوں کو اسلامی قوانین واحکام کے بنیادی واولین ماخذین، قرآن وحدیث کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

اسلامی تحریکات اور شخصیات سے متعلق کام

شیخ جمیل علی نے اپنی انگریزی تالیف (2000ء)[3] جس میں مختلف مضامین اسلامی دانشورانہ روایت، اس

---

1 ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، **فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید: سیمینار کے مقالات**، (جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، دسمبر، 1976ء)

2 الجابری، محمد عابد، أزمة العقل المسلم، (**فکر اسلامی کا بحران**)، (مترجم: خرم مراد، (لاہور: اسلامی پبلیکیشنز، 1993ء)

3 Sheikh, Jameil Ali, *Islamic Thought and Movement in the Subcontinent.*

کے ارتقاء، اور معاصر مسائل کے حل کے لیے دی جانے والی تجاویز پر مبنی جائزہ پیش کیا گیا۔ اس کا عنوان (برصغیر میں فکر اسلامی اور تحریکات) "Islamic Thought and Movement in the Subcontinent" جس میں خصوصی طور پر مولانا مودودی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کے افکار کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے اس حقیقت کو اجاگر کیا ہے کہ ان دونوں مفکرین نے اپنے مختلف فکری نقطہ نظر کے ذریعے معاصر مسلم معاشرے کی فکری و عملی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔

محمد ریاض کرمانی (2008ء)[1] کی "**بصائر مودودی**" مولانا مودودی کی فکری خدمات کا ایک گہرا تجزیہ پیش کرتی ہے۔ کرمانی نے خاص طور پر سید مودودی کے 'تفہیم القرآن' میں جدید علوم سے استفادے کے طریقوں کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے مطابق، مولانا مودودی نے جدید علوم اور اسلامی فکر کے درمیان ایک منفرد ربط قائم کرنے کی کوشش کی۔

برصغیر میں اسلامی احیا کی تحریکات پر ایک اہم کام، کیلی فورنیا یونیورسٹی کی پروفیسر اور ایشین سٹڈیز کی ماہر باربرا میٹکاف (Barbara Metcalf) نے کیا جو 2014ء[2] میں "Islamic Revival in British India" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ کتاب برطانوی دور میں دیوبند تحریک کے کردار کا ایک جامع تجزیہ پیش کرتی ہے۔ میٹکاف نے اس تحریک کے فکری و تعلیمی اثرات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان کے مطابق، دیوبند تحریک نے برصغیر میں اسلامی علوم کی حفاظت اور ان کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا، جس کے اثرات آج بھی محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

مزید برآں الطاف احمد عظیمی (2002ء)[3] کی "**احیائے ملت اور دینی جماعتیں**" برصغیر میں دینی تحریکوں کا ایک معروضی تجزیہ پیش کرتی ہے۔ عظیمی نے ان تحریکوں کی کامیابیوں اور ناکامیوں دونوں کا جائزہ لیا ہے، اور خاص طور پر ان کی فکری بنیادوں کو زیر بحث لایا ہے۔ ان کے مطابق، دینی تحریکوں کی فکری تشکیل میں سیاسی و سماجی عوامل کا گہرا اثر رہا ہے۔ یہ کتاب مولانا مودودی اور ابوالحسن علی ندوی کی فکری جدوجہد کو موضوع بناتی ہے۔ مصنف نے اسلامی تحریکوں کی تشکیل اور ان کے اثرات کا تجزیہ کیا ہے، خاص طور پر ان دو مفکرین کے خیالات کے تناظر میں۔ کتاب میں برصغیر میں اسلام کے احیاء کی کوششوں اور اس کے معاشرتی و سیاسی اثرات کا گہرا جائزہ لیا گیا ہے۔

یہ کتاب اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید میں مذکورہ دونوں شخصیات کے کردار اور ان کے نظریات کی گہرائی کو

Islamic Heritage in Cross-Cultural Perspectives, (New Delhi: D. K. Printworld, 2000), 4.

1 کرمانی، محمد ریاض، بصائر مودودی، (لاہور: مکتبہ فکرِ اسلامی، 2008ء)

2 Metcalf, Barbara D., *Islamic Revival in British India: Deoband, 1860-1900*, (Princeton: Princeton University Press, 2014).

3 عظیمی، الطاف احمد، **احیائے ملت اور دینی جماعتیں**، (لاہور: دار التذکیر، 2002ء)،

اجاگر کرتی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید اسلامی فکر نے برصغیر کے مسلم معاشرے میں کس طرح تبدیلیاں پیدا کیں۔ یہ تمام کتب برصغیر میں اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید کی مختلف جہات کو واضح کرتی ہیں۔ ابوالحسن علی ندوی اور مولانا مودودی جیسے مفکرین نے فکری بیداری پیدا کی، جبکہ دیگر مصنفین نے اس فکر کے ارتقاء، اثرات، اور چیلنجز پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کتب کا مطالعہ آپ کے مقالے کے لیے مستند مواد فراہم کرے گا۔

ادارہ تحقیقات اسلامی (2005ء)[1] نے بین الاقوامی ادارہ برائے فکر اسلامی، اسلام آباد کے تعاون سے شائع کی ہے۔ اس کا پس منظر دو سالہ مذاکرہ تھا جو "اٹھارویں صدی میں برصغیر میں اسلامی فکر کا جائزہ کے عنوان سے منعقد کیا گیا۔ مذکورہ بالا کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ اٹھارویں صدی کی کیا اہمیت ہے، بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں کے حوالے سے۔ اس کتاب میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب بیان کئے گئے ہیں اور اٹھارویں صدی کے حوالے سے مسلمانوں کی مذہبی علمی، فکری اور معاشرتی سعی وجہد کا ذکر بالتفصیل کیا گیا ہے۔

معروف جرمن مستشرق این میری شمل Annemarie Schimmel (1922-2003) کی کتاب "Islam in the Indian Subcontinent"[2] برصغیر میں اسلام کے ثقافتی وروحانی پہلوؤں کا جامع مطالعہ پیش کرتی ہے۔ مصنف نے خاص طور پر صوفیانہ فکر کے اثرات کو زیر بحث لایا ہے۔ انہوں نے یہ واضح کیا ہے کہ کس طرح صوفیانہ فکر نے برصغیر کے مسلمانوں کی مذہبی وثقافتی شناخت کی تشکیل میں کردار ادا کیا۔

علاوہ ازیں سید مناظر احسن گیلانی[3] کی "**ہزارہ دوم یا الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ**" برصغیر میں تجدیدی کاوشوں کا ایک جامع دستاویز ہے۔ گیلانی نے نئی صدی کے تناظر میں اسلامی فکر کی تجدید کے مسائل و چیلنجز کا گہرا تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق، اسلامی فکر کی تجدید کے لیے ضروری ہے کہ ہم روایت اور جدت کے درمیان ایک متوازن راہ تلاش کریں۔ اسی تناظر میں فاروق ندوی[4] نے مختلف قرآنی تراجم اور فن تفسیر پر بات کی ہے نیز مختلف علماء کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور تصوف کے مختلف مکاتب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب میں اجتہاد کے حوالے سے شاہ ولی اللہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے نیز مختلف تحریکات کا بھی ذکر ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر محمد یوسف نے اپنی کتاب **جدید اسلامی فکر**[5] میں مختلف مسلم مفکرین کے نظریات کا جائزہ لیا ہے اور ان میں موجود مثبت و منفی پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ کتاب میں برصغیر میں جدید اسلامی فکر کے ارتقاء اور

---

1 ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، **اٹھارویں صدی میں برصغیر میں اسلامی فکر کے رہنما**، (اسلام آباد: بین الاقوامی ادارہ برائے فکرِ اسلامی، 2005ء)

2 Schimmel, Annemarie, *Islam in the Indian Subcontinent* (Leiden: Brill, 1980)

3 گیلانی، سید مناظر احسن، **ہزارہ دوم یا الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ**، (لاہور: دارالاشاعت، 2005ء)

4 ندوی، محمد فاروق، **جنوبی ایشیاء میں مسلم تہذیب وفکر کا مطالعہ**، (لاہور: مکتبہ فکر اسلامی 2012ء)، 88

5 یوسف، ڈاکٹر محمد، **جدید اسلامی فکر: ایک تنقیدی جائزہ**، (لاہور: مکتبہ اسلامیہ، 2022)

اس کے اثرات کو عمیق انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ **:** کتاب برصغیر میں جدید اسلامی فکر کی تشکیل کے عمل کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور اس کے عملی و نظریاتی پہلوؤں پر تنقیدی بحث پیش کرتی ہے۔

پروفیسر خورشید احمد(2011ء)[1] کی **"تزکیہ و تدبر:** اسلامی فکر و ثقافت کی بنیادیں" معاصر اسلامی فکر کو جدید سماجی و معاشی تناظر میں سمجھنے کی ایک اہم کوشش ہے۔ انہوں نے اسلامی فکر کی تشکیل نو کے لیے ایک جامع نظریاتی فریم ورک پیش کیا ہے، جو روایتی اسلامی علوم کو جدید سماجی علوم سے مربوط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے مطابق، اسلامی فکر کی تشکیل نو کے لیے ضروری ہے کہ ہم روایتی علوم کو معاصر علمی و تحقیقی طریقوں سے آشنا کریں۔

تحقیقی مجلہ *Modern Asian Studies* میں رابنسن F. Robinson (2008ء)[2] کا مقالہ "Islamic Reform and Modernities in South Asia" جنوبی ایشیا میں اسلامی اصلاحات کے معاصر رجحانات پر روشنی ڈالتا ہے۔ ان کا تجزیہ خاص طور پر اس بات پر مرکوز ہے کہ کس طرح مسلم معاشرے نے جدید چیلنجز کا سامنا کرتے ہوئے اپنی روایتی اقدار کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

اسی طرح یونے حداد Yvonne Haddad (1991ء)[3] کی تحقیق "The Contemporary Islamic Revival" معاصر اسلامی بیداری کے رجحانات کا ایک اہم تجزیہ پیش کرتی ہے۔ یہ تحقیق خاص طور پر اس بات پر روشنی ڈالتی ہے کہ کس طرح مختلف خطوں میں اسلامی بیداری کی تحریکیں مختلف سماجی و سیاسی عوامل سے متاثر ہوئی ہیں۔ حداد کے مطابق، برصغیر میں اسلامی بیداری کی تحریکیں استعماری دور کے تجربات سے گہرے طور پر متاثر ہیں، جو ان کی فکری تشکیل میں ایک اہم عنصر ہے۔

حسن الامین(2016ء)[4] کا مقالہ "Islamic Revivalism and Its Internal Critics" برصغیر میں اسلامی احیاء کی تحریکوں کا ایک اندرونی تنقیدی جائزہ پیش کرتا ہے۔ امین نے خاص طور پر ان تنقیدی آواز پر توجہ دی ہے جو اسلامی تحریکوں کے اندر سے اٹھی ہیں۔ ان کے مطابق، یہ تنقیدی آوازیں اسلامی تحریکوں کی اصلاح اور ان کی فکری نشو و نما کے لیے ضروری ہیں۔

Islamic Modernism in the Sub-continent by Ahmad Khan

---

1 پروفیسر خورشید احمد، **اسلام اور فکر جدید**،(لاہور :ترجمان القرآن، 2011ء)،**خورشید احمد،تزکیہ و تدبر :اسلامی فکر و ثقافت کی بنیادیں**، ماہنامہ ترجمان القرآن،2011ء)

2 Robinson, Francis, "Islamic Reform and Modernities in South Asia." *Modern Asian Studies*, vol. 42, no. 2-3 (2008): 259–281.

3 Haddad, Yvonne, *The Contemporary Islamic Revival: A Critical Survey and Bibliography*, (USA: Greenwood Publications Group, 1991).

4 Amin, Husnul, and Abdul Rauf, "Islamic Revivalism and Its Internal Critics in the Indo-Pak Subcontinent.", *Hamdard Islamicus*, vol. 39, no. 3 (2016): 55-74

کا اردو ترجمہ **برصغیر میں اسلامی جدیدیت** (2005ء)[1] کے نام سے ہوا ہے۔ یہ کتاب برصغیر میں مذہبی و سیاسی فکر سے متعلق نمایاں واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کتاب میں یہ نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے کہ "فکر صحیح" کی تلاش میں اختلاف رائے کی اہمیت مسلم ہے۔

مزید برآں ڈاکٹر عزیز احمد (1985ء)[2] کی کتاب "Islamic Culture" کا اردو ترجمہ ہلال احمد زبیری نے کیا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ اکیسویں صدی میں بھی مسلمانوں کی اکثریت عصر حاضر کے تقاضوں سے ناآشنا ہے۔ یہ کتاب اس امر کی یاددھانی کراتی ہے کہ زندہ قوموں کا کیا وطیرہ ہونا چاہیے، انہیں ہر لمحے اپنے نظریات وافکار اور عملی اقدامات کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے اور علم و حکمت اور دانش کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔

اس کتاب میں مسلمانانِ برصغیر کی مذہبی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی مسائل کے اسباب و محرکات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہ کتاب سطحی جوش و جذبات سے بلند ہو کر، معروضی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کی تاریخ کا تجزیہ کرنے کی دعوت دیتی ہے، بالخصوص برصغیر کے حوالے سے، "حقیقی اسلامی فکر" کا شعور و ادراک ناگزیر ہے تاکہ فکر اسلامی کی تشکیل نو کا تصور اجاگر ہو سکے۔ بسطمام احمد Bustamam Ahmad اور دیگر (2013ء)[3] کی کی تحقیق "Islamic Studies in Southeast Asia" جنوب مشرقی ایشیا میں اسلامی فکر کے جدید رجحانات پر اہم تدوین ہے۔ یہ کتاب خصوصی طور پر جنوب مشرقی ایشیا میں اسلامی فکر کے جدید رجحانات کا تجزیہ پیش کرتی ہے۔ مصنفین نے اس خطے میں اسلامی تحریکوں کے نشوونما اور ان کے اثرات کا موازناتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق، برصغیر کی اسلامی تحریکوں نے پورے خطے کی فکری و نظریاتی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ولفریڈ کینٹویل سمتھ (Wilfred Cantwell Smith 1979ء)[4] کی "Modern Islam in India" برصغیر میں اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید کے حوالے سے ایک اہم تحقیقی دستاویز ہے۔ میک گل یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے سمتھ نے برصغیر میں اسلامی فکر کے ارتقاء اور اس پر مؤثر قوتوں کا علمی جائزہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے خاص طور پر مذہبی و سیاسی محرکات کا تجزیہ کیا ہے جو برصغیر میں اسلامی فکر

---

1 Khan, Ahmad, *Islamic Modernism in the Subcontinent*, (Translated by Hilal Ahmad Zuberi, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2005)

2 Aziz Ahmad, *Islami Culture*, (Translated by Muhammad Arif, Lahore: Sang-e-Meel Publications, 1985).

3 Bustamam-Ahmad, Kamaruzzaman, and Patrick Jory, *Islamic Thought in Southeast Asia: New Interpretations and Movements*, (Kuala Lumpur: The University of Malaya Press, 2013).

4Wilfred Cantwell Smith, *Modern Islam in India: A Social Analysis*, (Delhi: Usha Publications, 1979).

کی تشکیلِ جدید میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ اپنی عربی اور اردو زبان کی مہارت کی بدولت سمتھ نے مقامی ذرائع سے براہِ راست استفادہ کیا ہے، جو اس تحقیق کو خصوصی اہمیت عطا کرتا ہے۔

تاہم، سمتھ کا تجزیہ بیرونی مشاہدے پر مبنی ہے اور اس میں مسلم علماء کے داخلی نقطہ نظر کی عکاسی محدود ہے۔ اس کے باوجود، یہ کتاب برصغیر میں اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید کے محرکات اور اثرات کو سمجھنے میں اہم معاونت فراہم کرتی ہے۔

عبدالحمید رحمانی (2015ء)[1] کی کتاب "**معتدل اسلامی فکر**" عصر حاضر معتدل اسلامی فکر کا متلاشی نظر آتا ہے، یہ کتاب اسی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ مذکورہ بالا کتاب میں دین اسلام کی نمایاں خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے نیز عقل و فہم پر بات کی گئی ہے۔ مختلف نسلی مذاہب کا ذکر کرتے ہوئے تعصب اور تقلید کو بھی موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ علمیت پسندی پر زور دیا گیا ہے اور بے جا اختلافات سے اجتناب کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا ایک اہم موضوع یہ ہے کہ کس طرح مسلمانوں میں رائج مختلف بدعات نے اصل اسلامی فکر کو پوشیدہ کر دیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے فطری و اصلی چہرہ کو بے نقاب کیا جائے۔

مغربی اثرات کے مطالعہ پر تحقیقی کام

معاصر دور میں اسلامی فکر کی تشکیل نو کے سامنے متعدد چیلنجز موجود ہیں۔ ڈیجیٹل انقلاب نے جہاں نئے علمی و فکری امکانات پیدا کیے ہیں، وہیں اس نے اسلامی فکر کی نئی تعبیر و تشریح کو بھی ناگزیر بنا دیا ہے۔ عالمی معیشت کی پیچیدگیاں، ماحولیاتی بحران، اور سائبر ٹیکنالوجی کے مسائل ایسے موضوعات ہیں جن پر اسلامی تناظر میں تحقیق کی شدید ضرورت ہے۔ ان شعبوں میں موجودہ تحقیقی کام محدود ہے اور مزید جامع و گہری تحقیق کی گنجائش موجود ہے۔

اس موضوع پر عبدالرحمن الکندی (1990ء)[2] کا کام بھی معاون و راہ نما ہے۔ الفکر الاسلامی الحدیث وصلتہ بالاستعمار الغربي" میں عالم اسلام پر مغربی استعمار کے غلبے کے اسباب و اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ عالم اسلام بشمول برصغیر کے مسلمان مفکرین نے اس حوالے سے جو نقطہ نظر پیش کیا ہے اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے نیز 'حقیقی اسلامی فکر ' سے روشناس کرانے کے لیے ان کی علمی فکری اور قلمی کاوشوں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ چوں کہ عالم اسلام میں مصر کو تجدید فکر اسلامی کے حوالے سے اہم مقام حاصل ہے، اس سلسلے میں سید جمال الدین افغانی، محمد عبدہ اور رشید رضا کی علمی و فکری ساعی کا ذکر کیا گیا ہے۔ جامعۃ الازھر کی فکری اصلاح پر بھی زور دیا گیا ہے۔

برصغیر میں سرسید احمد خان نے اسلامی فکر کے حوالے سے جس تجدد سے کام لیا اس کا ذکر بھی مذکورہ بالا

1 رحمانی، عبدالحمید رحمانی، **معتدل اسلامی فکر**، (لاہور: مکتبہ علم وحکمت، 2015ء)

2 عبدالرحمن الکندی، الفكر الاسلامي الحديث وصلتہ بالاستعمار الغربي، (قاہرہ: دار المعارف، 1990ء)

کتاب میں ہے، نیز علامہ اقبال نے جس متحرک و فعال اسلامی فکر سے مسلمانوں، بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں کو متعارف کرایا اس کا احاطہ بھی یہ کتاب کرتی ہے۔ قادیانی مذہب جو کہ برصغیر میں مغربی استعمار کے غلبے کی یادگار کی حیثیت ہی نہیں رکھتا بلکہ اس سوچ و فکر کی بھی واضح نشاندہی کرتا ہے، جو وہ مسلمانوں، خاص طور پر برصغیر کے مسلمانوں کے حوالے سے رکھتے تھے، اس موضوع کو بھی مذکورہ بالا کتاب میں جگہ دی گئی ہے۔

مذکورہ بالا کتاب میں مغربی استعمار کے غلبے کے تناظر میں "حقیقی اسلامی فکر" کے شعور بالفاظ دیگر تجدید فکر اسلامی کی ضرورت پر زور دیا گیا، جو عصر حاضر کا اہم ترین مسئلہ ہے۔

اسی طرح عبد الفتاح (1977ء)[1] کی کتاب "**الفکر الاسلامی فی المعاصر**" نہایت اہم ہے۔ مذکورہ بالا کتاب میں مصر کے حوالے سے معاصر اسلامی فکر کا تجزیہ کیا گیا ہے اور ظاہری امر ہے کہ اس ضمن میں مفتی محمد عبدہ کا ذکر نا گزیر ہے، جن کی تجدید اسلامی فکر کی تحریک نہایت اہم ہے۔ مسلمانوں کی ذہنی و فکری اصلاح اور ان کے فکری جمود کو توڑنا مفتی محمد عبدہ کا اہم کارنامہ ہے۔ مفتی محمد عبدہ کے علاوہ اس کتاب میں حسن النباء اور طہٰ حسین کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا کتاب میں مختلف اسلامی اداروں کا کردار بیان کیا گیا ہے اور مسلمانوں کی ذہنی و فکری اصلاح پر زور دیا گیا ہے۔ "مذہب جدید" کے عنوان سے بھی اس کتاب میں گفتگو کی گئی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب مسلمانوں کو اپنے فکر و عمل کا جائزہ لینے کی دعوت دیتی ہے تاکہ وہ اپنی ذہنی و فکری اصلاح کر سکیں جو کہ عصر حاضر کا اہم تقاضا ہے۔

اسی طرح "الفکر الاسلامی بین العقل و الوحی" مذکورہ کتاب میں "عقل اور وحی" کو موضوع بنایا گیا ہے،[2] اس کتاب میں مختلف آیات کریمہ کی روشنی کو عقل کو علم اور اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت قرار دیا گیا ہے، اس ضمن میں مختلف مسلمان علما و اہل دانش کا ذکر کیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا کتاب میں اس حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ 'وحی' کی بنیاد عقل پر ہے، لیکن غیبیات کے ضمن میں عقل کا کوئی کردار نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نظر میں وہی عقل و فکر قابل قدر ہے جس کو 'عقل سلیم' اور 'فکر سلیم' سے تعبیر کیا گیا ہے اور انہی کی بدولت 'حقیقی اسلامی فکر' کا شعور اجاگر ہو سکتا ہے۔

اسی طرح "**فکر اسلامی کی تجدید حقیقت**، فریب" کتاب کے مقدمہ میں مصنف نے بیسویں صدی میں

---

1 عبد الفتاح، محمد، الفکر الاسلامی فی المعاصر، (قاہرہ: دار الفکر العربی، 1977ء)

2 المدنی، عبد الحکیم، الفکر الاسلامی بین العقل والوحی، (قاہرہ: دار الفکر، 1985ء)

امت مسلمہ میں پیدا ہونے والی اسلامی بیداری کا ذکر کیا ہے،[1] اس ضمن میں مختلف اسلامی تحاریک کے نقطہ نظر اور اثرات کا مختصر جائزہ لیا ہے نیز مغرب ویورپ اور خود مسلمانوں کے مغرب زدہ طبقات کے رد عمل کو بھی بیان کیا ہے۔ مذکورہ بالا کتاب میں مصنف نے لفظ "تجدید" کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے جو کہ خالص اسلامی اصطلاح ہے۔ مصنف نے اس راز سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ مذکورہ بالا اسلامی اصطلاح کو کس طرح مغربی و سیکولر ذہنیت رکھنے والے مسلمان اور خود اہل مغرب اور یورپ اپنے تخریبی مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ اس حوالے سے انہوں نے "دورِ حاضر میں تجدید کے رجحانات" کے عنوان سے اولین باب سپردِ تحریر کیا ہے۔

مذکورہ بالا کتاب میں مصنف نے عرب دنیا کے حوالے سے خصوصی طور پر اسلامی بیداری کا ذکر کیا ہے اور سیکولر ذہن رکھنے والے عرب اہل فکر و نظر کا بھی ذکر کیا ہے۔ آخری باب میں مصنف نے تجدید کے حوالے سے اس سیکولر طریقہ کار کا ذکر کیا ہے، جس کو بروئے کار لانے کے لیے اہل مغرب ویورپ برسرِ پیکار ہیں۔ مذکورہ بالا کتاب کا مطالعہ ہر مسلمان، بالخصوص مذہبی طبقات، اہل فکر و نظر، اساتذہ و طلبا اور نوجوان نسل کے لئے مفید ہے تاکہ وہ عالمی اسلام دشمن عناصر بالخصوص خود اپنے گھر کے دشمنوں کے فکری و نظری حملوں کا نشانہ بننے کے بجائے ان کا تدارک کرنے کے قابل ہو سکیں۔

"**اسلامی ثقافت اور دور جدید**" مارماڈیوک پکتھال(2003ء Marmaduke Pickthall)[2] کی مذکورہ بالا کتاب مختلف خطبات پر مشتمل ہے۔ جس میں مختلف مذہبی، علمی، اور معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب بیان کئے گئے ہیں۔ علماء کے طرز فکر و عمل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اسلام کے بنیادی اصولوں اخوت و مساوات پر بات کی گئی ہے نیز مسلمانوں میں جو غیر اسلامی رسوم ورواج پائے جاتے ہیں ان کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ پکتھال(1930ء) کی سب سے بڑی مذہبی علمی و ادبی خدمت قرآن حکیم کا انگریزی زبان میں ترجمہ ہے جو "The Glorious Qur'an" کے نام سے شائع ہوا، اس ترجمے کا مقصد بقول خود ان کے انگریزی دان طبقے کو حقیقی اسلامی فکر سے متعارف کرانا تھا۔

"The Road to Makkah" علامہ محمد اسد(1954ء)[3] کی تصنیف ہے، جو ایک نو مسلم تھے اور بیسویں صدی کی مشہور باا ثر شخصیت اور بہترین مصنف تھے۔ ان کی مذکورہ بالا کتاب میں دین اسلام کی حقانیت کو بڑے فطری اور موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مسلم و غیر مسلم سب کے لئے یہ ایک منفرد و مفید کتاب ہے جو حقیقی

---

1 ندوی، محمد فاروق، **فکر اسلامی کی تجدید: حقیقت یا فریب**،(لاہور: مکتبہ علم و عرفان، 2005ء)

2Pickthall, Marmaduke, *Islamic Culture and the Modern Age*, (Translated by Tura Kina Qazi. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2003).

3 Asad, Muhammad, *The Road to Mecca*, (New York: Simon and Schuster, 1954).

اسلامی فکر کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

اسی طرح تھامس جان بٹکو(Thomas John Butko ،2004ء)[1] کا مقالہ "Revolution of Revelation: A Gramscian Approach to the Rise of Political Islam in Palestine"

مشرق وسطیٰ میں اسلام کے سیاسی ارتقاء کا ایک منفرد تجزیہ پیش کرتا ہے۔ بٹکو نے گرامشی (جو کہ یورپ میں ایک نظریاتی معاشی اور سماجی انقلاب کا حامی تھا) کے نظریات کی روشنی میں سیاسی اسلام کی نشوونما کا تجزیہ کیا ہے۔ ان کے مطابق، سیاسی اسلام کی تحریکیں محض مذہبی تحریکیں نہیں، بلکہ وہ معاشرتی و سیاسی تبدیلی کے لیے جدوجہد کرنے والی تحریکیں ہیں۔

محولہ بالا تحقیقی مواد کے جائزے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نظریاتی سطح پر کئی اہم خلا موجود ہیں۔ مغربی فکر کے اثرات کا ذکر تو ملتا ہے، لیکن یہ تجزیہ متوازن نہیں ہے اور زیادہ تر منفی پہلوؤں پر توجہ دی گئی ہے، جبکہ مثبت اثرات کا جائزہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ خاص طور پر موجودہ دور کے سائنسی و تکنیکی چیلنجز کے حوالے سے اسلامی فکر کی تشکیل نو کا کوئی جامع منصوبہ موجود نہیں ہے، جو کہ عصر حاضر کی اہم ضرورت ہے۔ خصوصاً جدید دور کے تقاضوں کے تناظر میں، یہ نظریاتی خلا اس موضوع پر مزید تحقیق کی اشد ضرورت کو ظاہر کرتے ہیں۔

جوازِ تحقیق (Rationalc of The Study)

برصغیر میں فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کے موضوع پر کیے گئے مطالعات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگرچہ تاریخی اور نظریاتی پہلوؤں پر قابلِ قدر کام ہوا ہے، تاہم معاصر دور کے چیلنجز اور ان کے اثرات کی تفہیم میں کئی تحقیقی خلاء موجود ہیں۔ خاص طور پر "برصغیر میں فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید: جہات واثرات کا تجزیاتی مطالعہ " کے تناظر میں دیکھا جائے تو اسلامی فکر کی عملی رہنمائی پر محدود تحقیق دستیاب ہے۔

برطانوی دور میں تعلیمی اصلاحات کے اثرات، صوفیانہ فکر کے جدید معاشرتی کردار، اور اجتہاد کی عملی تطبیق جیسے موضوعات پر بھی مزید تحقیق کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ موجودہ تحقیقی مواد میں تجدیدی تحریکوں کے اثرات اور برصغیر میں ہونے والی فکری، معاشرتی، اور سیاسی تبدیلیوں کا تفصیلی اور معروضی تجزیہ ضروری ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ خواتین، مسلم اقلیتوں، اور نوجوان نسل کو درپیش فکری و نظریاتی چیلنجز کے تناظر میں اسلامی فکر کی نئی تعبیر کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ تحقیقی خلاء اس پی ایچ ڈی مقالے "**برصغیر میں فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید: جہات واثرات کا تجزیاتی مطالعہ** " کے لیے ایک بنیاد فراہم کرتے ہیں، جس میں ان معاصر چیلنجز کا تجزیہ کرتے

---

1 Butko, Thomas John. "Revelation or Revolution: A Gramscian Approach to the Rise of Political Islam.", *British Journal of Middle Eastern Studies*, vol. 31, no. 1 (2004)

ہوئے اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے گا۔ اس تحقیق کا مقصد برصغیر کے مخصوص تاریخی، سماجی، اور ثقافتی تناظر میں فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کی جہات اور اثرات کو دریافت کرنا ہے، تاکہ معاصر مسلم معاشرے کو درپیش مسائل کا عملی اور فکری حل پیش کیا جاسکے۔

برصغیر پاک وہند میں اسلام کی آمد نے ایک نئی تہذیبی، ثقافتی اور فکری تحریک کا آغاز کیا۔ اسلامی فکر کی تشکیل جدید کا مطالعہ نہ صرف تاریخی اہمیت کا حامل ہے بلکہ موجودہ دور میں بھی اس کی معنویت برقرار ہے۔ اس عمل کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان تاریخی، سماجی اور فکری عوامل کا گہرا مطالعہ کریں جو اس تشکیل کے پیچھے کارفرما تھے، اور ان کی روشنی میں حال اور مستقبل کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

برصغیر میں اسلامی فکر کی تشکیل جدید کا عمل مختلف ادوار سے گزرا۔ ہر دور کے محرکات کا مطالعہ اس تحقیق کا ایک اہم پہلو ہے، جس سے یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ شاہ ولی اللہ سے لے کر علامہ اقبال تک، جس طرح معاشرے کا تجزیہ کر کے امت کے احیا کو، ان عظیم شخصیات نے اپنے افکار و نظریات کے ذریعے اسلامی فکر کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے میں نمایاں کردار ادا کیا اور برصغیر میں اسلامی فکر کو نئی جہت دی اور اسے جدید چیلنجوں کا سامنا کرنے کے قابل بنایا۔ ان کا تجزیہ سامنے آئے جو حال اور مستقبل کے لیے سامان فکر مہیا کرے۔

برصغیر میں اسلامی فکر کی تشکیل جدید کے علمی، فقہی، سماجی اور سیاسی پہلوؤں کا تجزیہ بھی یہ سمجھنے میں مدد کرے گا کہ کس طرح اسلامی فکر نے جدید دور کے چیلنجوں کا سامنا کیا اور کن طریقوں سے اس نے خود کو موجودہ حالات کے مطابق ڈھالا۔ اس عمل کے دوران پیش آنے والی مشکلات اور ان کے حل کے لیے اپنائے گئے طریقوں کا مطالعہ بھی اس تحقیق کا حصہ ہے۔ اسلامی فکر کی تشکیل جدید کے برصغیر پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لینا اس تحقیق کا اہم مقصد ہے۔ یہ تشکیل جدید برصغیر کے معاشرتی، ثقافتی اور سیاسی ڈھانچے پر گہرے اثرات چھوڑ چکی ہے۔ موجودہ دور میں ان اثرات کی نوعیت اور مستقبل میں ان کے ممکنہ نتائج کا تجزیہ کرنا ضروری ہے۔

فصل سوم:

بنیادی سوالات، مقاصد اور منہجِ تحقیق

بیانِ مسئلہ(Statement of the Problem)

برصغیر پاک وہند میں اسلام کی آمد کے بعد سے یہاں اسلامی فکر کی ترقی اور ترویج کا ایک مسلسل عمل جاری رہا ہے۔ اس خطے میں اسلامی تعلیمات نے نہ صرف مذہبی بلکہ سماجی، ثقافتی، اور علمی سطح پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ تاہم، جدید دور میں اسلامی فکر کو ایسے نئے چیلنجز اور مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے جنہوں نے اس کی تشکیلِ جدید کی ضرورت کو دوچند کر دیا ہے۔ عالمی سطح پر تیزی سے بدلتے ہوئے سماجی، سیاسی، اور علمی حالات نے اسلامی فکر کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت کو جنم دیا۔ اس تناظر میں، برصغیر میں اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید کا عمل ایک نئی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔

موجودہ تحقیقی مطالعات میں برصغیر میں اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ تو کیا گیا ہے، تاہم ایک جامع تجزیاتی مطالعہ کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔ خاص طور پر، اسلامی فکر کو درپیش جدید چیلنجز، ان چیلنجز کے حل کے لیے اختیار کیے گئے طریقے، اور ان کے نتائج کے بارے میں مربوط مطالعہ موجود نہیں ہے۔ اس تحقیقی خلا کو پُر کرنے کے لیے اس تحقیق میں برصغیر میں اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید کے محرکات، شخصیات، جہات، اور اثرات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مقاصدِ تحقیق(Objectives of the Study)

متذکرہ بالا مسئلہ تحقیق کے تناظر میں اس تحقیق کے مقاصد درج ذیل ہیں:

1۔ برصغیر میں اسلام کی آمد اور فکرِ اسلامی کی ترویج واشاعت کے ذرائع کی تحقیق کرنا۔

2۔ برصغیر میں فکرِ اسلامی کی اصلاح و تجدید کی ضرورت اور محرکات کا جائزہ لینا۔

3۔ برصغیر میں فکرِ اسلامی کے احیاء و تجدید کی مختلف جہات کا تجزیہ کرنا اور اس سلسلہ کی اہم شخصیات اور تحریکات کے کردار کا مطالعہ کرنا۔

4۔ برصغیر میں احیائے فکرِ اسلامی کے اثرات کا تجزیاتی مطالعہ کرنا۔

بنیادی سوالاتِ تحقیق(Research Questions)

موجودہ مقالہ درج ذیل سوالات پر انحصار کرتا ہے:

1۔ برصغیر میں فکرِ اسلامی کے ارتقاء کے ذرائع کیا رہے ہیں؟

2۔ برصغیر کی اہم شخصیات اور تحریکات کی طرف سے فکرِ اسلامی کی اصلاح اور تجدید کی حکمتِ عملی کیسے مؤثر ثابت ہوئی؟

3۔ برصغیر میں فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کی مختلف جہات کا احاطہ کن حوالوں سے ممکن ہے؟

4۔ برصغیر میں احیائے فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کے اثرات کس نوعیت کے ہیں، بدلتے تقاضوں میں مزید ضروریات کیا ہیں؟

منہج تحقیق (Research Methodology)

یہ تحقیق معیاری طریقہ کار (Qualitative Approach) کے ساتھ تجزیاتی اسلوب (Analytical Research) پر مبنی ہے۔ موضوع کی نوعیت کو مد نظر رکھتے ہوئے مواد کے گہرے مطالعے اور تجزیے کے لیے متنی تجزیہ (Content Analysis) اور خطابی تجزیہ (Discourse Analysis) کے طریقے اختیار کیے گئے ہیں۔ اس منہج کے تحت مختلف متون کا تنقیدی جائزہ لیا گیا اور ان کے مابین باہمی ربط کو اجاگر کرتے ہوئے تحقیق کے نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

اس تحقیق میں بنیادی (Primary) اور ثانوی (Secondary) دونوں قسم کے مصادر سے استفادہ کیا گیا ہے۔ آیات قرآنیہ کی تفہیم و تشریح کے لیے تفسیر الطبری، تفسیر ابن کثیر، روح المعانی، تدبر قرآن اور تفہیم القرآن جیسی معتبر تفاسیر سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ان مصادر کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ تفاسیر اپنے علمی وزن اور جامعیت کی وجہ سے خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

احادیث نبویہ کے حوالے سے صحیح بخاری، صحیح مسلم، اور سنن ابی داؤد جیسے معتبر مصادر سے رجوع کیا گیا ہے۔ یہ کتب حدیث اپنی صحت اور اعتبار کی وجہ سے اہل علم کے نزدیک خاص مقام رکھتی ہیں۔ ان کتب سے موضوع سے متعلق احادیث کا انتخاب کر کے ان کی روشنی میں تحقیق کو آگے بڑھایا گیا ہے۔

برصغیر کی تاریخ کے مطالعہ کے لیے تاریخ فرشتہ، تاریخ فیروز شاہی، طبقات ناصری، موج کوثر اور برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش جیسی معتبر کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ کتب برصغیر میں اسلام کی آمد، اس کے پھیلاؤ اور یہاں کی اسلامی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔

برصغیر میں فکر اسلامی کی تجدید و اصلاح کے موضوع پر مکتوبات امام ربانی، حجۃ اللہ البالغہ، اسباب بغاوت ہند، سرگذشت مجاہدین، تاریخ دعوت و عزیمت، خلافت و ملوکیت اور تجدید و احیائے دین جیسی کتب کا گہرا مطالعہ کیا گیا ہے۔ یہ کتب برصغیر میں اسلامی فکر کی تجدید و اصلاح کی تحریکوں اور ان کے محرکات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوئی ہیں۔

مزید برآں، جدید تحقیقی ذرائع میں ڈیجیٹل لائبریریز اور اکیڈمک جرنلز سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ مکتبہ

شاملہ، کتاب و سنت، اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ اور ریختہ لائبریری جیسے آن لائن ذرائع سے بھی معلومات حاصل کی گئی ہیں۔ ان جدید ذرائع نے تحقیق کو زیادہ جامع اور معاصر بنانے میں مدد کی ہے۔

تحقیقی طریقہ کار کے لحاظ سے مذکورہ مصادر سے مواد کی جمع آوری کے بعد ان کا گہرا مطالعہ کیا گیا، موضوع سے متعلق معلومات کی درجہ بندی کی گئی، مختلف آراء کا تقابلی جائزہ لیا گیا، تاریخی واقعات کی تصدیق و توثیق کی گئی اور پھر نتائج کی تدوین و ترتیب کی گئی۔ اس پورے عمل میں خصوصی توجہ اس امر پر دی گئی ہے کہ تمام معلومات معتبر مصادر سے حاصل کی جائیں اور ان کا تجزیہ علمی و تحقیقی اصولوں کے مطابق کیا جائے۔ تجزیے کے دوران موضوعیت اور غیر جانبداری کو یقینی بنایا گیا ہے تاکہ تحقیق علمی و تحقیقی اصولوں کے عین مطابق ہو۔

حدود و دائرہ کار (Scope and Delimitations of the Study)

اس تحقیقی مقالے کا بنیادی دائرہ کار برصغیر پاک و ہند میں فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کے تجزیاتی مطالعے پر مشتمل ہے۔ تحقیق کا زمانی احاطہ ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کی آمد سے لے کر بیسویں صدی تک کے دور پر محیط ہے، جس میں برصغیر میں اسلامی فکر کے ارتقاء، تجدید، اور اصلاح کے مراحل کا جائزہ لیا گیا ہے، اور معاصر دور تک اس کے اثرات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

اس مطالعے میں برصغیر کی ان نمایاں شخصیات اور تحریکات پر خصوصی توجہ دی گئی ہے جنہوں نے فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید میں اہم کردار ادا کیا۔ تحقیق کا مرکزی محور فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کی مختلف جہات اور ان کے معاشرتی، سیاسی، اور دینی اثرات کے تجزیے پر ہے۔ یہ تحقیق بنیادی طور پر اردو، عربی، اور انگریزی زبان میں دستیاب مستند علمی مواد تک محدود ہے۔ ان زبانوں میں موجود مصادر کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ برصغیر میں فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کے مطالعے کے لیے سب سے زیادہ مستند اور جامع معلومات فراہم کرتے ہیں۔

تحقیق کی موضوعاتی حدود کے تحت برصغیر کے تمام علاقوں کا مساوی مطالعہ ممکن نہیں تھا، لہٰذا زیادہ تر توجہ ان مراکز پر مرکوز کی گئی ہے جہاں فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کی نمایاں کوششیں ہوئیں۔ ان میں دہلی، لاہور، لکھنؤ جیسے علمی مراکز شامل ہیں۔ مزید برآں، تحقیق کا دائرہ کار فکرِ اسلامی کے تمام پہلوؤں کے بجائے تشکیلِ جدید سے متعلق مخصوص عناصر تک محدود رکھا گیا ہے، تاکہ تحقیق کے بنیادی مقاصد پر توجہ مرکوز رہے۔

اس تحقیق میں اکیسویں صدی کے جدید چیلنجز اور ان کے مخصوص مسائل کا تفصیلی جائزہ شامل نہیں کیا گیا ہے۔ یہ پہلو اگرچہ اہم ہیں، لیکن ان کا احاطہ تحقیق کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ تاہم، یہ تحقیق آئندہ کے لیے ان موضوعات پر مزید تحقیق کی بنیاد فراہم کرتی ہے، خاص طور پر جدید دور میں درپیش سماجی، سیاسی، اور فکری چیلنجز کے تناظر میں۔

ابواب وفصول کی تقسیم وترتیب(Chapterization of Research Theme)

زیرِ نظر تحقیق کو درج ذیل پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:

باب اول تعارفی مباحث پر مبنی ہے۔ اس باب میں تحقیق کے بنیادی مباحث، منہجِ تحقیق، مقاصدِ تحقیق، حدود ودائرہ کار، اور تحقیق کی علمی و عملی اہمیت پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس باب میں یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ برصغیر میں فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کو کیوں موضوعِ تحقیق بنایا گیا ہے اور اس تحقیق سے کون سے نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ یہ باب تحقیق کے لیے ایک نظریاتی اور فکری بنیاد فراہم کرتا ہے۔

باب دوم برصغیر میں اسلام کی آمد اور فکرِ اسلامی کے ارتقاء پر مرکوز ہے۔ اس باب کی پہلی فصل میں فکرِ اسلامی کی بنیادی اساس کو واضح کیا گیا ہے، جس میں ایمانیات، عبادات، اخلاق، اور معاملات کے درمیان باہمی تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔ اس سے قارئین کو فکرِ اسلامی کے بنیادی ڈھانچے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ دوسری فصل میں ساتویں صدی عیسوی سے اٹھارہویں صدی عیسوی تک کے برصغیر میں فکرِ اسلامی کی ترویج واشاعت کا تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں برصغیر کے عربوں سے سماجی، سیاسی، اور ثقافتی روابط کی تشریح کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کی اشاعت اور ترویج کے کون سے اہم ذرائع اور طریقے استعمال کیے گئے۔

باب سوم برصغیر میں فکرِ اسلامی کی اصلاح و تجدید کے محرکات اور اہم شخصیات کی حکمتِ عملی کا جائزہ لیتا ہے۔ اس باب میں احیائے فکر اسلامی کے سلسلے میں نمایاں شخصیات، ان کی خدمات، اور تجدید فکر میں صوفیاء اور علماء کے کردار کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ان شخصیات کی علمی اور فکری خدمات کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا گیا ہے کہ انہوں نے کس طرح اسلامی فکر کی اصلاح اور تجدید کے لیے کام کیا۔ اس باب میں خاص طور پر انیسویں اور بیسویں صدی کے برصغیر میں اسلامی فکر کی تجدید کے اسباب اور ان کے اثرات کو بیان کیا گیا ہے، تاکہ اس دور کی فکری تحریکوں کے محرکات کو سمجھا جا سکے۔

باب چہارم برصغیر میں فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کی مختلف جہات پر مشتمل ہے۔ اس باب میں انیسویں اور بیسویں صدی میں فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کے اہم رجحانات اور ان کے پس منظر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پہلی فصل میں تشکیلِ جدید کی نمایاں جہات اور ان کے ارتقاء پر بات کی گئی ہے۔ دوسری فصل میں برصغیر کی چند نمایاں شخصیات کے مذہبی افکار کو بیان کیا گیا ہے، جنہوں نے اسلامی فکر کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ تیسری فصل میں برصغیر کی روایتی فکر، حجیت دین، اور دینی روایت کی اہمیت پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان علما اور مفکرین کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے جنہوں نے اس روایت کو مضبوط بنیاد فراہم کی۔

باب پنجم برصغیر میں فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کے اثرات کا تجزیہ پیش کرتا ہے۔ اس باب میں معاشرتی، سیاسی، اور دینی پہلوؤں پر ان اثرات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ پہلی فصل میں ان نمایاں تحریکوں جیسے تحریکِ علی

گڑھ، تحریکِ خلافت، تحریکِ ریشمی رومال، اور تحریکِ علمائے ہند کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے، جنہوں نے برصغیر کے سماجی اور ثقافتی ماحول کو متاثر کیا۔ دوسری فصل میں فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کے سیاسی اثرات پر بات کی گئی ہے، جس میں برصغیر کی سیاسی تحریکوں پر اسلامی فکر کے اثرات کو واضح کیا گیا ہے۔ تیسری فصل میں دینی و مذہبی فکر پر ان اثرات کا تجزیہ کیا گیا ہے، جنہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے مذہبی رویوں اور دینی فکر کو نئے سانچے میں ڈھالنے میں کردار ادا کیا۔

یہ تمام ابواب تحقیق کو ایک مربوط اور منطقی ساخت فراہم کرتے ہیں، جس سے برصغیر میں فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کے تاریخی، فکری، اور عملی پہلوؤں کا جامع تجزیہ ممکن ہوتا ہے۔ ہر باب مخصوص جہات کو زیرِ بحث لاتا ہے، جس سے تحقیق کے مقاصد اور سوالات کے جوابات فراہم کیے جاسکتے ہیں۔

باب دوم: برصغیر میں اسلام کی آمد اور فکر اسلامی کی ترویج

فصل اول: فکرِ اسلامی کا توضیحی مطالعہ

فصل دوم: برصغیر میں اسلام کی آمد اور فکر اسلامی کی ترویج

(ساتویں سے پندرہویں صدی عیسوی تک کا دور)

باب دوم

برصغیر میں اسلام کی آمد اور فکر اسلامی کی ترویج

تعارف باب

برصغیر میں اسلام کی آمد اور فکر اسلامی کی ترویج وارتقاء کے اس باب میں فکر اسلامی کی بنیادی تفہیم اور برصغیر میں اس کے ارتقائی سفر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب کو دو فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی فصل میں فکر کی نوعیت اور خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسری فصل میں برصغیر میں اسلامی فکر کی آمد سے لے کر پندرویں صدی عیسوی تک کی ترویج وارتقاء کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس فصل میں برصغیر میں اسلامی افکار کی آمد، ان کی اشاعت، مختلف ادوار میں ان کی نشوونما، اور ان کے ارتقائی مراحل کا تفصیلی مطالعہ شامل ہے۔ اس دور میں فکر اسلامی کی ترویج میں اہم کردار ادا کرنے والی شخصیات اور ان کی خدمات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔

اس دور میں برصغیر میں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت جو سلطنت دہلی (1206-1526)، کے نام سے مشہور ہے، تین صدیوں تک قائم رہی۔

فصل اول:

فکرِ اسلامی کا توضیحی مطالعہ

انسانی معاشرے میں فکر کی اہمیت نا قابل انکار ہے۔ فکر انسانی سے مراد، انسانی سوچ اور نظریہ حیات ہوتا ہے جس کی بنیاد غور و تدبر پر رکھی گئی ہو۔ غور و فکر اور عقل و تدبر ہی وہ واحد اور غالب ترین خوبی ہے جو انسان کو دیگر تمام مخلوق سے ممتاز کرتی ہے۔ قوت فکر ہی انسان کی معنویت کا حقیقی ثبوت ہے۔ اگر یہ توانائی نہ ہو تو سب قوتیں معطل و مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں خواہ وہ قوت عاملہ ہو، سامعہ ہو یا بصر سب کی غیر متحرک ہوتی ہیں۔

لغوی اعتبار سے فکر عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ ف، ک، ر ہے۔ یہ باب فکر یفکر بروزن نَصَرَ یَنْصُرُ سے ہے۔[1]

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

((الفکر مقلوب والفکر ک لکن ستعمل الفکر فی المعنی وھو فرک الامور وبحثھا طلبا الوصول الی حقیقتھا)) [2]

(لفظ فکر دراصل فرّک سے مقلوب ہے۔ لیکن فکر کا لفظ زمانہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کے لئے اس کے بارے میں چھان بین کرنے کے ہیں)۔

((الفکرۃ قوۃ مطرقۃ للعلم الی المعلوم والتفکر جولان تلک القوۃ بحسب نظر العقل)) [3]

(فکر اس قوت کو کہتے ہیں جو علم کو معلوم کی طرف لے جائے اور تفکر کے معنی فکر و نظر اور عقل کے مطابق اس قوت کو جولانی دینے کے لئے ہیں)۔

گویا، کسی بھی معاملہ مسئلہ کے حل کے لیے مسائل کی تہہ تک پہنچنا غور و فکر کرنا ضروری ہے اس کے بغیر کامیابی کا حصول ناممکن ہے۔ **امام غزالی لکھتے ہیں:**((الفکر مفتاح المعارفۃ والکشف))[4] **(فکر معرفت اور کشف کی کلید ہے)۔**

کیمیائے سعادت میں انہوں نے صحیح فکر کو سعادت کہا ہے:

"دل جو مانند بادشاہ ہے اگر وزیر یعنی عقل سے مشورہ اور خواہش و غصہ کو حرام کر کے عقل اپنا محکوم بنالے یعنی اچھی فکر پر چل پڑے تو بدن کا نظام بھی درست رہے گا اور فکر بھی سعادت کا باعث ہے لیکن اگر فکر صحیح کی راہ

---

1 الزبیدی، محمود مرتضیٰ حسینی، **تاج العروس** (بیروت: دارالفکر، 1994ء) ج7، ص359

2 الاصفہانی، حسین بن محمد الراغب، **المفردات فی غرائب القرآن**، (بیروت: دار العلم للملابیین)، ص، 384

3 الاصفہانی، **المفردات**، ص808

4 الغزالی، ابو حامد محمد بن محمد، **احیاء علوم الدین** (بیروت: دارالمعرفۃ) ج1، ص332

پر نہ چلی، غصہ اور خواہش کی قیدی بن گئی تو یہ فکری تباہی اور انسان کی ہلاکت ہے"۔[1]

فکر کا لفظ اردو زبان میں انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے جیسے کہ عربی زبان میں آیا ہے۔ فرہنگ آصفیہ کے مطابق فکر سے مراد، سوچ بچار، اندیشہ، خیال، تدبیر، دھیان، غم، رنج، اندوہ، ملال، خاطر غور، تامل، حاجت وغیرہ۔[2]

اسی طرح انگریزی زبان میں "Thought" کا لفظ فکر کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جس کے معنی ہیں: غور و فکر، سوچ بچار، غور و خوص، خیال، تدبیر منشا مقصد، موضوع فکر، ارادہ۔[3] انسانی غور و فکر کے لیے انگریزی زبان میں متعدد الفاظ استعمال ہوتے ہیں جیسے:

> "Care, Deliberation, Idea, Anxiety, Imagination, Meditation, Notion, Opinion"[4]
>
> (توجہ، فکر، تشویش، سوچنے غور کا عمل، غور فکر، اچھی طرح غور و فکر، ہر ذہنی تاثر تخلیق کرنے کا عمل، وجدانی تخلیق رائے یا خیال)۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول:

> "انگریزی زبان میں کسی گروہ کی فکر، سوچ، فہم و گیان اور مجموعی ذہنیت کی صلاحیت اور قوت کو "Intellect" کہا گیا ہے۔ اسی وجہ سے "Intellectual" کا معنی تعمیری فکر میں مشغول صاحب دانش، صاحب عقل اور روشن خیال انسان کے ہیں"۔[5]

علامہ اقبال فرماتے ہیں:

> "In its essential nature, then thought is not static: It is dynamic and unfolds its internal infinitude in time like the seed which, from the very beginning, carries within itself the organic unity of the tree as a present fact. Thought is therefore, the whole in its dynamic self- expression."[6]
>
> "فکر اپنی ماہیت میں متحرک ہے۔ ساکن نہیں اور باعتبار زمانہ دیکھا جائے تو وہ اپنی اندرونی لامتناہیت کا اظہار اس بیج کی طرح کرتی ہے جس میں پورے درخت کی نمو پذیر وحدت وقت ایک حقیقت حاضرہ کے طور پر شروع ہی سے موجود رہتی ہے۔ جہاں تک اظہار کا تعلق ہے تو فکر کی مثال ایک "کل" کی ہے"۔

اسی طرح ڈاکٹر برہان احمد فاروقی انسانی فکر کے بارے میں لکھتے ہیں:

---

1 الغزالی، **کیمیائے سعادت**، (کراچی: ضیاء القرآن پبلشرز) ص24

2 دہلوی، سید احمد، **فرہنگ آصفیہ** (لاہور: مکتبہ حسن سہیل) ج:3، ص350

3 *Oxford English Dictionary,* (Krachi, Pakistan: Oxford University Press, 2013), 1824.

4 *The Oxford English Dictionary*, (Oxford: Oxford University Press, 1989), 983

5 جالبی، ڈاکٹر جمیل، **قومی انگریزی اردو لغت** (لاہور: مقتدرہ قومی زبان، مکتبہ جدید پریس)، ص12

6 Iqbal, Muhammad, Dr, *The Recontstuction of Religios Thought in Islam*, (Lahore: Institute of Islamic Culture, 1990) p:5

"انسانی فکر میں ابتدائی مرحلے ہیں جزوی فکر کو کل سچائی تصور کیا گیا ہے اس کے بعد اس فکر کے خلاف متضاد دعوے سامنے آتے ہیں پھر انسانی فکر ابتدائی فکر میں کانٹ چھانٹ کر کے غلط عناصر کو نکال دیتی ہے اور اس طرح کل حقیقت سامنے آجاتی ہے اس طریقہ استدلال یا فکری ارتقاء کو جدلیت(Dialectology) کہا جاتا ہے۔ اسی طریقہ کار کا قدیم فلسفی افلاطون اور جدید ہیگل نے صحیح فکر کو استعمال کیا اور مسلم متکلمین نے بھی یہی طریقہ اپنایا جسے ان کی زبان میں علم الکلام کہا جاتا ہے خام افکار کو نکال کر جو صحیح فکر حاصل ہوتی ہے یہی کل حقیقت ہے۔ مزید کمی کو غور و فکر سے پورا کیا جا سکتا ہے یہی وہ طریقہ ہے جس سے فکر انسانی ارتقائی منازل طے کر کے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے"۔[1]

فکر اسلامی کا تصور اور نوعیت

اسلامی فکر ایک ایسا نظریاتی اور عملی نظام ہے جو وحی الٰہی کی روشنی میں انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ قرآن کریم میں اسلامی فکر کو غور و فکر، تدبر، اور اجتہاد سے جوڑا گیا ہے:

﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ﴾[2]

(کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے؟)

غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اپنی نوعیت و ہیت اور ماہیت کے اعتبار سے فکر اسلامی ایک جداگانہ فکر ہے۔ جو اللہ کی طرف سے روز اول سے ہی انسان کو عطا کی گئی ہے۔ بقول سید حسین نصر فکر اسلامی ایک ایسا درخت ہے جس کی جڑیں قرآن و حدیث ہیں۔[3]

اسلامی فکر کی انفرادیت کا اہم ترین اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ بحیثیت وحی الٰہی تفکر و تدبر، عقل و شعور اور حکیمانہ نظام فکر پیش کرتی ہے۔ مولانا ابوالحسن ندوی اس اسلامی فکر کو ربانی فکر کرار دیتے ہیں۔[4] اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر انیس احمد لکھتے ہیں: "اسلامی فکر و ثقافت کی سب سے نمایاں اور مرکزی پہچان اور خصوصیت اس کا مبنی بر وحی ہونا ہے۔ یہ وہ جوہری پہلو ہے جو اسلامی فن و ثقافت کو انفرادیت بخشتا ہے"۔[5]

اسلامی فکر ہمہ جہت اور ہمہ گیر خصوصیت کی حامل فکر ہے۔ اس کا دائرہ کار نہایت وسیع ہے۔ یہ فکری، عقلی اور فطرتی پہلوؤں کا حسین امتزاج ہے۔ جس کے لیے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

"اسلامی فکر کوئی ایسا عقیدہ پیش نہیں کرتی جو عقل اور فطرت انسانی کے منافی ہو"۔[6]

---

1 فاروقی، برھان احمد، ڈاکٹر، **قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل** (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، 1989ء)، ص58

2 القرآن، محمد 24:47

3 فاروقی، ضیاء الحسن، **فکر اسلامی کی تشکیل جدید** (لاہور: مکتبہ رحمانیہ) ص67

4 ندوی، ابوالحسن، **اسلامی تہذیب و ثقافت** (اسلام آباد: دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی یونیورسٹی) ص39

5 انیس احمد، ڈاکٹر، **اسلامی فکر و ثقافت کی قرآنی بنیادیں** (لاہور: مکتبہ رحمانیہ، 2010ء) ص27

6 خلیفہ عبدالحکیم، **اسلام کی بنیادی حیثیتیں** (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامی، 1975ء) ص35

بحیثیت وحی الٰہی اسلامی فکر کا بنیادی نقطہ نظر انسانی آخروی اور دنیاوی فلاح و کامیابی ہے۔ ایسا معیار زندگی جو اسلامی اقدار اور مقاصد و معیارات سے ہم آہنگ ہو۔ اگر "اسلامی فکر" کو ایک جملے میں بیان کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ: کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بالادستی غیر مشروط طریقہ سے دین و دنیا کے تمام معاملات میں قائم کرلی جائے اور اس بالادستی کے لئے تن من دھن سے حصہ لیا جائے تاکہ اخوت اور مساوات اور انسانی حریت کے متوازن نظام کو متعارف کروایا جاسکے۔ سعید احمد پالن اپنی کتاب "فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید" میں لکھتے ہیں:

"فکرِ اسلامی کو ہم اسلامی مزاج یا اسلامی ذہنیت سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں۔ تاریخی، اخلاقی، تمدنی اور علمی مسائل سب انسانی فکر کے جزو ہیں۔ ان کے متعلق اسلام نے جو تعلیمات پیش کی ہیں، انہی کا نام فکرِ اسلامی ہے۔ ایسی فکر جو اسلامی معیارات اور مقاصد سے ہم آہنگ ہو۔[1]

اسلامی تہذیب و تمدن میں فکر ایک لازمی عنصر ہے۔ جس کی دعوت اور ترغیب قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ فکر اسلامی کی اساس ایسے دین پر ہے جس کی تبلیغ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر رسول آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی۔ جس کی اصل اساس وحی ہے۔ جس میں کوئی کمی نہیں آئی یہ فکر کسی ایسی فکر کی تاریخ نہیں جس میں دین اور دنیا الگ الگ گوشوں میں ہو۔

اللہ تعالی نے انسان کو پیدا فرمایا تو ساتھ ہی اس کے تمام لوازم کا بھی اہتمام فرمایا۔ فکر اسلامی ان تمام لوازم کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ انبیاء کی بعثت کا مقصد بھی اسی فکر کی اصلاح و ارتقاء ہے۔ جب جب اس میں خارجی عناصر داخل ہوئے معاشرے میں فساد برپا ہوئے کیونکہ فکر اسلامی کسی خارجی عناصر کو قبول نہیں کرتی ہے۔

اسلام مستقل مزاجی اور اصلاح فکر کی دعوت دیتا ہے کیونکہ جب اسلام ایک مکمل دین کی حیثیت سے وارد ہوا تو اپنے پیروکاروں کو ہدایت کا ایک نیا راستہ دکھایا۔ جس کی ابتدا و انتہا وحی الٰہی ہے انسانی افعال و کردار کا ایک مکمل تصور پیش کیا اسلام ہی وہ واحد دین ہے جس نے انسانی فکر کو جلا بخشی اور اس تصور کے بنیادی ڈھانچے کی صداقت کو عملی تجربات اور مشاہدات کے زریعہ پرکھنے کی دعوت دی۔ اسلامی فکر خالق کائنات، مقام انسانی اور انسانی استعداد، انسانی ذمہ داریوں اور ان ذمہ داریوں کے جواب دہی کے اصول و ضوابط واضح کر کے انسانی زندگی کا بہترین کا تصور پیش کرتی ہے۔

فکرِ اسلامی کی تاریخ

فکر انسانی کی پیدائش اسی وقت سے ہے جب سے انسان ہے، انسان جب سے ہے اس وقت سے خالق نے انسان کو اسلامی فکر کے مخزن عطاکیے ہوئے ہیں۔ قرآن حکیم نے واضح کیا ہے کہ:

---

1 نصر، حسین، سید، **جدید دنیا میں روایتی اسلام** (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، 1992ء)، ص9

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوَّاهَا o فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوَاهَا﴾[1]

(اور جان کی اور اس کی جس نے اس کو درست کیا۔ پھر اس کو اس کی بدی اور نیکی سمجھائی)۔

اور یہ کہ:

﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا﴾[2] (اور اللہ نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھائے)۔

سے لے کر

﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾[3] (انسان کو سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا)۔

تک کے معاملات اسی حقیقت کی طرف نشادہی کر دی گئی ہے۔

انسانی زندگی ایک وحدت کا نام ہے اور فکر اسلامی اسے ایک سمت مہیا کرتی ہے۔ انسانی زندگی مختلف جہتوں اور سمتوں پر بغیر کسی فکر کے آگے بڑھنے سے انتشار اور فکری مسائل کا شکار ہو جاتی ہے۔ اسی انتشار اور مسائل سے بچنے کے لئے ہر دور میں اللہ تعالی نے انسانی راہنمائی کے لئے انبیاء علیھم السلام کو مبعوث فرمایا جنہوں نے ہر دور میں اس انتشار اور فکری بگاڑ کو توڑ کر معاشرہ کو سنوارنے کی حتی المقدور کوشش کی۔

حضرت آدم علیہ السلام جن کا لقب ابوالبشر ہے۔ جن سے نسل انسانی کی ابتداء ہوتی ہے۔ اس فکر کی ترویج واشاعت کے لیے اللہ تعالی نے ان سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا:

﴿وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ﴾[4]

(اور ہم نے حکم دیا کہ تم نیچے اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے، اب تمہارے لیے زمین میں ہی معینہ مدت تک جائے قرار اور نفع اٹھانا مقدر کر دیا گیا ہے)۔

پھر فرمایا:

﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾[5]

(ہم نے فرمایا! تم سب جنت سے اتر جاؤ یعنی اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو بھی میری ہدایت کی طرف پیروی کرے گا نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے)۔

قرآن نے فکری طور پر دو معیار قائم کر دیئے۔ ایک عداوت، ناانصافی، ظلم، جبر اور دوسرا عدل وانصاف،

---

1 الشمس 91:7-8

2 البقرہ 2:31

3 العلق 96:5

4 البقرۃ 2:36

5 البقرۃ 2:38

صلح رحمی اور محبت بین الانسان جو پہلے فکر معیار پر چلے انہوں نے معاشرہ میں بگاڑ کی ابتدا کی جو دوسرے پہلو پر چلے انہوں نے اصلاح اور ہدایت کی پیروی کی۔ حضرت آدم علیہ السلام کرہ ارض پر پہلے نبی ہیں جن سے انسان کے لیے پہلے سماجی نظام کی بنیادی اکائیاں استوار ہوتی ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام تمام ایسی فکر کے متضاد فکر اسلامی کو پیش کیا یا جو صرف فسادات پر مبنی تھی جس کے پیروکار صرف شرک پر مبنی تعلیمات کے قائل تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اس فکر کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور الٰہی فکر سے اس قانونی انحراف کی فکر کی اصلاح فرمائی۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِه فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُه اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ﴾[1]

(بے شک ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا سو انہوں نے کہا اے میری قوم کے لوگو تم اللہ کی عبادت کیا کرو اس کے سوا تمہارا میرا کوئی معبود نہیں یقیناً مجھے تمہارے اوپر ایک بڑے دن کا خوف ہے)۔

پھر ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِه اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ، قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ، اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ﴾[2]

(اور ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تاکہ قبل اس کے کہ ان پر دردناک عذاب آئے آپ اپنی قوم کو اس عذاب سے ڈرائیں۔ (نوح علیہ السلام نے فرمایا) اے میری قوم میں تمہارے لئے واضح طور پر نصیحت کرنے والا ہوں کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری فرمانبرداری کرو)۔

قوم نوح ایک ہٹ دھرم قوم ثابت ہوئی انھوں نے اس آفاقی فکر کو جھٹلا دیا اور ان کے دلوں پر نافرمانی کے قفل پڑے رہے۔ جس کے نتیجے میں ایک طوفان کی صورت میں اللہ کے غضب کا شکار ہوئے۔ اور نافرمانوں کا نام و نشان تک مٹا دیا گیا کیونکہ فکر اسلامی دو ہی مناہج پر سفر کرتی ہے۔ یا تو صراط مستقیم یا پھر صراط الیم جو لوگ سیدھے راستے پر چلے اللہ کے ہاں ان کے لیے بڑا مقام ہے۔ اور جنہوں نے اس راستے کو نہیں چنا چھوڑ دیا اللہ کے غضب کے شکار ہوئے۔ تو دنیا میں بھی ذلت و رسوائی ان کا مقدر اور آخرت کے عذاب سے بھی دوچار ہونے کے لیے اللہ نے ان کے لیے عذاب تیار کر رکھا ہے۔

---

1 الاعراف 59:7

2 نوح 3-1:71

حضرت ابراہیم علیہ السلام جلیل القدر انبیاء میں سے ہیں جن کو اللہ تعالی نے عزت و تمکنت سے نوازا اور بہت ساری آزمائشوں سے گزرنے کے باوجود آپ نے حق کی تبلیغ کو اپنا مسکن بنایا۔ اور ہر طرح کی سختی کو برداشت کیا اور الوہی فکر کی تبلیغ میں کوشاں رہے۔ تاکہ خیر کو شر سے پاک کیا جاسکے۔ اور درست سمت کا تعین ممکن ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا وَلَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ، شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ اِجْتَبٰىهُ وَ هَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ، وَ اٰتَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَاحَسَنَةً وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ، ثُمَّ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ﴾[1]

(بے شک ابراہیم ہی دین کے بڑے مقتد اللہ کے فرمانبردار اور اسی کے ہو کر رہنے والے تھے۔ اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔ وہ تو ان کی نعمتوں کے بڑے شکر گزار تھے۔ اللہ تعالی نے ان کو چن لیا تھا اور ان کو سیدھی راہ پر چلایا تھا۔ اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی بھلائی دی اور بے شک وہ آخرت میں صالحین میں سے ہوں گے۔ پھر ہم نے آپ کی کی طرف وحی بھیجی کہ آپ ملت ابراہیم کی اتباع کریں جو یک رخ ہونے والے تھے اور ہر گز مشرکین میں سے نہ تھے)۔

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اسی الوہی فکر کی ترویج کی جس کا مدعا و منشا اللہ کی ذات کی آگاہی حاصل کرنا تھا۔ حضرت ابراہیم نے اس نمرودی نظام کو للکارہ جو توحید کے راستے میں حائل تھا۔ کعبہ اللہ کی بنیاد رکھی اور شیطانی قوتوں کا قلع قمع ہوا۔ اور اسی اسلامی فکر کو ابھار جس کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہو چکا تھا۔

زمانے میں تبدیلی تنوع اور تغیر و تبدل کا عنصر ہر زمانے میں موجود رہا ہے۔ تغیر و تبدل زمانے کے وہ پہلو ہیں جن کو نہ چاہتے ہوئے بھی انسان کو ان تمام پہلوؤں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ اور اگر عالم انسان کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو قرآن حکیم کی رو سے اس بات سے متعلق مکمل آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ کہ تمام تغیر و تبدل نشوونما اور ارتقاء کا دارومدار ہمیشہ انسانی عقائد پر ہوتا ہے۔ اگر یہ عقائد کسی قوم میں راسخ ہو جائیں تب بھی حقیقت حقیقی ترقی ممکن ہو سکتی ہے۔ اگر عقائد ہی کسی قوم میں زندہ رہیں تو محض افکار و نظریات کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر خورشید احمد رقم طراز ہیں:

"تغیر زمانے کی وہ حقیقت ہے جسے نہ چاہتے ہوئے بھی انسان کو ماننی پڑتی ہے۔ کم و بیش تمام لوگ اس راز کی حقیقت سے شناسا ہیں کہ دن کے بعد رات ضرور آتی ہے۔ انسان جو پیدا ہوتا ہے اسے مرنا ہوتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ صرف تغیر ہی اصل ہے یا ماہیت تغیر میں کچھ اور بھی راز پنہاں ہیں۔ اگر انسان کی زندگی میں ترقی کی بات کی جائے تو کیا ہر ترقی کو عروج سے تعبیر کیا جاسکتا ہے؟ اس کے جواب میں ہمیں ایک حقیقت سے واسطہ

---

1 النحل 16:120-123

پڑتا ہے کہ ہر چیز تبدیل ہوتی ہے۔ مگر ہر تبدیلی یا حرکت جو ماہیت کو تبدیل کرئے وہ ترقی نہیں ہو سکتی ہم صرف اسی حرکت کو ترقی کہہ سکتے ہیں جو صحیح راستہ سے ہمیں اپنی منزل کی طرف لے جارہی ہو۔ جو حرکت منزل کے برعکس سمت میں لے جائے وہ ترقی نہیں بلکہ تنزلی ہے۔"[1]

فکر اسلامی کی وسعت:

انسان کی انفرادی سوچ اور اجتماعی زندگی کی ابتدا کسی مقصد، نظریہ یا شعور سے ہوتی ہے۔ جو بڑھتے بڑھتے اجتماعیت کی شکل اختیار کر لیتی ہے جسے "قومی فکر" یا قومی نظریہ سے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی فکری شعور کو قرآن حکیم میں اس طرح بیان کرتا ہے:

﴿وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾[2]

(اور سارے لوگ ابتدا میں ایک ہی جماعت باہم اختلاف کر کے جدا جدا ہو گئے اور اگر آپ کے رب کی طرف سے ایک بات طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے درمیان ان باتوں کے بارے میں فیصلہ کیا جا چکا ہوتا جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں)۔

مگر اس بابت ایک سوال ابھرتا ہے کہ جب انسان ایک شعور کی پیش نظر پیدا کیا گیا ہے تو یہ اختلافات کی فکر کیوں؟ اس کا جواب شاہ ولی اللہ حجتہ اللہ البالغہ کا میں اس طرح دیتے ہیں:

"(الف) انسان جو بات کرتا ہے اس کی بنا بنارائے کلی پر ہوتی ہے ہر ایک مقصد کے لیے وہ اپنے ذہن نظریہ یا کلیہ ٹھہرتا ہے پھر اسی پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ دیگر حیوانات اس سے محروم ہیں۔

(ب) انسان قناعت نہیں کرتا کہ اپنے لوازم حیات کو سادہ اور ابتدائی صورت کو پورا کرتا رہے۔ حیوانات کو اس کی حاجت نہیں ہوتی کہ اپنی خوراک میں نفاست پیدا کریں مکان بنائیں، مگر انسان تدریجی منازل کی طرف جاتا ہے۔

(ج) نوع انسان میں تمام افراد ایک جیسے نہیں ہوتے بعض ان میں علمی بلحاظ اپنی عقل قوت اختراع کے ممتاز ہوتے ہیں یہ لوگ ارتفاعات (لوازمات سے زندگی) حاصل کرنے کی آسان تدبیریں اور ان میں نفاست اور عمدگی پیدا کرنے کے طریقے اپنے ابنائے نوائے نوع کے لیے استنباط کرتے ہیں"۔[3]

اگر بغور مطالعہ جائے تو واضح ہوتا ہے کہ "فکر اسلامی" وہ فکر ہے جو انسان کو معاشرہ میں کسی بھی پہلو پر اکیلا نہیں چھوڑتی بلکہ انفرادی اور اجتماعی تمام پہلوؤں پر مکمل رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ اسلام چونکہ ایک مکمل ضابطہ حیات

---

1 خورشید احمد، **اسلامی نظریہ حیات** (، شعبہ تصنیف و تالیف، کراچی: 1986ء) ص 105

2 یونس 19:10

3 شاہ ولی اللہ، **حجۃ البالغۃ**، (قومی کتب خانہ، لاہور: 1953ء) ص 262

ہے اور ضابطہ اسی خالق کا جس نے یہ حیات عطا کی ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کا نائب ہے۔ اور اسے تمام مخلوقات پر فوقیت حاصل ہے۔ انسان کو اپنے رب کریم کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور عبادت کا مفہوم یہ ہے کہ زندگی کے کسی شعبہ میں اللہ کی عطا کردہ تعلیمات سے انحراف نہ کرے۔

پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں:

"اسلامی نظریہ حیات پر بات کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ضابطہ حیات کی حیثیت سے اسلامی تعلیمات کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو یہ ہے اسلام ہماری زندگی کی بنیادی حقیقتوں پر روشنی ڈالتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ "اسلام بنیادی عقائد کی شکل میں، زندگی کی شکل میں زندگی کی حقیقتوں سے انسان کو روشناس کرواتا ہے۔ اور کائنات اور حیات کے بارے میں ہمیں بتاتا ہے۔ تاکہ انسان افراط و تفریط سے بچ کر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اعتدال و توازن کی بنیادوں پر استوار کرے اور کامیاب و کامران رہے"۔[1]

اسلامی فکر براہ راست انسانی افعال پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ ایسی فکر کا نام نہیں ہے جس میں ذاتی خواہشات پر اللہ کے قانون کو نظر انداز کر دیا جائے۔ انسانی زندگی کا پھیلاؤ چاہے کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو اس کی فکر میں حیات انسانی اللہ کی مرضی کے مطابق گزارنا فرض ہے۔ یہی شعور انسانی زندگی سکون و اطمینان پیدا کرتا ہے۔ یہی "اسلامی فکر" مصلح کی شکل میں اجتماعی زندگی میں داخل ہوتی ہے۔ جس کا بنیادی مقصد انسانی فلاح ہے یہ نظام فکر ایک ایسا نظام ہے جو انسان کو کامیاب و کامران دیکھنا چاہتا ہے۔

" اگر انسان اس بنیادی فکر کو سمجھنے سے عاری رہے تو اس کا محاسبہ انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے تاریخ کو ایام اللہ سے تعبیر کیا ہے اور اسے علم کا سرچشمہ ٹھہرایا ہے۔ اس کی ایک بنیادی تعلیم یہ ہے کہ اقوام کا محاسبہ انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر کیا جائے"۔[2]

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی نے انسان کو گزشتہ قوموں کی تباہی کا بتا کر انسان کو نا صرف انفرادی بلکہ اجتماعی سطح پر بھی فکری شعور عطا کیا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَاَنَّه اَهْلَكَ عَادَا الْاُوْلٰى، وَثَمُوْدَا فَمَآ اَبْقٰى، وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَ اَطْغٰى، وَ الْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى، فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى، فَبِاَىِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى﴾[3]

(اور یہ کہ اس نے پہلی (قوم) عاد کو ہلاک کیا اور ثمود کو بھی غرض کسی کو باقی نہ چھوڑا۔ اور ان سے پہلے قوم نوح کو بھی کچھ شک نہیں کہ وہ لوگ بڑے ہی ظالم اور بڑے ہی سرکش تھے۔ اور اس نے الٹی بستیوں کو دے پٹخا۔ پس ان کو تھام لیا جس نے ڈھانپا پس ان پر پتھروں کی بارش کر

---

1 خورشید احمد، پروفیسر، **اسلامی نظریہ حیات**، ص4

2 محمد عثمان، پروفیسر، **فکر اسلامی کی تشکیل نو** (سنگ میل پبلیکیشنز: 1975ء) ص144

3 النجم 53:50-55

دی میں انسان ان اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں پر جھگڑے گا)۔

اللہ تعالی نے انسان کی بھلائی اور رہنمائی کا ایک مکمل نظام پیش کیا ہے فکری پختگی اور اصلاح کے لئے عبادات کا نظام عطا کیا جسے رسول آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں نمونہ ہدایت کے طور پر بنی نوع انسان کے لیے پیش کیا گیا۔ حدیث جبریل اس نظام حیات کو مکمل طور پر واضح کرتی ہے:

((وَقالَ: يا مُحَمَّدُ أخْبِرْني عَنِ الإسْلامِ، فقالَ رَسولُ الله صَلَّى اللَّهُ عليه وسلَّمَ: الإسْلامُ أنْ تَشْهَدَ أنْ لا إلَهَ إلَّا اللَّهُ وأنَّ مُحَمَّدًا رَسولُ الله صَلَّى اللَّهُ عليه وسلَّمَ، وتُقِيمَ الصَّلاةَ، وتُؤْتِيَ الزَّكاةَ، وتَصُومَ رَمَضانَ، وتَحُجَّ البَيْتَ إنِ اسْتَطَعْتَ إلَيْهِ سَبِيلًا، قالَ: صَدَقْتَ، قالَ: فَعَجِبْنا له يَسْأَلُهُ، ويُصَدِّقُهُ، قالَ: فأخْبِرْنِي عَنِ الإيمانِ، قالَ: أنْ تُؤْمِنَ باللَّهِ، ومَلائِكَتِهِ، وكُتُبِهِ، ورُسُلِهِ، والْيَومِ الآخِرِ، وتُؤْمِنَ بالقَدَرِ خَيْرِهِ وشَرِّهِ، قالَ: صَدَقْتَ، قالَ: فأخْبِرْنِي عَنِ الإحْسانِ، قالَ: أنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأنَّكَ تَراهُ، فإنْ لَمْ تَكُنْ تَراهُ فإنَّه يَراكَ))[1]

(محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) مجھے بتائیے اسلام کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا! کہ تو لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی گواہی دے نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے، رمضان کے روزے رکھے، اور بیت اللہ کا حج کرے اگر تجھے وہاں تک پہنچنے کی استطاعت ہو۔ یہ سن کر اس شخص نے فرمایا! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درست فرمایا!

حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں ہمیں تعجب ہوا کہ خود پوچھتا ہے اور اس کی تصدیق بھی کرتا ہے جیسے وہ پہلے سے جانتا ہو۔ پھر اس نے کہا مجھے بتائے ایمان کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا! ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر، فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، آخرت کے دن پر اور تقدیر کے خیر اور شر ہونے پر ایمان لائے یہ سن کر اس شخص نے پھر وہی کہا: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سچ فرمایا!

پھر اس نے کہا: مجھے بتائے احسان کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اگر تو اسے دیکھ نہ سکے تو یہ سمجھ کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے)۔

درج بالا حدیث مبارکہ کا جس میں کم و بیش تمام عقائد و اعمال اور اسلامی افکار کا دائرہ کار متعین ہے۔ جو انسان کے انفرادی اعمال سے لے کر اجتماعی افعال و کردار کو واضح کرتی ہے۔ اور اس فکر کو ابھارتی ہے کہ کوئی بھی بات اس دائرہ کار سے باہر نہیں۔

حدیث جبریل کے حوالے سے ڈاکٹر حمید اللہ اپنے خطبات میں ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

1 القشیری، مسلم بن حجاج، **الجامع الصحیح مسلم**، **کتاب الایمان**، باب معرفۃ الایمان والاسلام والقدر، (دارواحیاء التراث العربی، بیروت، 1407ھ) ص36

"نبوت" اسلامی فکر" کی تمام شاخوں یا شعبوں کا اگر ہم علیحدہ علیحدہ ذکر کرنا چاہیں تو ایک نشت میں ساری چیزوں پر روشنی ڈالنا ناممکن ہو گا۔ ظاہر ہے ان سب کارناموں میں دین کی تعلیم ہی کو اولیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری عمر سعی فرماتے رہے۔ خوش قسمتی سے دین کے معاملہ میں سہولت یہ حاصل ہے کہ خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث میں اس کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے"[1]

اسلام ایک وسعت والے دین کا نام ہے جو یہ بات واضح کرتا ہے کہ انسان کو بامقصد پیدا کیا گیا انسان کے افعال و اعمال اور عبادات کے ساتھ ایک فکری دعوت بھی فراہم کرتا ہے کہ انسان کو اپنے رب کی بندگی کس طرح اختیار کرنی ہے۔ بندگی کا ایک واضح تصور اپنے اعمال و افعال میں اللہ تعالی کو صدق دل سے اپنا خالق تسلیم کرنا ہے۔ اور انسانی ذہن میں اس شعور کا آج اگر ہونا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس کا نصب العین اللہ کے احکام کی پیروی ہے اور فکر اسلامی میں اس نصب العین اس مقصد کا جامع اور وسیع تصور صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ انسانی جملہ معاملات پر حاوی ہے جس کا ادراک قرآن حکیم کی اس آیت مبارکہ سے کیا جا سکتا ہے۔ سورۃ البقرہ میں اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآىِٕلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَ الصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾[2]

(نیکی یعنی اصل عبادت یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو، بلکہ نیکی اور اصل عبادت یہ ہے کہ انسان ایمان لائے اللہ پر، قیامت پر، فرشتوں، کتابوں اور رسولوں پر، اور پھر اللہ کی محبت میں اپنے ایمان کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے اپنا سرمایہ دولت خرچ کرے۔ مستحق رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور لوگوں کو طوق غلامی سے آزاد کروانے پر اور نماز قائم کرے، زکوٰۃ دے جب وعدہ کرے تو اپنے قول کو پورا کرنے والا ہو اور صبر کرنے والا ہو مصائب و آلام میں مشکلات و شدائد میں اور جنگ و جدل کے وقت میں یہی سچے لوگ ہیں اور یہی پرہیز گار ہیں)۔

قرآن حکیم کی متعدد آیات مبارکہ فکر اسلامی کو زندگی کے تمام شعبوں میں متعارف کرواتی ہیں اللہ تعالی

---

1 حمید اللہ، محمد، ڈاکٹر، **خطبات بہاولپور** (اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور: 1407ھ) ص 141

2 البقرہ 2: 177

نے اس فکر کو معاشرہ کے ہر پہلو کے ساتھ ملحق کر دیا ہے۔ تاکہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ اس سے خالی نظر نہ آئے۔ جب بہت سارے لوگ آپس میں مل کر رہتے ہیں تو مختلف نوعیتوں سے باہمی طور پر ایک دوسرے سے منسلک ہو جاتے ہیں۔ افراد کے آپس میں منسلک ہونے کی یہ صورت معاشرہ کی اجتماعی حالت کہلاتی ہے۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں صورتوں کا انسانی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

اسلام اپنے نظریہ میں صرف انسان کے معاملات اور عبادات کے نظام کی درستگی پر زور نہیں دیتا بلکہ وہ اجتماعی طور پر ایک منظم معاشرہ چاہتا ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ اجتماعی سطح پر بھی فکر اسلامی کی عکاسی ہو۔ اسی لئے جب ہم "اسلامی فکر نظریہ حیات" کی بات کرتے ہیں اس سے مراد وہ تہذیبی و تمدنی لائحہ عمل ہے جس کو اسلام نے پیش کیا ہے اسلام قوت فکر کو فروغ دیتا ہے۔

پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں:

> "یہ ایک گہرا فکری ادراک ہے کہ نظریہ کو انفراد سے اجتماع تک تنوع دے کر فرد اور ریاست، قوم اور معاشرہ میں ایک ربط پیدا کیا گیا ہے۔ انسان کی انفرادیفکر و اجتماعی فکر کے لئے فکر اسلامی ایک بااعتماد نظریے کا نام ہے۔ اگر اس فکر کا مقابلہ مغربی فکر سے کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغرب کے پاس کوئی مکمل نظام فکر موجود نہیں جو ہے وہ عیسائیت کا دیا ہوا نظام ہے جسے کئی بار خود اپنے ہی لوگ مسترد کر چکے ہیں۔ عیسائیت کوئی مکمل نظام فکر نہ دے سکی نتیجتاً مغرب کا انسان الہامی ہدایت سے محروم ہو گیا اس کا ملکہ صرف انسانی ذہن و فکر پر ہی موقوف رہا اس فکری ناکامی نے اس میں مایوسی کو جنم دیا بالآخر وہ نظریہ حیات کا منکر ہوا"۔[1]

گویا اسلامی نظریہ فکر نے دنیا کو یقین کی طاقت سے مالامال کر دیا جس کے سب سے بڑے نمائندہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔

اس تمام بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے "فکر اسلامی" تمام بنی نوع انسانی کے لیے اللہ تعالی کی رحمت کا مظہر ہے۔ تاکہ انسان تمام شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں کردار ادا کر سکے یہی امر اسلامی فکر کی ضرورت و اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ فکر اسلامی سے مراد انسان کا وہ نظریہ حیات ہے جو الہامی علم کی روشنی میں انسانی تعقل کی بنیاد پر ارتقاء پذیر ہو کر مکمل ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جو انسان کی دنیوی و اخروی زندگی میں کامیابی کے اصول، الہامی کتابوں اور پیغمبران کرام کے ذریعے انسانوں کو عطا کئے اور آخری کتاب قرآن حکیم اور نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کے ذریعے اس نظام فکر کی تکمیل کی۔ اس نظریہ حیات علم وحی کی روشنی میں اور پیغمبر خدا کے اسوہ حسنہ کی صورت میں دنیائے عالم میں وقوع پذیر ہوا۔

فکر اسلامی کے بنیادی ماخذ:

---

1 خورشید احمد، **اسلامی نظریہ حیات**، ص5

اسلام اس پیش کردہ فکر میں غور و فکر اور تدبر کی دعوت دیتا ہے تاکہ وحی کے ذریعہ پیش کردہ فکر کے تمام ضوابط کی وضاحت ہو سکے۔ تفکر کی یہ استعداد صرف اور صرف انسان کو دی گئی ہے دوسرے حیوانات اس سے محروم ہیں اور تفکر صرف اس شئ میں فکر کرنے کے لیے کیا جاتا ہے جس کا تصور دل و دماغ میں آسکے۔ اسی لیے اسلامی فکر سے متعلق اسی بات کو علامہ اقبال ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"The birth of Islam is the birth of inductive intellect"[1]

(اسلام کا پیدا ہونا فکر استقرائی کا پیدا ہونا ہے)۔

اسلام تمام بنی نوع انسان کو ہر پہلو سے عالی مرتبہ دیکھنا چاہتا ہے۔ خواہ وہ پہلو انفرادی ہوں یا اجتماعی ہر ایک سلسلہ میں اسلام بھرپور رہنمائی کرتا ہے۔ فکر اسلامی کا سرچشمہ قرآن حکیم اور احادیث نبویہ ہیں۔ فکر اسلامی کی اساس اور بنیادی مصادر قرآن و حدیث ہی ہیں جو مسلمان کے کلی نظریات اور اس سے نکلنے والی اجتماعی و انفرادی سیاسی اور سماجی ابعاد یعنی(Dimensions) کی طرف مکمل رہنمائی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اپنی کتاب "قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل" میں ذکر کرتے ہیں:

"فکر ہی سے کسی تہذیب و تمدن کے لئے خلیے بنتے ہیں۔ اسلامی فکر کے جائزہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ فکر خالصتاً مذہب پر مشتمل ہے۔ فکر اسلامی میں ہر علم کو وحی سے اکتساب فیض کرنا ہوتا ہے۔ اسی انسانی علوم بھی اپنے انداز فکر میں وحی کے تابع ہوتے ہیں۔ اگر اسلامی فکر کے اس پہلو کو مد نظر نہ رکھا جائے جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ زوال فکر اور اصلاح فکر کے راستوں کو مسدود کرنا ہے"۔[2]

قرآن حکیم فکر اسلامی کی بنیاد:

فکر اسلامی کی بنیادی ماخذ میں قرآن حکیم اصل الاصول ہے۔ یہ اصول اور کلیات کا مجموعہ ہے۔ اس میں بنیادی طور پر اللہ سبحان و تعالی کی حکمت عملی اور دستور سے بحث ہے۔ جبکہ جزوی قوانین کی تفصیل نہایت اہم ہے، جیسا کہ علامہ شاطبی لکھتے ہیں:

((القرآن على اختصاره جامع ولا يكون جا معا الا والمجموع فيه امور كليات))[3]

(قرآن حکیم مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے اور یہ جامعیات اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس میں کلیات بیان ہوئے ہوں)۔

اسی طرح ایک اور موقع پر فرماتے ہیں:

((تعريف القرآن بالاحكام الشرعية اكثر ه كلي لاجزئي وحيث جزئيا فاخذ لا على

1 Allama Iqbal,The Recontstuction of Religious Thought in Islam, p:120

2 فاروقی، برہان احمد ڈاکٹر، **قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل**، (دارالاشاعت، کراچی) ص 53

3 الشاطبی، ابی اسحاق ابراھیم بن موسی، **الموافقات** (ادارہ اسلامیہ، دولہ قطر)، ج:3، ص 367

الکلیہ))[1]

(قرآن حکیم میں احکام شرعیہ اکثر کلی طور پر بیان ہوئے ہیں جہاں جزئی طور پر تفصیل ہے وہ کسی حکم کے ماتحت ہے)

قرآن حکیم چونکہ ہدایت الہی کی آخری کتاب ہے۔ اِس لیے اس کی تعلیمات اوراس کی تفہیمات کا ہر زمانہ میں یکسانیت کے ساتھ پایا جانا ضروری تھا۔ اور یہ اسی طرح ممکن تھا کہ ہر شعبہ ہائے زندگی کے حدود اربعہ بنا کر نشاندہی کر دی جاتی تا کہ مسائل کے حل کے لئے ہر طرح کی ممکنہ صورت حال کا جائزہ لیا جا سکے۔

قرآن حکم اللہ کی آخری کتاب ہے جو رسول اللہ ﷺ پر نازل فرمائی گئی۔ جو قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے ہدایت کا دائمی صحیفہ ہے ۔ اورر اسلامی قانون کا اولین سر چشمہ اور شریعت اسلامی کا مصدر ہے۔ قرآن حکیم تمام لوگوں کے لیے امام اورروشن دلیل ہے۔ اور اس کی برپا کردہ علمی تحریک تمام لوگوں کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ قرآن حکیم کا آغاز ان آیات سے ہوا۔

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَOخَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍOاِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُۙOالَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِۙ Oعَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ﴾[2]

(اپنے رب کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا۔ انسان کو خون کے لوتھڑے سے بنایا۔ پڑھو اور تمہارا رب ہی سب سے بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم سے لکھنا سکھایا۔ انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہ جانتا تھا)۔

اور اختتام پذیر ان آیات کے ساتھ ہوا:

﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾[3]

(آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور میں نے تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا)۔

قرآن حکیم کے مکمل نازل ہونے کے بعد شریعت اسلامیہ مکمل ہو گئی۔ اللہ تعالی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن مجید کو نازل فرمایا جو سلسلہ ہدایت کی آخری کڑی ہے اور تمام اقوام عالم کے لئے ابدی صحیفہ ہدایت ہے۔ اسلامی قوانین کا سب سے پہلا اور موثر ذریعہ ہے اور اسلامی شریعت کا مصدر اول ہے۔ قرآن حکیم تمام الہامی کتابوں کا خلاصہ ہے اور پہلے نازل ہونے والی کتب کی تصدیق کرتا ہے قرآن عقائد، عبادات، اخلاق وتمدن، معاملات

---

1 الشاطبی، **الموافقات**، ج:3، ص367

2 العلق 96:1-5

3 المائدہ 3:5

الغرض ہر طرح کی تعلیمات کا مجموعہ ہے۔ اس کی تعلیم عالمگیر حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن حکیم تمام انسانیت کے لئے امام اور مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اس کی پیش کردہ عالمی تحریک تمام انسانیت کا سرمایہ ہے۔ قرآن حکیم ہی اصل الاصول ہے یعنی جتنے بھی مصادر شریعت کا بیان ہو گا خواہ وہ بنیادی ہو یا ثانوی وہ سب دراصل اسی اولین مصدر قرآن کریم پر مبنی ہیں۔

قرآن حکیم ایک محفوظ ترین کتاب ہے۔ جس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ نے لی ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَه لَحٰفِظُوْنَ﴾[1]

(بیشک ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور بیشک ہم خود اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)۔

قرآن حکیم اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ حسی طاقتوں یعنی آنکھ کی بینائی اور کان کی سنوائی فقط اس وقت کارگر ہوتی ہیں جب دل کی بینائی جاگ جاتی ہے۔ جو لوگ کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے ان کے قلوب بینائی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس حق گوئی کو تسلیم نہ کرنے کی وجہ قوت بَصَرَ یاسَمِعَ کو نہیں قرار دیا بلکہ دل کی نابینائی بتائی ہے۔ جو درحقیقت قوت فکر کا نابینا ہونا ہے:

﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾[2]

(بات یہ ہے کہ ان کی آنکھیں اندھی نہیں ہیں بلکہ سینوں میں دل اندھے ہیں جو غور و فکر سے عاری ہیں)۔

قرآن حکیم نے انسانی فکر و تدبر کو مختلف اسالیب میں بیان کیا ہے۔ سورۃ "ص" میں ہے:

﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِه وَ لِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾[3]

(یہ کتاب برکت والی کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف نازل فرمایا ہے کہ ہر دانشمند لوگ اس کی آیتوں میں غور و فکر کریں اور نصیحت حاصل کریں)۔

الزبیدی "تاج العروس" میں لکھتے ہیں:

((ادرک الشئ بتفکر وتدبرالاثرہ فھی اخص من العلم))[4]

(علم کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ غور وخوض کرکے اس کے اثرات کو پالیں)۔

تدبر کے حروف اصلیہ د، ب، ر جس کے لغوی معنی کسی پیٹ پیٹھ یا پشت کے ہیں اسی طرح تدبر کا معنی کسی بھی معاملہ کے انجام پر نظر رکھتے ہوئے غور و فکر کرنا ہے قرآن حکیم میں عقل، سمجھ اور فہم و فراست کے لئے استعمال ہوا ہے۔

1الحجر 9:15
2الحج 46:22
3ص 29:38
4الزبيدي، تاج العروس من جواهر القاموس، ص133

دوسرے مقام پر، اسی مفہوم میں بصیرت وبصارت کے الفاظ اسی مفہوم میں یوں آئے ہیں:

﴿قد جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِه وَ مَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا وَ مَآ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ﴾[1]

(بے شک تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے ہدایت کی نشانیاں آچکی ہیں پس جس نے انہیں نگاہ بصیرت سے دیکھ لیاتو یہ اس کی ذات کے لیے فائدہ مند ہیں جو اندھا رہ گیااس کا وبال اسی پر ہے اور میں نگہبان نہیں ہوں)۔

بصیرت کا لفظ کئی صرفی صورتوں میں قرآن حکیم میں استعمال ہوا ہے بصر عربی زبان میں آنکھ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ علامہ بیضاوی لکھتے ہیں:

((وھی لنفس کاالبصر للبدن))[2]

(بصائر بصیرت کی جمع ہے جس طرح جسم کے لئے بصر ہے اسی طرح نفس روح کے لیے بصیرت ہے)۔

بصیرت کے معنی ہیں غور وفکر اور عقل کے استعمال سے کسی بات کی تہہ تک پہنچنا اور حالات وواقعات سے نصیحت اور عبرت حاصل کرنا۔ علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

((بابصیرۃ الحجۃ البنیۃ الظاہرۃ))[3]

(بصیرت ایک حجت اور ظاہری دلیل ہے)۔

اسی طرح قرآن میں انسانی شعور وادراک کے ساتھ بھی علم وتدبر مذکور ہے:

﴿وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰیَةٌ لَّیُؤْمِنُنَّ بِهَا قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ مَا یُشْعِرُكُمْ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا یُؤْمِنُوْنَ﴾[4]

(وہ بڑے تاکیدی حلف کے ساتھ اللہ کی قسم میں قسم کھاتے ہیں اگر ان کے پاس کوئی کھلی نشانی آجائے تو وہ اس پر ضرور ایمان لے آئیں ان سے کہہ دو کہ نشانیاں تو صرف اللہ کے پاس اور (اے مسلمانو) تمہیں کیا خبر کے جب نشانی آجائے تو وہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے)۔

شعور کا لفظ کی صرفی اشکال میں قرآن میں وارد ہوا ہے۔ اس کا مادہ ش،ع،ر ہے جس کے معنی ہیں کسی بات کو جان لینا، سمجھ لینا۔ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:

((واشعرتہ ای ادرتیہ))[5]

---

1 الانعام 104:6

2 البیضاوی، عمر بن عبد اللہ، انوار التنزیل واسرار التاویل (دار الکتب العلمیہ، بیروت: 1408ھ) ج:1، ص439

3 القرطبی، ابوعبد اللہ محمد بن احمد، الجامع الاحکام القرآن (، دار الکتب المصریہ، القاہرہ: 1964ء) ص؛57

4 الانعام 109:6

5 الافریقی، محمد بن مکرم بن منظور، لسان العرب (دار صادر، طبع اول، بیروت) ج4، ص410

(مجھے محسوس ہوا یعنی میں نے پالیا)۔

قرآن حکیم میں حکمت کی اصطلاح خاص، انسانی فکر و تدبر کے اعلیٰ درجے کے طور پر مذکور ہے۔ لہٰذا، نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی بعثت جلیلہ کے سلسلے میں ارشاد ہوا:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْبَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْاعَلَيْهِمْ اٰيٰتِه وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾[1]

(بے شک اللہ تعالی نے مسلمانوں پر بڑا احسان فرمایا! کہ ان میں انہی میں سے عظمت والے رسول مبعوث فرمائے جو ان پر انہی کی آیات پڑھتے اور انہیں پاک کرتے ہیں اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں)۔

حکمت کا لفظ متعدد مقامات پر قرآن حکیم میں استعمال ہوا ہے، جس کا معنی کسی بات یا کسی چیز کی اصلاح و درستی کے لیے مدبرانہ غور وفکر کرنا اور اس بات کا مناسب حل تلاش کرنا ہے۔ غور و فکر اور تدبر و تحقیق کے بعد جو حل تلاش کیا جاتا ہے اسے حکمت کہتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کا سب سے نمایاں پہلو یہ تھا کہ آپ نے علم اور سچائی کے ذریعے لوگوں کو صحیح فکر سے روشناس کروایا، اسی وجہ سے اسلام کے اعتقادات اور اصول صرف عقل، فہم اور سچائی پر مبنی ہیں۔[2]

حدیث وسنت رسول ﷺ بطور ماخذ فکر:

فکر اسلامی کا دوسرا ماخذ سنت نبوی یا حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ سنت کے معنی طور طریقہ کے ہیں اور آئمہ وفقہاء کی اصطلاح میں سنت سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام افعال اور اقوال اور دوسروں کے وہ افعال واقوال جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے خاموشی اختیار کی اور جن کو قائم رکھا سنت کہلاتا ہے۔ اسی بنیاد پر صحابہ کرام کے اقوال بھی اس میں داخل ہیں۔

حدیث بامعنی قصہ، واقعہ اور گفتگو بھی استعمال ہوا ہے اسی ضمن میں قرآن حکیم میں آتا ہے:

﴿وَ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى﴾[3]

(اور کیا تمہارے پاس موسیٰ کی خبر آئی)۔

بطور اصطلاح، حضور ﷺ کی موجودگی میں آپ کے ارشادات، افعال اور بیانات کے لیے حدیث کا لفظ استعمال ہوتا رہا ہے۔ جسے بعد میں صحابہ وتابعین نے بھی استعمال کیا۔ اس کی مثال کتب حدیث و تاریخ میں پائی جاتی ہیں۔

---

1 آل عمران 164:3

2 خان، عبد الوحید، **پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی شخصیت** (انٹرنیشنل پبلیکیشنز ہاؤس، ریاض: 2012ء) ص 33

3 طہ 9:20

علامہ کرمانی نے حدیث رسول کی تعریف نقل کرتے ہوئے لکھا:

((ماأضيف إلى النبى من قول اوفعل اوتقريراو و صف خلقى اوخلقى))[1]

(حدیث سے مراد آپ کی طرف منسوب قول، فعل، تقریر، یا آپ کے جسمانی واخلاقی اوصاف کا بیان ہے)۔[2]

البتہ حدیث کا لفظ فقہاء کے نزدیک صرف اصول کے اقوال پر ہوتا ہے۔ محدثین نے حدیث کے مفاہیم کو واضح کرنے کے لئے وسعت سے کام لیا۔ اور اس کو بھی دونوں کے لئے عام کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول و فعل خواہ انہیں سنت کہا جائے یا احادیث کہا جائے ایک ہیں۔ ملاں جیون فرماتے ہیں:

"السنة تطلق على قول الرسول وفعله وسكوته وعلى أقوال الصحابة وا أفعال هم"[3]

(سنت کا اطلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول و فعل پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سکوت اور صحابہ کے اقوال پر ہوتا ہے۔)

قرآن حکیم کی متعدد آیات سنت کی بنیاد کو واضح کرتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال و افعال کو قرآن کا شارح قرار دیتی ہیں۔ سورۃ النحل میں ہے:

﴿وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ﴾[4]

(اور اے حبیب! ہم نے تمہاری طرف یہ قرآن نازل فرمایا تاکہ تم لوگوں سے وہ بیان کردو جو اُن کی طرف نازل کیا گیا ہے اور تاکہ وہ غور وفکر کریں)۔

اگر قرآن کی مجموعی تعلیمات نظر رکھا جائے تو یہ بات واضح ہوگی کہ آپ ﷺ کی ذات اقدس کو حیات انسانی کے لئے مستقل راہنما اور ایک مؤثر قائد کی حیثیت سے مختلف پیرایوں میں پیش کیا گیا ہے۔ قرآنی آیات اس بات کی دلیل ہیں کہ رسول ﷺ معلم بھی، مربی و مزکی بھی اور حاکم و قاضی بھی۔ آپ ﷺ نے افراد کی فکری و عملی تربیت فرما کر ان کو ایک منظم جماعت کی شکل دی اور ایک مضبوط ریاست کو قائم کیا۔

آپ ﷺ نے جس منظم معاشرہ کی بنیاد رکھی وہ ایک مثالی معاشر تھا۔ اسے ہر آنے والے دور کے لیے مثال کے طور پر پیش ہونا تھا، اس لئے آپ ﷺ نے سماجی، معاشی اور سیاسی زندگی کے تمام پہلوؤں اور اہم تقاضوں کو پورا کیا۔ البتہ ایسی گنجائش موجود رہی کہ قرآن وسنت کی تعلیمات اور روشنی کے تحت اجتہاد کی روح برقرار رہے۔

---

1 الکرمانی، محمد بن، **الکواکب، الداری فی شرح الجامع الصحیح بخاری**، (دار احیاء التراث العربی، بیروت)، ج1، ص6

2 محدثین کی اصطلاح کے مطابق تقریر سے مراد کسی قول یا عمل کی خاموشی منظوری (Silent Appooral) ہے یعنی آپ ﷺ سامنے کچھ ہوا اور آپ نے اس پر اعتراف نہیں کیا۔

3 ملا جیون، شیخ احمد ابی سعد، **نور الانوار شرح رسالۃ المنار**، (دار الفاورق، عمان الاردن: 1420ھ)، ص37

4 النحل 44:16

متعدد آیات آپ ﷺ کی حیثیات کو نمایاں کرتی ہیں۔ مثال کے طور یہ آیت:

﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾[1]

(جیسا کہ ہم نے تمہارے درمیان تم میں سے ایک رسول بھیجا جو تم پر ہماری آیتیں تلاوت فرماتا ہے اور تمہیں پاک کرتا اور تمہیں کتاب اور پختہ علم سکھاتا ہے اور تمہیں وہ تعلیم فرماتا ہے جو تمہیں معلوم نہیں تھا)۔

ایسی تمام آیات مبارکہ میں رسول ﷺ کے فکری کام کی نوعیت کو چار پہلوؤں سے بیان کیا گیا ہے:

تلاوت آیات، تزکیہ نفس، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت، جہاں تک تلاوت آیات کا تعلق ہے تو یہ بات ظاہر ہے کہ جو کچھ اللہ کی طرف سے نازل ہوا اِس میں آپ ﷺ کی ذمہ داری یہ ہے کہ نازل شدہ کلام لوگوں کو من وعن سنادیں اوران تک پہنچادیں۔ قرآن کی کئی آیات میں اس باب کی طرف اشارہ موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَه وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾[2]

(اے رسول! جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا اس کی تبلیغ فرمادیں اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اُس کا کوئی پیغام بھی نہ پہنچایا اور اللہ لوگوں سے آپ کی حفاظت فرمائے گا)۔

اس آیت مبارکہ میں آپ کی ذمہ داری کو واضح طور پر بیان میں کیا گیا کہ لوگوں تک کلام الٰہی کو پہنچادیں۔ اس کے علاوہ بہت ساری آیات اس ضمن میں مرکوز ہیں۔ تعلیم کتاب سے مراد یہاں معنی ومفاہیم کو ذہین نشین کرانا ہے اور عام طور پر اس کی دو صورتیں ہیں: ا۔ قرآن حکیم کی آیات کی تشریح اپنی زبان میں بیان کرنا۔ ب: قرآن حکیم کے احکام کے مطابق عمل کرکے دیکھانا۔

آپ ﷺ نے قرآنی احکام کی تعلیمات کو بیان کرنے کے لئے یہی طریقے اختیار کئے۔ مثلا نماز کا طریقہ، تقسیم زکوۃ، تنظیم ریاست ومعشت اور آداب معاشرت ان تمام امور کے بارے میں رسول ﷺ نے کتاب کی تعلیمات کے مطابق عمل کیا۔ اسے نظر انداز کردینے سے تعلیم کتاب کی خود ساختہ کہانی تو بن سکتی ہے۔ مگر وہ حقیقی تعلیم نہیں بن سکتی بن سکتی جو اللہ کی مرضی ہے۔ نماز، قیام، رکوع، سجود اور تسبیح سب کا ذکر قرآن میں موجود ہے مگر اس کا طریقہ ادا، اور عملی تشکیل آپ کے عمل سے ثابت ہے۔

متعدد آیات قرآنیہ کے پس منظر میں ایسے مخصوص حالات وواقعات ہیں جن کا تعلق آپ ﷺ کی ذات اقدس یا آپ ﷺ کے عمل سے ہے۔ جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

1 البقرہ 151:2

2 المائدہ 67:5

﴿وَ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾[1]

(اور ہم نے تم پر یہ کتاب اس لئے نازل فرمائی ہے تاکہ تم لوگوں کیلئے وہ بات واضح کر دو جس میں انہیں اختلاف ہے اور یہ کتاب ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے)۔

کتاب اللہ کی یہ تبیین و تشریح آپ ﷺ کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ قرآن حکیم کے نزول کے اغراض ہی یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اللہ کے احکام کو لے کر اس فہم و بصیرت جو اللہ نے ان کو عطا کی ہے لوگوں کے درمیان عدل و انصاف کریں۔ حدیث رسول وحی الٰہی کے بعد دوسرا قانون اسلامی کا دوسرا ماخذ ہے۔

حکمت کا مادہ "حِکم" ہے اور حکم کے معنی ہیں منع منعاللاصلاح یعنی کسی کی اصلاح کے لیے کسی کو کسی کام سے باز رکھنا۔ صاحب لسان العرب نے حکمت کے معنی و مفہوم کو اس طرح بیان کیا ہے:

((الحكمة عبارة عن معرفةافضل الاشياء با فضل العلوم))[2]

(حکمت بہترین چیز کو بہترین علم کے ذریعے جاننے کو کہتے ہیں)۔

الاصفہانی لکھتے ہیں:

((والحكمة اصابة الحق بالعم والعقل فالحكمة من اللہ تعالیٰ معرفة الاشياء واجادهاعلى غاية الاحكام ومن الانسان معرفة الموجودات وفضل الخيرات))[3]

(اور حکمت علم اور عقل کے ذریعے سے سچی اور صحیح بات کو پہنچنا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی حکمت چیزوں کو جاننا اور ان میں بکمال خوبیپیدا کرنا ہے۔ اور انسان کی حکمت موجودات جاننا اور اچھی باتوں کا کرنا ہے)۔

علماء کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے کی آپ ﷺ کی سنت وہ حکمت ہے جو اللہ سبحان کی طرف سے آپ کے دل میں ڈالی گئی۔ تمام دلائل اور علمائے قرآن کے اقوال سے یہ معلوم ہوا کہ یہ ایک ہی مفہوم سے کی کئی تعبیریں ہیں۔ اور ایک ہی حقیقت کی متعدد متعدد تفاسیر بھی، اصل حکمت نبوی وہ نور نبوت اور الہامی معرفت ہے۔ جس کو اللہ تعالی نے رسول اللہ کے قلب و ذہن میں اتارا ہے۔

قرآن حکم آپ کی ذات اقدس کو بطور نمونہ تقلید پیش کرتا ہے۔ اور ان کی پیروی کا حکم دیتا ہے اور ساتھ یہ اعلان کرتا ہے۔ کہ اللہ کی محبت کا حصول رسول کی محبت و اطاعت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ آپ کی ذات کو تمام انسانیت کے لیے نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

1 النحل 64:16

2 الافریقی، **لسان العرب**، ج12، ص140

3 الاصفہانی، **المفردات فی غریب القرآن**، ص126

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْیَوْمَ الْاٰخِرَ﴾[1]

(بیشک تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ موجود ہے اس کے لیے جو اللہ اور آخرت کے دن کی امید رکھتا ہے)۔

آپ ﷺ کی شخصیت کا نمایاں ترین پہلو یہ ہے کہ اللہ نے آپ کو شارع قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تشریعی اختیارات (legislative Powers) دیئے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حلال و حرام صرف وہ نہیں جو قرآن حکیم میں بیان ہوئے بلکہ وہ سب بھی ہیں جن کو رسول اللہ نے حرام یا حلال قرار دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُۗ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْاۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ﴾[2]

(اور رسول جو کچھ تمہیں عطا فرمائیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں منع فرمائیں تو تم باز رہو اور اللہ سے ڈرو بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے)۔

یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن حکیم اللہ کی پیروی کے ساتھ ساتھ سول اللہ کی سیرت و کردار اور افعال و احوال کی پیروی کی بھی تلقین کرتا ہے۔ سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾[3]

(اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان کی جو تم میں سے حکومت والے ہیں۔ پھر اگر کسی بات میں تمہارا اختلاف ہو جائے تو اگر اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو تو اس بات کو اللہ اور رسول کی بارگاہ میں پیش کرو)

اس سے یہ واضح ہے کہ قرآن حکیم نے رسول کی ذات کو ماخذ قانون کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ تمام امت اس پر متفق ہے کہ آپ کی ذات قرآن حکیم کے بعد دوسرا قانونی ماخذ ہے۔ حدیث و سنت کی حجیت و حقیقت کا دارومدار آپ ﷺ کے ادراک سے ہے۔ یہ ان کا مقام و مرتبہ ہے کہ جو ان کے افعال و اقوال کو نمونہ تقلید قرار دیتا ہے۔ اسی وجہ سے حدیث و سنت کی دینی حیثیت مسلم ہے۔

اجتہاد اور فکر اسلامی

---

1 الاحزاب 21:33

2 الحشر 7:59

3 النساء 59:4

اسلامی فکر نو کی تشکیل وار تقا کا ذریعہ اجتہاد ہے۔ علامہ الزبیدی لکھتے ہیں:

"الجھد:ای المشقة وفي حديث معاذ: اجتھد لائی الاجتهاد بذل الوسع في طلب الامر والمراد به رد القضيه من طريق القياس الى الكتاب والسنة"[1]

("جہد" سے مراد مشقت ہے اور حدیث معاذ میں ہے کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ کسی امر شرکی تلاش میں اپنی فت کھپا دینے کا نام اجتہاد ہے۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ کسی فیصلے کو قیاس کے ذریعے کتاب وسنت کی طرف لٹا دینا ہے)۔

امام غزالی اجتہاد کی اصطلاحی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"صار اللفظ في عرف الفقهاءمخصوصا ببذل المجتهد وسعة في طلب العلم بالاحكام الشريعة والاجتهاد التام ان يبذل الوسع في الطلب بحيث يحس من نفسه بالعجزعن مزيد الطلب"[2]

(فقہاء کے عرف میں "اجتہاد" کا لفظ مجتہد کی اس محنت کے ساتھ خاص ہے جیسے وہ شرعی احکام کے حصول میں لگاتا ہے۔ اجتہاد تام یہ ہے کہ مجتہد شرعی احکام کا علم صل کرنے کے لیے اپنی محنت کو اس طرح لگائے کہ اس سے زیادہ محبت کرنے کی اس میں ہمت اور حوصلہ نہ ہو)۔

گویا اجتہاد مجتہد کی اس انتہائی کوشش کا نام ہے۔ جو فقہ اسلامی کے تفصیلی دلائل کی روشنی میں کسی شرعی عملی حکم کے حصول میں کی جائے۔

انسانی زندگی مسلسل ارتقاد اور تبدیلیوں سے عبارت ہے۔ تہذیبوں اور قوموں کی بقاء کا راز اسی میں مضمر ہے، اور اس لیے اجتہاد کی اہمیت کا انکار کرنا کسی طور ممکن نہیں ہے کیونکہ اگر اقوام اس میں جمود کا شکار ہو جائیں تو اپنے وجود کے خلاف دلیل قائم کرتی ہیں۔ اسلام ایک متحرک انظام زندگی رکھے ہے۔ اور تمام نظام ہائے زندگی پر غالب اور قیامت تک رہنے والا دین ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسْلاَمَ دِينًا﴾[3]

(آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمتوں کو تمام کر دیا ہے اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسندیدہ بنا دیا ہے)۔

قرآن مجید کی ایک اور آیت کریمہ میں اور ارشاد ربانی ہے:

﴿هُوَ الَّذِىٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ

---

1 الزبیدی، **تاج العروس**، ج2، ص330

2 الغزالی، ابی حامد محمد بن محمد، **المستصفیٰ من علم الاصول**، (مؤسسۃ الرسالہ بیروت: 1997ء)، ص382

3 المائدہ 3:5

كُلِّـه وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُـوْنَ﴾[1]

(اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کرے اور اگرچہ مشرک ناپسند کریں)۔

اسلام کی بنیاد ان ابدی اصولوں پر رکھی گئی ہے جو ہر زمان و مکان میں نسل انسانی کی بقا اور راہ ہدایت کے لیے باعث صلاح ہیں۔ اسلام کا اپنے آپ کو بطور متحرک اور قیامت تک انسانی راہنمائی کا ثبوت پیش کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے مزاج میں ٹھہراؤ اور جمود نہیں ہے۔ اگر اسلام کا دامن ان کارہائے نمایاں سے خالی ہوتا تو اس کی فطرت میں انسانی مسائل کے حل کی تڑپ موجود نہ ہوتی۔ اسلام انسانی زندگی کے بارے میں تنگ نظر نہیں ہے۔ وہ ہر لحاظ سے اسے پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾[2]

(اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے اور تم پر تنگی نہیں چاہتا)۔

انسانی زندگی میں پیش آمدہ مسائل جن کے بارے میں بنیادی ماخذ قرآن اور حدیث میں اگر صریح اور واضح حکم نہیں ملتا کو ان مسائل کے حل کے لیے اسلام ایک طریقہ فراہم کرتا ہے۔ جو اجتہاد ہے۔

ذیل کی آیت مبارکہ اجتہاد کے معنی و مفہوم اور دائرہ کار میں وسعت پیدا کرتی ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَـآ اِلَيْكَ الـذِّكْرَ لِتُـبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْـهِـمْ وَلَعَلَّـهُـمْ يَتَفَكَّـرُوْنَ﴾[3]

(اور ہم نے تیری طرف قرآن نازل کیا تاکہ لوگوں کے لیے واضح کر دے جو ان کی طرف نازل کیا گیا ہے اور تاکہ وہ سوچ لیں)۔

ابو بکر جصاص ﴿لَعَلَّـهُـمْ يَتَفَكَّـرُوْنَ﴾ کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں۔ ایسی چیز میں تفکر اور غور و فکر کرنا جس میں کوئی صریح نص موجود نہ ہو۔ اسی طرح ارشاد ہے:

﴿وَشَاوِرْهُـمْ فِى الْاَمْرِ﴾[4]

(اور کام میں ان سے مشورہ لیا کر)۔

یہاں مشاورت سے مراد یہ ہے کہ جن امور میں ان کا حکم اجتہاد کے طریقہ سے معلوم کرنا ہو وغیرہ

---

1 التوبہ 33:9

2 البقرہ 185:2

3 النحل 44:16

4 آل عمران 159:3

وغیرہ۔ جس کے متعلق کوئی واضح حکم موجود ہو اس میں مشاورت نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو جو راستہ دیکھایا اور جو ہدایت دی وہ عام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّــآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرَاكَ اللّٰــهُ﴾[1]

(بے شک ہم نے تیری طرف سچی کتاب اتاری ہے تاکہ تو لوگوں میں انصاف کرے جیسا کہ تمہیں اللہ نے بتایا ہے)۔

اس آیت مبارکہ میں قرآن کا حکم اور حکم سے استنباط کرنا دونوں شامل ہیں۔ اجتہاد کی مشروعیت کے حوالہ سے حدیث معاذ بڑی اہمیت کی حامل ہے:

((معاذ بن جبل، ان رسول الله صلى الله عليه وسلم، لما اراد ان يبعث معاذا إلى اليمن، قال:" كيف تقضي إذا عرض لك قضاء؟قال: اقضي بكتاب الله، قال: فإن لم تجد في كتاب الله؟، قال: فبسنة رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال: فإن لم تجد في سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم، ولا في كتاب الله؟، قال: اجتهد رايي ولا آلو، فضرب رسول الله صلى الله عليه وسلم صدره، وقال: الحمد لله الذي وفق رسول رسول الله لما يرضي رسول الله))[2]

(حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں سے حمص کے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ کو جب یمن (کا گورنر) بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: ”جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ آئے گا تو تم کیسے فیصلہ کرو گے؟“ معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کی کتاب کے موافق فیصلہ کروں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اگر اللہ کی کتاب میں تم نہ پا سکو؟“ تو معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے موافق، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اگر سنت رسول اور کتاب اللہ دونوں میں نہ پاس کو تو کیا کرو گے؟“ انہوں نے عرض کیا: پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، اور اس میں کوئی کوتاہی نہ کروں گا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ کا سینہ تھپتھپایا، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کو اس چیز کی توفیق دی جو اللہ کے رسول کو راضی اور خوش کرتی ہے)۔

یہ بات واضح ہے کہ شریعت اسلامیہ میں جس اجتہاد کا اعتبار ہے وہ کتاب حکم اور رسول ﷺ کی سنت سے دلیل تلاش کرنے میں جہد وجہد اور کوشش کرنے کا نام ہے۔

اس تعلیم وتربیت کا مقصد قلب ونفس کا تزکیہ کرنا اور اعلی اخلاقی اقدار کو اجاگر کرنا تھا۔ اور یہ کام رسول اللہ

---

1 النساء 105:4

2 السجستانی، سلمان بن اشعث، السنن کتاب الاقضیہ، باب اجتھاد الرأی فی القضاء (دار الکتب العربی، بیروت)، رقم الحدیث: 3592

ﷺ نے مکی دور میں وحی کے آغاز سے ہی فرما دیا تھا اور آپ نے منشائے الٰہی کے مطابق ایمان والوں کا تزکیہ فرمایا۔ تزکیہ بالنفس ہی یہ ہے کہ انسان اپنی خواہشات سے دست بردار ہو جائے اور اللہ اور رسول اللہ کے احکام کو اپنی زندگی کالائحہ عمل بنالے۔ اور اپنی قبر وروح کو صبر، توکل، تقوی اور شکر کا عادی بنائے۔

جب اسلام سرزمین حجاز سے نکل کر دور دراز علاقوں میں پھیل گیا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے تربیت یافتہ صحابہ کو امور نگرانی اور عدالتی ذمہ داریاں سپرد کیں۔ اِس وقت اجتہاد کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اگر لوگوں کو ایسے مسائل کا سامنا ہو جائے جس کے بارے میں قرآن وسنت خاموش ہوں تو انہیں کتاب اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی واضح کہ گئی ہدایات کی روشنی میں حل کے کرنے کی کوشش کی جائے اور حدیث معاذ اجتہاد کے ثبوت میں سے سب سے اہم نص کی صورت میں موجود ہے۔

دین میں جو بات بھی کتاب اور سنت رسول سے بے نیاز ہو کر کی جائے گی وہ محض اپنی رائے ہو سکتی ہے۔ علمائے امت یا ایسے ماہرین علوم شریعت جو اپنی دیانت وثقاہت اور تقوی میں قوی درجہ ہونے کے ساتھ امت کے فقہاء وعلماء کے نمائندہ ہوں۔

ان کا قرآن وحدیث کی روشنی میں کسی مسئلہ پر متفق ہو جانا بھی ایک شرعی دلیل کی بنیاد ہے، جسے اجماع کہا جاتا ہے۔ اسی طرح فکر نو کی تشکیل میں قیاس شریعت اسلامیہ کا چوتھا مصدر رہے لغوی طور پر قیاس سے مراد ماننا یا ناپنا ہے اور فقہائے شریعت کی اصطلاح میں اصل حکم میں پائی جانے والی علت پر منطبق کرنا قیاس ہے۔ جیسا کہ کہا گیا:

"حمل الشی في بعض احکامه بغرب من الشبه"[1]

قاضی بیضاوی متوفی (685ھ) فرماتے ہیں:

"القیاس اثبات مثل حکم المعلوم في معلوم آخر لاشتراکھا في علت الحکم عند المثبت"[2]

(قیاس کسی حکم معلوم کی طرح کا حکم علت حکم میں اشتراک کی وجہ سے کسی دوسرے معلوم میں جاری کرنے کو کہتے ہیں)۔

قیاس کے استدلال قرآن حکیم کی آیات مبارکہ سے کیا جاسکتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾[3]

---

1 الزرکشی، بدرالدین، **البحر المحیط**، (دار الکتب العلمیة، بیروت لبنان) ج7، ص311

2 البیضاوی، قاضی ناصر الدین ابی عبد اللہ، **الابھاج فی شرح المنھاج**، (دار المعرفة، بیروت، لبنان) ج3، ص3

3 المائدہ 90:5

(اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور قسمت معلوم کرنے کے تیر ناپاک شیطانی کام ہی ہیں تو ان سے بچتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ)۔

یہاں اس آیت مبارکہ میں شراب کی علت مستعار ہے۔ اس اب یہ دیکھا جائے گا کہ یہ علت شراب کے علاوہ کسی بھی چیز میں پائی جائے گی اس کو چھوڑا جائے گا اور ان چیزوں سے احتیاط برتی جائے گی۔ اسی طرح اگر ہم نماز جمعہ کے حکم کو سورۃ الجمعہ کی آیت میں دیکھتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں قیاسی استدلال ملتا ہے۔ مثال کے طور پر

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾[1]

(اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کیلئے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ اگر تم جانو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے)۔

اس آیت مبارکہ نے جمعہ کی آذان کے بعد خرید و فروخت کو مکروہ قرار دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے جمع کی آذان کے بعد خرید و فروخت میں مشغول ہونے سے نماز کے چھوٹ جانے یا اس سے غافل ہونے کا خطرہ ہے اب اس حکم پر قیاس کرتے ہوئے یہ واضح ہے کہ یہ علت جہاں کہیں بھی پائی جائے گی اس پر یہی حکم وارد ہوگا۔ مثال کے طور پر کسی بھی مزدور کو کام پر لگائے رکھنا، مقدمات کی سماعت اور کسی بھی قسم کے معاملات طے کرنا وغیرہ۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ﴾[2]

(اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو)۔

مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان تمام علماء کا اس پر اتفاق معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں اس طرف واضح اشارہ ہے کہ قرآن وسنت میں جن مسائل کے بارے میں احکام موجود نہ ہوں ان کو قیاس سے اخذ کرنا چاہیے۔ اصول فقہ اور عربی لغۃ کی کتب میں لفظ اعتبار پر جو قیاس کے ہم معنی ہوتا ہے بہت تفصیل سے بحث موجود ہے۔ اسی طرح، متعدد احادیث صحیحہ میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود بہت ساری جگہوں پر قیاس فرمایا اس کی وضاحت صحیح احادیث کی روشنی میں اختصار کے ساتھ کی جائے گی۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے جس کو امام بخاری نے نقل کیا ہے:

((أنَّ امْرَأَةً مِن جُهَيْنَةَ جاءَتْ إلى النبيِّ صلَّى اللهُ عليه وسلَّمَ، فقالَتْ: إنَّ أُمِّي نَذَرَتْ أنْ تَحُجَّ، فَلَمْ تَحُجَّ حتَّى ماتَتْ؛ أفَأَحُجُّ عَنْها؟ قالَ: نَعَمْ حُجِّي عَنْها؛ أرَأَيْتِ لو كانَ

1 الجمعہ 9:62

2 الحشر 2:59

عَلَى أُمِّكِ دَيْنٌ أَكُنْتِ قاضِيَةً؟ اقْضُوا اللَّهَ؛ فاللَّهُ أحَقُّ بالوَفاءِ))[1]

(عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک عورت نے حج کی نذر مانی، پھر)حج کئے بغیر (مر گئی، اس کا بھائی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا،اور آپ سے اس بارے میں مسئلہ پوچھاتو آپ فرمایا" :بتاؤ اگر تمہاری بہن پر قرض ہوتا تو کیا تم ادا کرتے ؟ "اس نے کہا: ہاں میں ادا کرتا، آپ نے فرمایا" :تو اللہ کا قرض ادا کرو وہ تو اور بھی ادائیگی کا زیادہ مستحق)۔

اس روایت پر اگر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حج کو قرض پر قیاس کیا اور عملا اس کی دلیل پیش کی ہے۔ اسی طرح صحابہ کرام، آئمہ ،فقہاء کے ہاں قیاس کے بے شمار مثالیں ملتیں لیکن موضوع کے پیش نظر یہاں مختصر قیاس کو متعارف کرایا جارہا ہے۔

عمومی طور پر قیاس کے عناصر چار ہیں جو مذکورہ بالا تمام مثالوں سے واضح ہیں۔ ا: اصل (یعنی وہ نص جس پر کسی حکم کو قیاس کیا گیاہو۔ جسے مقس علیہ بھی کہا جاتا ہے)، ب: حکم (یعنی اصل یا بنیاد میں بیان کردہ حکم۔)،ج: فرع (وہ امر جس میں نص موجود نہ ہو اور اسے اصل پر محمول کر کے اس کا حکم معلوم کیا جائے)، د: علت: وہ بنیادی امر جو اصل میں بیان کردہ حکم کا محور بنائے۔ اور جو فرع میں موجود ہے۔[2]

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ نئے پیش آمدہ مسائل پر احکام شرع کی تطبیق کے لیے اس سے ملتے جلتے مسائل کی وجوہات اور مماثلت وجوہات کی بنا پر یکساں مسائل کے احکام نئے پیش آنے والے مسائل میں نافذ کرنا قیاسی عمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ سے آج تک تمام فقہاء دین کے معاملہ میں تمام احکام میں قیاس کا استعمال کرتے رہے ہیں اور اس پر اس کا اجماع ہے کہ قیاس کا انکار کسی کے لیے جائز نہیں۔ یہ چار شریعت کے اولین اور بنیادی مصادر ہیں جس پر امت کا اتفاق ہے۔

فکر اسلامی کے بنیادی عناصر:

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اور اس کی اصل ایمان ہے۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں:

"اسلامی فکر کی ہیت ترکیبی میں ایمان روح رواں کی مانند ہے اسلام کی ہر چیز کی طرح اس کی فکر کی بنیاد بھی ایمان ہے"۔[3]

لفظ ایمان کی لغوی حیثیت کو بیان کرتے ہوئے ابن منظور لکھتے ہیں کہ لفظ ایمان اَمن یَامن ا منًا و

---

1 البخاری، **الجامع الصحیح، کتاب الحج، باب الحج والنذور عن المیت**، رقم الحدیث:1852

2 ندوی، محمد فہیم اختر، **فقہ اسلامی تعارف اور تاریخ** (مکتبہ قاسم العلوم: لاہور،2004)، ص154

3 ناصر، نصیر احمد، ڈاکٹر، **اسلامی ثقافت**، (مکتبہ رحمانیہ اردو بازار، لاہور:1980ء)، ص518

اَمَنًاوَامانۃ سے مصدر ہے اس کا مادہ ا۔م۔ن ہے۔[1] لغت کی رو سے کسی خوف محفوظ ہو جانا، دل کے مطمئن ہو جانے اور انسان کے باخیر وخوبی، خیر وعافیت سے ہمکنار ہونے کو امن کہا جاتا ہے۔ کسی پر ایمان سے مراد اس کی تصدیق کرنا ہے۔ اور اس پر یقین کامل ہونا ہے۔ اسی طرح اصطلاح میں رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے اللہ کے احکام کا زبان اور دل سے اقرار و تصدیق کا نام ایمان ہے۔

اگر فکر کی بنیاد ایمان پر رکھی جائے تو فکر میں استقلال اور استقامت کی قوت پیدا ہوتی ہے اس کے ثمرات یہ حاصل ہوتے ہیں کہ فکر میں آفاقیت اور عالمگیریت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ فکر صرف ذاتی اغراض و مقاصد تک محدود نہیں رہتی بلکہ اس کا مطمہ نظر اخروی زندگی ہو جاتی ہے۔ اور اس حصول کی خاطر انسان اللہ اور اس کی مخلوق کے متعلق متفکر رہتا ہے۔ اسلامی فکر ایک ایمانی فکر ہے۔

قرآن حکیم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ کہیں تو ایمانیات یکجا بیان کرتا ہے اور کہیں الگ الگ۔

اسی مضمون میں کو قرآن حکم کی متعدد آیات میں بیان سے کیا گیا ہے۔ اور پھر تیسری جگہ انبیاء ورسل پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور مومنین کی نشانی بتاتے ہوئے قرآن نے سورۃ البقرہ میں کہا:

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ﴾[2]

(رسول ایمان لایا اس پر جو اس کے رب کے پاس سے اس پر اترا اور ایمان والے، سب نے مانا اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو)۔

اللہ پر ایمان، یوم القیامہ پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، اللہ کی نازل کردہ کتب پر ایمان اور انبیاء ورسل پر ایمان لانا ہی ایمان کی شرائط قرار دیا ہے:

﴿وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ﴾[3]

(اصلی نیک وہ ہے جو اللہ اور قیامت اور فرشتوں اور کتاب اور پیغمبروں پر ایمان لائے)۔

مثال کے طور پر سورہ حم السجدہ میں بیان کیا گیا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾[4]

---

1 الافریقی، **لسان العرب**، ج3، ص85

2 البقرہ 285:2

3 البقرہ 177:2

4 حم السجدہ 30:32

(بیشک جنہوں نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے پھر (اس پر) ثابت قدم رہے ان پر فرشتے اترتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ تم نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت پر خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا)۔

اِس آیت مبارکہ میں صرف اللہ لانے کا ذکر موجود ہے۔ اور اسی پر دنیا و آخرت کی کامیابی کو محصور کیا گیا ہے۔ اسی طرح سورۃ بقرہ میں یوم القیٰمہ کے ذکر کے ساتھ اللہ پر ایمان لانا اور اعمال صالح کا ذکر ہے:

﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾[1]

(جو بھی سچے دل سے اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لے آئیں اور نیک کام کریں تو ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے)

ایمان باللہ

اسلام کے پورے بنیادی اور اعتقادی نظام میں جو سب سے پہلی چیز ہے وہ ایمان باللہ یعنی اللہ پر ایمان لانا ہے۔ باقی جتنے بھی اعتقادات ہیں وہ سب اسی ایک عقیدہ کی فرع ہیں اور جتنے بھی عبادات، تمدنی قوانین اور اخلاقی احکام ہیں وہ سب اسی سے قوت سے حاصل ہوتے ہیں۔

سب ایمانیات کا مصدر اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانا ہے۔ جب کوئی انسان اللہ پر ایمان لاتا ہے تو اس بات کو تسلیم کرتا ہے۔ رسولوں پر ایمان اسی لئے لاتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے نائب اور قاصد ہیں۔ کتب پر ایمان اس لئے لاتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہیں۔ اور یوم قیامت پر ایمان بھی اسی لیے لاتا ہے کہ یہ وہ اللہ کی طرف سے فیصلہ کا دن ہے۔ جو فرائض میں وہ اللہ کے مقرر کردہ ہیں اور جو حقوق ہیں وہ بھی اسی کے طے کردہ ہیں۔ جن چیزوں سے منع کیا گیا یا کرنے کا حکم دیا گیا وہ بھی اس لیے کہ یہ اللہ کے احکام ہیں۔ اگر ایمان باللہ ہے تو سب احکام کی تابعداری لازم و ملزوم ہے۔

اس بات کا خلاصہ یہ ہے کہ جب انسان کائنات کی طرف نگاہ دوڑاتا ہے تو یہ دیکھتا ہے کہ تمام اشیاء اسی کے سامنے جھکی ہوئی ہیں۔ زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے سب اسی کا ہے۔ قرآن حکیم اس بات کو دلیل بناتا ہے:

﴿وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾[2]

(اور اسی کے حضور گردن رکھے ہیں جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہیں)

ایمان بالرسالت

اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا خالق ہے۔ اور وہ اپنے بندوں پر بے حد مہربان ہے انسان کے ساتھ اِس کا رشتہ رحم

---

1 البقرہ 62:2

2 آل عمران 83:3

وکرم اور دنیاو آخرت میں میں انسان کی زندگی کو تمام مضرات سے بچنے کی تلقین کرنا ہے وہ کسی بھی انسان کی گرفت اس وقت کرتا ہے۔ جب وہ اسے اطراف کے انجام آگاہ کر دیتا ہے اس آگاہی وہدایت کے لیے اپنے جن برگزیدہ بندوں کا انتخاب کرتا ہے وہ انبیاء اکرام اجمعین ہوتے ہیں جو تمام نبی نوع انسان تک اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ اللہ تعالی اور اس کے بندے کے درمیان معاملات کا اسلوب یہ ہے کہ انہیں جزاو سزا سے ہمکنار اس وقت کرتا یا دو چار اس وقت کرتا ہے جب انہیں ہدایت اور گمراہی میں فرق سیکھا دیتا ہے۔

اللہ تعالی اور اس کے بندے کے درمیان خوبصورت تعلق کا علم اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اللہ اپنی جانب سے احکام کو کوئی مجموعہ نہ نازل کر دے۔ جس میں وہ ساری تفاصیل موجود ہوں جو وہ اپنے بندے کو سیکھانا چاہتا ہے ایسی کتاب جو تمام اوامر و نہی تفصیل کا مجموعہ ہو۔ اور انسانی معاملات زندگی کی تمام چھوٹی بڑی تفصیل موجود ہو۔ ان سب احکام وضوابط کو جس طرح اللہ اپنے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ یا انسانوں میں سے جس کا انتخاب کرتا ہے۔ تاکہ وحی کے ذریعے سے اس کی تکمیل ہو سکے اس کو رسول کہتے ہیں۔ اور رسالت پر ایمان لانا دین اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّه وَ الْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓىٕكَتِه وَ كُتُبِه وَ رُسُلِه لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِه﴾[1]

(رسول ایمان لایا اس پر جو اس کے رب کے پاس سے اس پر اُترا اور ایمان والے سب نے مانا اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو یہ کہتے ہوئے کہ ہم اس کے کسی رسول پر ایمان لانے میں فرق نہیں کرتے)۔

نبوت و رسالت اللہ تعالی اپنی خاص مرضی و رضا سے اپنے منتخب ہر گزیدہ بندے کو عطا کرتا ہے۔ اگر کوئی گناہوں سے دور ہوتا ہے۔ اور ریاضت و مجاہدہ اور تقوی سے حاصل کرنا چاہے تو یہ ناممکن ہے۔ یہ خاص عطیہ خداوندی ہے اور وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اس کے ذریعہ سے تمام مخلوقات اسے فضیلت بخشتا ہے۔ سورہ الانعام میں ارشاد باری تعالی ہے:

﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَه﴾[2]

(اللہ خوب جانتا ہے جہاں اپنی رسالت رکھے)۔

اللہ کی ذات جمال و جلال کا مظہر ہے۔ اللہ واحد لاشریک ہے اور اسے کی ذات کسی کی محتاج نہیں ہے۔ تمام کائنات کی مخلوقات اسی کی مطیع و تابع ہیں۔ اللہ تعالی نے انسانیت کے فکری شعور کو اجاگر کرنے کے لئے نیکی اور بدی

---

1 البقرۃ 285:2

2 الانعام 124:6

کے فرشتے اس کے ساتھ مقرر کر دیے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۙ o كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۙ o يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ﴾[1]

(اور بے شک تم پر کچھ نگہبان ہیں مُعزز لکھنے والے کہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرو)۔

ڈاکٹر طاہر القادری لکھتے ہیں:

"فرشتے کوئی غر مجرد قوتوں نیک انسانی روحوں یا صفات باری تعالیٰ سے تعبیر نہیں بلکہ یہ جنوں اور انسانوں سے الگ زمین و آسمان پر رہنے والی ایک مستقل نوع کی ایک خوبصورت مخلوق ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات سے فرشتوں کے جس تصور کی تائید ہوتی ہے یہ وہی ہے۔ جس کو جمہور اسلام آج تک مانتے چلے آرہے ہیں"۔[2]

سید ابو الاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

"ملائکہ کی ایک حیثیت یہ بھی ہے کہ اللہ انہی کے ذریعے سے اپنے احکام بھیجتا ہے۔ اور انہی ذریعہ سے اس امر کا اہتمام فرماتا ہے کہ انبیاء کو یہ پیغام ہر آمیزش، ہر التباس، ہر اشتباہ اور ہر خارجی دخل اندازی سے پاک رہ کر پہنچ جائے یہ فرشتے اول تو بجائے خود فرمانبرداری اور نیک فطرت میں ہر قسم کے برے رجحانات اور نفسانی اغراض سے منزہ ہیں اللہ سے ڈرنے والے اور اس کے حکم بے چوں وچرا اطاعت کرنے والے ہیں دوسرے وہ اس قدر طاقت ور ہیں کہ ان کا پیغام رسانی اور نگرانی میں کوئی شیطانی قوت ذرہ برابر بھی خلل نہیں ڈال سکتی"۔[3]

جس طرح تمام رسولوں پر اور نبیوں پر ایمان لانا ایمان کا لازمی جزو قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام نازل ہونے والی کتب پر ایمان لانا بھی ایمان کی شرط قرار دیا گیا ہے اسلام ان تمام کتب کو ماننے کا حکم کا دیتا ہے جو اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔ سورۃ البقرہ میں فرمایا:

﴿وَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ﴾[4]

(اور وہ ایمان لاتے ہیں اس پر جو تمہاری طرف نازل کیا اور جو تم سے پہلے نازل کیا گیا)۔

سورہ آل عمران میں ہے:

﴿قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۪ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ

1 الانفطار 82:10-12

2 القادری، محمد طاہر، ڈاکٹر، **تعلیمات اسلام** (منہاج القرآن پبلیکیشنز 365- ایم ماڈل ٹاؤن لاہور، 2005ء)، ص 108

3 مودودی، سید ابو الاعلیٰ، **اسلامی تہذیب کے اصول مبادی**، (اسلامک پبلیشرز لمیٹڈ: لاہور، 1955ء)، ص 186

4 البقرہ 2:4

وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾[1]

(اور تم یوں کہو کہ ہم اللہ پر اور جو ہمارے اوپر نازل کیا گیا ہے اس پر اور جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا (اس پر بھی ایمان لاتے ہیں نیز) ہم ایمان لانے میں ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کی بارگاہ میں گردن جھکائے ہوئے ہیں)

سورۃ الحدید میں ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾[2]

(بیشک ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور عدل کی ترازو اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں)۔

اسی طرح سورہ المائدہ، احقاف اور القصص میں کتابوں کے نام لے کر ان کی تعریف کی گئی ہے اور ان پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ مثال کے طور پر تورات کو نور ہدایت ضیا امام اور رحمت کہا گیا ہے۔ اسی طرح انجیل کو ہدایت نور اور نصیحت کے الفاظ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ پس یہ بات واضح ہے کہ قرآن حکیم نے جس کتب کا ذکر واضح طور پر کہ ہے ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔ قرآنی تعلیمات کے مطابق ایسی کوئی قوم نہیں ہے جس کی طرف کوئی رسول کوئی کتاب لے کر نہ آیا ہو۔

عبادات

ارشاد ربانی ہے:

﴿اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا﴾[3]

(آسمانوں اور زمین میں جتنے ہیں سب رحمٰن کے حضور بندے ہو کر حاضر ہوں گے)۔

اللہ کی عبادت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ، کہ انسان تمام معاملات میں ان احکام و فرامین کے سامنے جھکا کے اپنے آپ کو جو اللہ تعالیٰ نے کتاب مبیں میں واضح کر دیئے ہیں اور جن کی وضاحت نبی کریم ﷺ نے کی ہے۔ یہاں عبادت کا لفظ ہمہ گیر ہے جس میں نماز، روزہ، زکوۃ، حج میں اللہ کے سامنے جھکنا شامل ہے تو لین دین، خرید و فروخت، تجارت، زراعت اور مختلف معاملات میں اللہ کی رضا کو پیش رکھنا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح سورۃ الشعراء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا مکالمہ اس طرح بیان ہوا ہے:

---

1 آل عمران 84:3

2 الحدید 25:57

3 مریم 93:19

﴿وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ﴾[1]

(اور یہ کون سی نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان جتا رہا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا کر رکھا)۔

اسی طرح نماز کی ہر رکعت میں اللہ تعالی نے مسلمانوں کو یہ ترغیب دی:

﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ؕ﴾[2]

(ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں)۔

یعنی اے اللہ ہم آپ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی تابعداری نہیں کرتے اور نہ ہی تیرے سوا کسی سے مدد طلب کرتے ہیں۔ ہر اس شخص کے لیے آپ آپ معاون و مددگار ہیں جو آپ سے مدد مانگتا ہے کو صرف آپ کی ذات عبادت اور تابعداری کی حقدار ہے۔ اللہ کی عبادت کرنے کا مطلب یہ ہے انسان اپنے تمام معاملات اور احکام کی پیروی میں ان احکام کے سامنے جھک جائے جس کی ہدایت کتاب کے ذریعے سے دی گئی ہے۔ اس مفہوم میں عبادت کا لفظ ہمہ گیری رکھتا ہے۔ اس میں عقائد اور عبادات مثلاً نماز، روزہ، زکوۃ، اور حج میں اللہ کے سامنے جھکنا شامل ہے۔

اسی طرح دیگر معاملات میں جن کا تعلق خواہ شادی بیاہ سے ہو، خواہ قرض اور لین دین سے ہو، اللہ کی مرضی کو مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر **نماز** بندے اور اللہ کے درمیان **مسلسل تعلق** کا نام ہے۔ اس میں بندہ اپنے رب کے لئے جذبہ عبودیت کا اظہار کرتا ہے۔

روزہ انسان کے اندر تزکیہ نفس تربیت اور اللہ اور اس کے بندے کے درمیان گفتگو کی ایک ٹریننگ ہے۔ یہ انسانی کمزوریوں کو اس کے سامنے رکھتا ہے۔ اس کی پسند اور ناپسند کو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کی طرف موڑنا ہے۔ اس دوران میں اس کی تربیت ہوتی ہے۔ زکوۃ جس کا مقصد اس بات کی نشو نما کرنا ہے کہ مومنین آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رحیم ہیں۔ تمام مسلمان اخوت و محبت کے رشتے سے ہی خوش نصیب ہیں زکاۃ کی ادائیگی دلوں کو کینہ حسد اور بغض سے پاک کرتی ہے۔

اسی طرح حج انسانی دل اور گروہ کے اجتماع کا نام ہے۔ جس میں بیت اللہ کی زیارت کا جذبہ نمایاں ہوتا ہے۔ اس میں دل و دماغ اللہ کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ اس میں مسلمان ایک خاص ترتیب کے تحت اللہ کا ذکر بلند کرتے ہیں۔ اسے یاد کرتے ہیں۔ یہاں مختلف رنگ و نسل کے لوگ ایک اللہ کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ یہ تمام عبادات ایس ایک عقیدے سے جڑی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

عبادات کے انسانی زندگی میں انفرادی اور اجتماعی دونوں اثرات بھرپور واضح ہوتے ہیں۔ ان سے انسان

---

1 الشعراء 22:26

2 الفاتحہ 4:1

نفس کی پاکیزگی حاصل کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝﴾[1]

(بے شک مراد کو پہنچا جو ستھرا ہوا۔ اور اپنے رب کا نام لے کر نماز پڑھی)

قلبی اطمینان اور ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے۔ اللہ کا فرمان ہے:

﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ۝﴾[2]

(سن لو اللہ کی یاد ہی میں دلوں کا چین ہے)

اسی بنیاد پر معاشرے میں ربط پیدا ہوتا ہے۔ وہ تو مساوات کی فضا قائم ہوتی ہے مومنین کے درمیان باہمی تعاون کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

اخلاق و معاملہ

اخلاق سے مراد اچھی خصلت اچھے اور عمدہ سلوک ہیں۔ اس سے مراد پسندیدہ عادات اور قلبی رجحان ہے۔ امام غزالی لکھتے ہیں:

"الخلق عباره عن هىۃ النفس راسخۃ لقدر عنها الافعال بسهولۃ ویسر عن حاجۃ الی فکر و روىۃ فان کانت الهىۃ بحیثیت لقدر عنها الافعال الجمیلۃ عقلا و شرعاً بسهولۃ سمیت الهئیۃ خلقا حسنا فان کان کانت الهئیۃ التی هی مصدر انک خلقاشئیا"[3]

(اخلاق وہ ہیئت راسخہ ہے نفس مین جس سے افعال بآسانی، بلافکر و تامل صادر ہوں بس اگر یہ ہے ہیت ایسی ہے یہ سے ایسے افعال صادر ہو جو عقل اور شرع نام دہ ہیں تو اس ہیئت کا نام خلق حق کے خوب ہے اور اگر اس سے برے افعال صادر ہو تو اس کا نام خلق بد ہے)۔

اللہ تعالی نے اپنی پیدا کردہ مخلوق کی بہتری اور بھلائی کے لئے اور اس کی خوش حالی کے لئے کچھ حدود مقرر فرما فرمائی ہیں ان حدود میں رہ کر اسلامی ضابطہ حیات کے عائد کردہ فرائض کی ادائیگی اخلاق کہلاتی ہیں کیونکہ انسان کے اچھے ہونے کے لئے ان کا اچھا ہونا بے حد ضروری ہے۔ ایمانیات عبادات و معاملات اور اخلاق ایک دوسرے کا لازمی جزو ہیں۔ اسی طرح علامہ سید سلمان ندوی حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تشریح کرتے ہوئے سیرت النبی میں لکھتے ہیں:

---

1 الاعلیٰ 87:14-15

2 الرعد 13:28

3 الغزالی، **احیاء العلوم**، ج3، ص80

اس کا تعلق اگر صرف ذہنی قوت اور قلبی حالات سے ہے تو اس کا نام عقیدہ ہے اور اگر ااس کا تعلق قلبی حالات کے ساتھ ہمارے جسم وجان اور مال وجائیداد سے بھی ہے تو اس کا نام عبادت ہے۔ ہم انسانوں اور انسانوں میں یا اور دوسری مخلوقات میں جو علاقہ اور رابطہ ہے اس کی حیثیت سے جو احکام ہم پر عائد ہوتے ہیں اگر ان کی حیثیت محض قانون کی ہے تو اس کا نام معاملہ ہے۔ اور اگر ان کی حیثیت قانون کی نہیں بلکہ روحانی نصیحتوں اور ہدایت کی ہے تو اس کا نام اخلاق ہے۔[1]

خلاصہ بحث

اس تمام بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے "فکر اسلامی" تمام بنی نوع انسانی کے لیے اللہ تعالی کی رحمت کا مظہر ہے۔ تا کہ انسان تمام شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں کردار ادا کر سکے یہی امر اسلامی فکر کی ضرورت واہمیت کو واضح کرتا ہے۔ تا کہ انسانی زندگی اسلامی اقدار اور معیارات ومقاصد سے ہم اہنگ ہو سکے۔

فکر اسلامی سے مراد انسان کا وہ نظریہ حیات ہے جو اللہ کے عطا کردہ علم کی روشنی میں انسانی تعقل کی بنیاد پر ارتقاء پذیر ہو کر مکمل ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی دنیوی و اخروی زندگی میں کامیابی کے اصول، الہامی کتب اور پیغمبران کرام کے ذریعے انسانوں کو عطا کئے اور آخری کتاب قرآن حکیم اور نبی محترم حضرت محمد ﷺ کے ذریعے اس نظام فکر کی تکمیل کی۔ یہ نظریہ حیات علم وحی کی روشنی میں اور پیغمبر رسول ﷺ اللہ کے اسوہ حسنہ کی صورت میں دنیائے عالم میں وقوع پذیر ہوا۔ جو انسانی زندگی کے عقائد، اخلاق، عبادات اور معاملات کی واضح عکاس ہے، گو کہ یہ تمام عناصر یعنی اخلاق، عبادات، معاملات اور ایمانیات اپنے قابل نفاذ یا نا قابلِ نفاذ ہونے کی بنا پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن ایک مسلمان اپنے رب سے کئے گئے وعدے کے مطابق اللہ اور اس کے رسول کی۔ اطاعت کا پابند ہے اسی کی فرمابرداری میں کامیابی کی ضمانت ہے ہے اور یہی عناصر انسانی فکر کی تطہیر کی ضمانت ہیں اور ایسی عظیم الشان فکر کا نام ہی فکر اسلامی ہے۔

---

1 ندوی، سید سلیمان، مولانا، **سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم**، ص314

فصل دوم:

بر صغیر میں اسلام کی آمد اور فکر اسلامی کی ترویج

بر صغیر پاک وہند کے لوگ سب سے پہلے عربوں سے کس طرح متعارف ہوئے اور انہوں نے اہل ہند سے کب اور کیوں تعلقات استوار کرنا شروع کئے۔ اس کا ایک خاص پس منظر اور خاص وجہ ہے۔ کیونکہ زمانہ قدیم میں ایران کو ایک مستحکم اور مضبوط طاقت کی حیثیت حاصل تھی۔ اور عرب کے چند مختلف قبائل پر ایرانی حکمرانوں کا قبضہ تھا۔ موجودہ سندھ اور بلوچستان کے علاقائی حکمران ایرانی حکومت کے زیر اثر تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ بہت سارے ہندی باشندے ایرانی فوج میں شمولیت اختیار کر چکے تھے اور انہوں نے عرب میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان میں سے بہت سارے لوگ ایسے بھی تھے۔ جو ہندوستانی مصنوعات عرب کے بعض شہروں اور قبائل میں لے جاتے تھے۔ اور انہیں فروخت کرتے تھے۔ جس سے دونوں خطوں یعنی عرب اور ہند کے درمیان روابط اور تجارت کی ایک صورت پیدا ہو گئی تھی۔ جو آہستہ آہستہ بڑھتی چلی گئی اور اس میں مزید مضبوطی پیدا ہوئی۔

اہل عرب کے بر صغیر سے تعلقات عرب تجار

بر صغیر پاک وہند کے لوگ سب سے پہلے عربوں سے کس طرح متعارف ہوئے اور انہوں نے اہل ہند سے کب اور کیوں تعلقات استوار کرنا شروع کئے۔ اس کا ایک خاص پس منظر اور خاص وجہ ہے۔ کیونکہ زمانہ قدیم میں ایران کو ایک مستحکم اور مضبوط طاقت کی حیثیت حاصل تھی۔ اور عرب کے چند مختلف قبائل پر ایرانی حکمرانوں کا قبضہ تھا۔ موجودہ سندھ اور بلوچستان کے علاقائی حکمران ایرانی حکومت کے زیر اثر تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ بہت سارے ہندی باشندے ایرانی فوج میں شمولیت اختیار کر چکے تھے اور انہوں نے عرب میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان میں سے بہت سارے لوگ ایسے بھی تھے۔ جو ہندوستانی مصنوعات عرب کے بعض شہروں اور قبائل میں لے جاتے تھے۔ اور انہیں فروخت کرتے تھے۔ جس سے دونوں خطوں یعنی عرب اور ہند کے درمیان روابط اور تجارت کی ایک صورت پیدا ہو گئی تھی۔ جو آہستہ آہستہ بڑھتی چلی گئی اور اس میں مزید مضبوطی پیدا ہوئی۔

بر صغیر کا ایک گروہ جو زمانہ قدیم سے عرب میں موجود تھا جسے عربوں کی عام زبان میں "مید" کہا جاتا ہے۔ سب سے پہلے یہ ایرانی فوج میں بھرتی ہو کر بر صغیر سے ایران پہنچنے اور پھر وہاں سے عرب کے دیگر شہروں میں منتقل ہوئے۔ عرب ان کو مید اس لئے کہتے تھے۔ عرب کے قدیم جغرافیہ نویس ابن خر دابہ لکھتے ہیں:

"والکفار فی حدود بلاد السند انما ھم البرہ و قوم یعرفون با لمیدہ"[1]

---

1 ابن خر دابہ، ابن القاسم عبید اللہ بن عبد اللہ، **المسالک ولممالک**، (دار الکتب العالمیہ بغداد، 1929ء)، ص167

(بلاد سندھ میں جو کافر وکش ہیں۔ وہ بدو ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں۔ جنہیں مید کہا جاتا ہے)۔

مختلف کتابوں میں بکھری ہوئی معلومات سے پتہ چلتا ہے۔ گجرات، سندھ، راجستان علاقہ ملتان اور کاٹھیاواڑ میں اس گروہ سے تعلق رکھنے والے اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ جاٹ یا جٹ، جنہیں عربوں نے "زط" لکھا ہے، بر صغیر کی وہ قوم اور گروہ ہے جس کے بہت سارے افراد زمانہ قدیم سے غرب میں آباد تھے۔ یہ لوگ در حقیقت سندھ اور پنجاب اور بعض مورخین کے نزدیک بلوچستان میں موجود تھے۔ لسان العرب میں ان کے بارے میں، ابن منظور لکھتے ہیں:

"الزط جیل اسود من السند وقیل الزط اعراب جت بالھندیہ وھو جیل من اھل الھند وھم جنس من السودان والھنود"[1]

(یعنی زط سندھ کے سیاہ رنگ کے لوگ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ زط ہندی لفظ جٹ کا معرب ہے۔ اور یہ لوگ اہل ہند سے ہیں جن کے رنگ سیاہی مائل اور ہندوستانیوں کی جنس سے تعلق رکھتے سے ہیں)۔

بر صغیر کے یہ زط یا جٹ عرب کیسے گئے اور پھر عرب کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے استوار ہوئے، اس سوال کے جواب میں قاضی اطہر مبارک پوری لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے جٹ عرب میں مختلف طریقوں سے پہنچے تھے۔ ان میں کچھ تو ابہ (بصرہ) سے عمان اور بحرین تک کے ساحلی علاقہ میں آباد ہوئے اور مویشی اور بھیڑ بکری پالنے لگے اور کچھ مستقل طور پر ساحلی شہروں اور دیہاتوں میں آباد ہو گئے اور وہاں کے مختلف مختلف بلاد و قصبات میں آباد ہوئے اور پھر ایران سے عرب پہنچے اور غرب کے کئی علاقوں میں سکونت اختیار کی"۔[2]

جاٹوں اور مید کے علاوہ بر صغیر کا ایک اور گروہ یا قبیلہ جو قدیم عرب میں آباد تھا۔ جس کی عادات و خصائل سے وہاں کے لوگ متعارف تھے اسے سابجہ کہا جاتا تھا۔ بلاذری نے فتوح البلدان میں اور علامہ ابن خلدون نے اپنی تاریخ میں اس گروہ کو سیانجہ لکھا ہے۔ لیکن ابن درید نے جمرۃ اللغۃ میں اور ابن منظور افریقی نے لسان العرب میں سابجہ (با) کے ساتھ تحریر کیا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سابجہ سندھ اور ہند کے مضبوط جسم و خان کے مالک لوگ تھے۔ بحری سفر میں مسافروں اور سامان تجارت کی حفاظت کرتے تھے۔ اور یہ کام انہوں نے اپنے لیے بطور پیشہ اختیار کیا تھا۔ جس کا معاوضہ وہ جہاز کے مالکان سے لیتے تھے۔ اور دوران سفر میں مسافروں کی حفاظت پر معمور رہتے تھے۔ بر صغیر کے یہ لوگ جنہیں عرب سابجۃ کہتے تھے۔ یہ بحرین اور عرب کے ساحلی علاقوں میں آباد تھے۔

---

1 الافریقی، ابن منظور، **لسان العرب**، ج2، ص308

2 مبارکپوری، قاضی اطہر، **عرب وہند عہد رسالت میں**، (ندوۃ المصنفین: دہلی، 1962ء)، ص64-63

برصغیر میں اسلام کی ابتدائی کرنیں

حضرت ابو بکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئے اور ان میں بہت سے لوگوں نے بصیرہ میں سکونت سے اختیار کی۔ برصغیر کے جن لوگوں نے عرب میں جاکر سکونت اختیار کر لی تھی ان میں سے ایک گروہ کا نام "اساورہ" سے سوم ہے۔[1]

اساورہ برصغیر کا وہ گروہ تھا جسے عرب میں عزت واحترام کی نگاہ دیکھا جاتا تھا اور یہ لوگ وہاں بڑی عیش و آرام کی زندگی گزارتے تھے۔ تاریخ کی متعدد کتب میں ان کا ذکر موجود ہے اور انہوں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں اسلام قبول کیا۔

برصغیر سے عربوں کے روابط اور تعلقات زمانہ قدیم سے چلے آرہے تھے۔ اور ان کا دائرہ کافی وسیع تھا. ان مراسم میں تجارت کو خاص طور پر اہمیت حاصل رہی تھی۔ ہند اور سندھ کے مختلف علاقوں سے بہت ساری چیزین بلاد عرب میں جاتی تھیں. اور فروخت ہوتی تھیں۔ ان میں ناریل، لونگ، کالی مرچ، سندھی کپڑے، زنجبیل، عود، سندھی مرغی، تلواریں، نباتاتی کپڑے، اور نیزے وغیرہ شامل تھے۔ اسلام کے عروج اور ایرانیوں کے آخری دور میں خلیج فارس کی راہ سے ہندوستانی تجارت کا سب سے بڑا مرکز عراق کی بندرگاہ "ابلہ" تھی۔ جسے 14ھ میں صحابہ اکرام نے فتح کیا۔ سید سلمان ندوی نے اُبلہ کے حالات میں لکھا ہے:

> "عربوں کے سنہ 14ھ میں عراق پر قبضہ کرنے سے پہلے ایرانیوں کے زمانہ میں ہندوستان کے لیے خلیج فارس کا سب بڑا بندرگاہ ابلہ تھا۔ جو بصرہ کے قریب واقع تھا اہل عرب ابلہ کو ہندوستان کا ایک ٹکڑا سمجھتے تھے چین اور ہندوستان سے آنے والے جہاز بس ٹھہرتے تھے۔ اور یہیں سے روانہ ہوتے تھے"۔ ہندوستان کے بیوپار اور پیداوار کو عربوں کی نگاہیں کیا اہمیت حاصل تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے۔ حضرت عمر فاروق نے ایک عرب سیاح سے پوچھا کہ ہندوستان کے متعلق تمہاری کیارائے ہے؟ تو اس نے تین مختص فقروں میں جواب دیا: بحرها در وجبلها یا قوت و شجرها عطر۔ اس کے دریاموتی اس کے پہاڑ یاقوت اور اس کے درخت عطر ہیں"۔[2]

پہلی صدی ہجری کے آخر میں سندھ پر عربوں کے قبضہ ہو جانے کے سبب ہندوستان کی آمد ورفت کا مرکز بن گیا۔ اسی طرح صحارا اور ظفار کو سمندری تجارت کے مراکز کی حیثیت حاصل تھی۔ اور یہاں ہمیشہ برصغیر کے تاجروں کی آمد ورفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس میں ضمن میں فجر الاسلام کے الفاظ درج ذیل ہیں:

((وفی شرقی حضرموت ظفار وھی من قدیم التوابل والطیبات واجود المابد ولا یزال

---

1 مبارکپوری، قاضی اطہر، **عرب وہند عہد رسالت میں**، ص 91

2 ندوی، سید سلیمان، **عرب وہند کے تعلقات**، (دارالمصنفین، اعظم گڑھ، 1974ء)، ص 181

الی الیوم بر سل الی الھند))[1]

(حضر موت کے مشرق میں ظفار قدیم دور سے گرم مسالوں اور خوشبوؤں کی منڈی ہے اب بھی یہاں سے ہندوستان مال بھیجا جاتا ہے)

یہ بازار قدیم زمانہ سے گرم مسالوں، خوشبوؤں کی منڈی تھا۔ ایک بڑا بازار حار جو عرب کا بڑا تجارتی مرکز تھا۔

ایک مصری مورخ لکھتا ہے:

"کانت مکة معطا لاصحاب القوافل الانیہ من جنوب العرب تعمل لصنائع الھند والیمن الی الشام و مصر ینزلون بھا و سیفون من بئر شخصیرہ بھا تسمی بئر زمزم و یا خذون منھا جاحبھم جلھم من الماء"[2]

(جنوبی عرب سے آنے والے قافلوں کی ایک منزل مکہ مکرمہ تھی۔ یہ قافلہ ہندوستان اور یمن کا تجارتی سامان شام اور مصر کو لے کر جاتے تھے۔ اس سفر میں یہ لوگ مکہ مکرمہ میں قیام کرتے تھے۔ اور وہاں کے مشہور کنوئیں زم زم سے سراب ہوتے تھے۔ اور اگلے سفر کے لئے بقدر ضرورت زمزم کا پانی ساتھ لے جاتے تھے)

اس کے علاوہ عکاظ میں برصغیر کے مختلف علاقوں اور شہروں کی مصنوعات فروخت ہوتی تھیں۔ جنھیں لوگ بڑے شوق خریدتے تھے۔ نیز بحرین کے علاقہ میں دار بن نام کی ایک مشہور بندرگاہ تھی جہاں کا ہندوستانی مشک سارے عرب میں مشہور تھا۔ عربی ادبیات اور اشعار میں دارین اور داری کے نام سے اس کا تذکرہ ملتا ہے۔[3]

ان تمام اقتباسات اور بحث جو مفصل طور پر کی گئی اس سے یہ واضح ہوتا عربوں کا برصغیر اور برصغیر کے باشندوں سے گہری واقفیت ہمیشہ سے رہی ہے۔ جو بعد میں اسلام کی روشنی کے پھیلاؤ میں مدد و معاون ثابت ہوئی اور آگے جا کر ان تمام روابط نے نمایاں کردار ادا کیا۔

مسلمان فاتحین کا کردار

ویسے تو ہندوستان اسلام کی روشنی سے پہلی صدی ہجری سے ہی منور ہو چکا تھا۔ یہ سرزمین صحابہ کرام کے بابرکت قدموں سے بھی محروم نہ رہی تھی۔ لیکن اس آفتاب کی پہلی کرنیں ساحلی علاقوں سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ کیوں کہ عرب تاجر اور جہاز ران مغربی ساحل سے گزر کر سیلون اور جزائر شرق الہند کا رخ کرتے تھے۔ ملک کے اندرونی علاقوں میں کم آئے۔

---

1 المصری، احمد امین، **فجر الاسلام**، (دار الکتب العربی بیروت،) ج 1، ص 13

2 احمد حسن الزیات، **المجمل فی تاریخ الادب العربی** (مطبع امیریہ، قاہرہ، مصر، 1999ء)، ص 27

3 الافریقی، **لسان العرب**، ص 234

شمالی خطے کے حصے ایسے فاتح اور کشور کشا آئے جو ابھی خود دین اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے تھے۔ مغل فاتح اور ترک بھی اس وقت ایمان لائے جب تہذیبی مراکز میں انحطاط رونما ہو چکا تھا۔ ان کی فوج میں بڑی تعداد نو مسلموں کی تھی اور یہ عام طور پر یہ لوگ اسلام کے قانون جنگ سے ناواقف تھے۔ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے ان کی حالت کافی خراب تھی۔ محمود غزنوی سے پہلے ان کے ہاں مدارس کا رواج نہ تھا۔

یہی وجہ ہے کہ درہ خیبر سے آنے والے لوگوں کی حالت اسلامی تعلیمات کے حوالے سے کافی ناقص تھی۔ ملک گیری اور جنگی لحاظ سے ان بادشاہوں اور کشور کشاؤں کے کارنامے خواہ کتنی ہی قدر و قیمت کے حامل کیوں نہ ہوں۔ مگر اسلامی تعلیمات کے حوالے سے کوئی خاص اہمیت کے حامل نہ تھے۔ مختصر یہ کہ اس ملک کے بڑے خطہ کے حصے میں ایسے پیام بر آئے جو خود صحیح طور پر اسلامی تعلیمات سے واقفیت نہ رکھتے تھے۔ اور جو واقفیت تھی اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق کم میسر ہوئی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جو دین ایک نظام زندگی، عقیدہ اور ہمہ گیری کی حیثیت سے تمام شعبہ ہائے زندگی پر غالب ہونے کے لیے آیا تھا۔ ہندوستان پہنچ کر جاہلیت اور شرک کے انبار تلے دب گیا۔ حجاز سے جو صاف شفاف توحید کا چشمہ رواں دواں ہوا تھا، گنگا اور جمنا کی آمیزش نے اسے گدلا کر دیا۔ اور نظام زندگی جاہلیت کے طور طریقوں سے بری طرح مسخ ہوا۔ اس سر زمین پر اسلام کے بڑے احسانات ہیں لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے ساتھ بڑے ظلم بھی اسی سر زمین پر ہوئے۔

اگر یہ بات دیکھی جائے کہ باہر سے آنے والے مسلمانوں اور یہاں اسلام قبول کرنے والوں نے جتنا بھی اسلام کا علم پھیلایا اس کی بدولت یہاں کی تہذیب و ثقافت اور اخلاق و تمدن میں بڑی اصلاحات رونما ہوئیں۔ تو اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کہ جو اثرات بیرونی مسلمانوں کے قبول کیے اور جو اثرات ملکی مسلمانوں میں موجود رہے انہوں نے اسلامی نظام زندگی کے اصل چہرہ کو مسخ کیا۔ یہاں تک کہ عقائد، نظریات اور تصورات میں غلط قسم کی آمیزشیں ہوئیں۔ یہ وہ خرابیاں ہیں جس سے گزشتہ زمانوں میں ہر دور کے مصلحین نے محسوس کیا اور اسے دور کرنے کی کوششوں میں لگے رہے۔

برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی کرنیں پہلی صدی ہجری میں ہی جگمگانے لگی تھیں۔ اسلام کا پیغام بخارا اور سمرقند کی فتوحات کے بعد 96ہجری میں اسلامی لشکر چین میں داخل ہوا۔ لیکن چین کے دارالخلافہ کوشیان میں اسلام کا پیغام حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں پہنچ چکا تھا۔ علامہ ابن جریر طبری کے مطابق:

"فتح قتيبة بن مسلم كاشغر من الارض الصين"[1]

---

1 الطبری، ابی جعفر محمد بن جریر، **تاریخ الامم والملوک** (دار الکتب العلمیہ، بیروت: 2001ء) ج4، ص30

(قتیبہ بن مسلم نے چین کی سرزمین سے کاشغر کا علاقہ فتح کر لیا تھا۔)

تاریخ اسلام کے دو مشہور مورخین علامہ ابن خلدون اور امام ابن جوزی کے مطابق اسلامی معرکوں کے اس سلسلہ کو محمد بن قاسم نے فتح سے ہمکنار کیا جس کے بعد یہاں ایک باقاعدہ اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا ان سب فتوحات کا دورانیہ 92 ہجری تا 93 ہجری ہے۔ ابن جوزی کے بقول:

"فتح محمد بن القاسم الثقفی ارض الھند"[1]

(محمد بن قاسم الثقفی نے سرزمین ہند کو فتح کیا۔)

قاضی جاوید احمد لکھتے ہیں:

"برصغیر میں اہل اسلام کی آمد ایسے زمانہ میں شروع ہوئی جب کہ مسلم راسخ الاعتقادی کی تشکیل ابتدائی مراحل میں تھی۔ برصغیر کے ساحلی علاقوں میں چند مسلمان تجار کے قیام اور بلوچستان کے علاقوں میں ابتدائی جھڑپوں کے بعد اہل ہند اور مسلمان عربوں کے مابین اولین باضابطہ تعلق حجاج بن یوسف کے سپہ سالار "محمد بن قاسم" اور سندھ کے مقامی حکمران راجہ داہر کے لشکری تصادم کے حوالے سے قائم ہوا۔ یہ 711 عیسوی کا واقعہ ہے اور مقامی قوتوں کو شکست ہوئی"۔[2]

یہ بات واضح ہے کہ برصغیر یعنی ہندوستان میں جسے قدیم فارسی اور عربی زبان میں ہند اور بعد ازاں برصغیر کہا جانے لگا۔ عرب اور وہاں کے باشندگان کے ساتھ برصغیر کا تعلق کافی پرانا تھا۔ جس کی وجہ سے انہیں اسلام اور اس کی تعلیمات سے شناساں ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ یہ اولین دور تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوت ملی تو اس وقت عرب کے اردگرد رومی، ایرانی اور ہندی لوگ موجود تھے۔[3]

محمود بنگلوری لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں اسلام کا آغاز ابتداً جنوبی ہندوستان میں آنے والے صحابہ کرام سے ہوا۔ اس کے بعد سندھ میں عربوں کی فتح کے بعد مزید اسلام پھیلا اور تیسرے مرحلہ میں ترکوں کی فتح کے بعد شمالی ہندوستان میں اسلام مزید پھیلا یہ تین آراء برصغیر کے متعلق اسلام کے آغاز کے حوالے سے پائی جاتی ہیں"۔[4]

فاتحین کے ذریعے تاجروں کے ذریعہ سے اور قوی رائے یہ ہے کہ برصغیر میں اسلام اہل تصوف کے ذریعہ سے پھیلا اور یہاں کے رہنے والے اس سے روشناس ہوئے۔

ہندوستان میں پہلا بادشاہ ہونے کا اعزاز شہاب الدین غوری کے آزاد کردہ غلام قطب الدین

---

1 ابن جوزی، **المنتظم** (دارالکتب العلمیہ، بیروت: طبع ثانیہ، 1995ء) ج6، ص317

2 جاوید احمد، قاضی، **برصغیر میں فکر اسلامی** (پروگریسو بک ڈپو، لاہور) ص76

3 بھٹی، اسحاق، **برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش** (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور: 2004ء) ص165

4 بنگلوری، محمود، **تاریخ جنوبی ہند** (ناشر ترقی اردو، نئی دہلی: 1947ء) ص57

ایبک کو حاصل ہے۔ تاریخ یہ گواہی دیتی ہے کہ محمود غزنوی یہاں مکین ہونے نہیں آئے تھے اور نہ ہی ان کا مقصد اس خطہ کو آباد کرنا تھا۔ البتہ قطب الدین ایبک جو اپنے مالک شہاب الدین کے ہر اول دستہ تھا کا امیر تھا۔ جب یہاں آیا تو یہاں کا ہو کر رہ گیا۔

قطب الدین ایبک سے سلطنت دہلی کا آغاز

قطب الدین ایبک تاریخ میں ان تمام بزرگ اور برگزیدہ بادشاہوں میں ممتاز ہے، جن کی وجہ سے اس زمین کے خوشحالی پائی وہ عام مسلمانوں کے لیے بھی اور اسلام لئے بہت فائدہ مند ثابت ہوئے۔ شہاب الدین غوری کی نظر انتخاب بھی اسی غلام پر پڑی۔[1]ہندوستان پر حملوں میں غوری سپاہ کا امیر بنا اور پھر اس نے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ دہلی کو اپنا پایہ تخت بنایا اور یہاں شرافت پاکساری اور عدل وانصاف کا سکہ رائج ہوا۔

رشد اختر ندوی لکھتے ہیں:

"قطب الدین ہندوستان میں اسلام کا پہلا مبلغ ہے۔ محمود غزنوی اور اس کے آقا محمد غوری یہاں آئے اور تلواریں بجاتے ہوئے واپس چلے گئے مگر یہ قطب الدین یہاں رہا محبت وشفقت اور نیکی شرافت کا دین چل کر دہلی میرٹھ، اجمیر اور لاہور میں ہندو رعایا کو اسلام سے نہ صرف متعارف کرایا بلکہ اسلام سے ان کی اجنبیت کو دور بھی کیا"۔[2]

قطب الدین ایک ایک سچے مسلمان اور ہونہار امیر تھے۔ انہوں نے ہندوستانی معاشرہ میں عدل، انصاف، سخاوت اور فرض شناسی کو متعارف کروایا۔ قطب الدین ایبک کی طرح اس کا جانشین سلطان الدین التمش بھی ایک غلام تھا۔ جسے ایبک نے ایک لاکھ کے عوض خریدا تھا۔ تو ایک وجیہ نوجوان تھا قطب الدین نے اس کو عربی اور فارسی کا ماہر بنایا۔

طبقات ناصری میں ہے کہ: وہ اتنا نیکو کار خدا ترس اور صاحب تقویٰ تھا یہ اس کی اکثر رعایا اسے ولی اللہ سمجھتی تھی۔ وہ رات کا زیادہ حصہ عبادت میں گزارتا تھا خیرات وصدقات سے بڑی دلچسپی تھی۔ رعایا کے ساتھ عدل وانصاف کرتا تھا۔ اس نے اپنے محل میں سنگ مرمر کے تیر نصب کرائے اگر کسی کو ظلم وزیادتی کا سامنا ہو تو وہ ان کے سر پر لگی گھنٹیوں کو بجا کر بادشاہ کو اپنے حال سے آگاہ کر سکتا تھا۔[3]

خزینۃ الاصفیاء کے مولف کا بیان ہے:

"باد شاہ رحمدل و عادل و سلطان کامل و مکمل از خلفا سے نا مد روم یدان با

---

1 محمد قاسم، فرشتہ، **تاریخ فرشتہ**، (مکتبہ ملت دیوبند) ج1، ص6

2 ندوی، رشید اختر، **مسلمان حکمران**، ص445

3 ابو عمرو منہاج الدین عثمان، **طبقات ناصری**، مترجم ڈاکٹر محمد عبد اللہ چغتائی، (کتب خانہ نورس سٹریٹ اردو، لاہور) س۔ن، ج2، ص61

وقار خواجه قطب الدین بختیار است، و از محبوبان و نظر منظوران خواجه معین الدین سنجری بود و کمال اعتقاد بخدمت اهل چشت نیک سرشت پیدا کرد، اگرچه بظاهر تعلق بادشاه داشت لیکن از دل فقیر و حقیر دوست بود کم خوردی وکم خفتی وشبهائے دراز بسیار بودے....."[1]

(التمش عادل بادشاہ تھاوہ خواجہ قطب الدین بختیار اور خواجہ معین الدین سنجری جو اہل چشت کے نیک نام تھے ان کا ان کا منظور نظر تھا۔ اور وہ بادشاہ وقت تھا۔ لیکن دل سے غنی، فقیر دوست کم کھانے کم سونے اور راتوں کو عبادت میں مشغول رہنے والا آدمی تھا۔)

سلطان التمش نے کئی عظیم الشان مساجد کو تعمیر کروایا۔ اور مدارس کی تعمیر وترقی پر مامور رہا۔[2] بعد ازیں، غیاث الدین بلبن جانشین ہوا جو دراصل البیروی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ بلبن میں دیانت بھی تھی، اخلاص تھی تھا اور مستعدی بھی انہی فضائل حسنہ کے درپھر وہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔[3] بلبن اپنی محبت اور بل بوتے پر ترقی کرتے ہوئے پنجاب کا شاہی سپہ سالار بن گیا۔ سلطان بلبن نے سلطنت استحکام، نظم وضبط اور عوامی اصلاحات کے لئے بڑا کام کیا۔۔۔ اور ہندوستان میں ایک مرکزی حکومت قائم کی۔ اس کی بزرگی کا چرچہ عام تھا اس نے ہر کام میں دانائی سے کام لیا۔

رشید احمد ندوی لکھتے ہیں:

"اس نے ہر شعبہ اور ہر کام دیانت دار، محتاط شرفاء اور دانا عمال کے سپرد کیا وہ بد اطواروں اور اسی قماش کے لوگوں کو اپنے پاس بھی نہ آنے دیتا تھا۔ اس نے اپنے دربار کے ایک ایک آدمی کے نسب، ذہنیت اور شرف کی جستجو کی اور جن کو کسی نوع معیار کے مطابق نہ پایا۔ دربار اور حکومت کے نظم ونسق سے خارج کر دیا۔ بلبن کا زمانہ تاریخ میں ہندوستان کا بڑاہی غیر معمولی تصور کی جاتا ہے۔ ہر شام بڑے علمائے وقت ان کے ہاں آتے جن میں امیر خسرو علمی اجتماعات کی صدارت کے فرائض انجام دیا کرتے۔ غیاث الدین بلبن کو تاریخ اس لئے بھی فراموش نہیں کرسکتی"۔[4]

اس نے عدل انصاف کو پروان چڑھایا- اور محنت کرنے کی ترغیب کو متعارف کروایا اور اپنے دوستوں ار ساتھیوں سے کہا کہ میرے اندر شریعت اسلامیہ کے سارے احکام کی تابعداری کی سکت نہیں۔ لیکن اس بات کا پابند

---

1 لاہوری، غلام سرور مفتی، **خزینۃ الاصفیاء**، ص259

2 انصاری، عبد الحلیم، **تذکرۃ الصالحین**، (دارالاشاعت رحمانیہ پانی پت، انڈیا، 1968ء)، ص281

3 ندوی، رشید اختر، **مسلمان حکمران**، ص45

4 ندوی، رشید اختر، **مسلمان حکمران**، ص54

ہوں کے میرے دور حکومت میں کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو۔[1]

علماء کا کردار

ہندوستان میں اسلامی فکر کا آغاز وارتقاء اور اسلام کو عروج دینے اور دلوں پر راج کرنے والی روحانی شخصیات تھیں جنہوں نے ہندوستان کے لوگوں کو ایک نئی راہ دکھائی۔ 711 عیسوی میں جب مقامی قوتوں کو شکست ہوئی تو دراصل محمد بن قاسم کی کامیابی محض افواج کی شجاعت اور جانبازی کی مرہون منت نہیں تھی بلکہ سندھ کی داخلی ،سیاسی اور معاشی کشمکش نے بھی اس میں فعال کردار ادا کیا۔ زرعی محنت کشوں نے محمد بن قاسم کی معاونت کی۔ اور اس کے بدلے میں جو کچھ پایا وہ گراں قدر ہے۔

مقامی باشندوں کو مسلمانوں کی فتح کے بعد نہ صرف جابر مقامی حکمرانوں سے نجات ملی بلکہ مسلمانوں کی فتح کے بعد نیا حکمران طبقے نے ایک ایسے نظریہ حیات کو متعارف کرایا جس میں تخلیقی ترقی پسندانہ روح تھی۔ جبر و تشدد کا بڑی حد تک خاتمہ ہوا جو پرانے حکمرانوں کا مخصوص وطیرہ تھا۔ راجہ داہر پر فتح حاصل کرنے والوں نے اپنی کامیابی کا جوش و خروش ختم ہونے پر عوام کو مذہبی آزادی عطا کی۔ عبادت گاہوں اور مذہبی مقدس عمارتوں کی مرمت کی عام اجازت دی گئی۔ اور فاتحین مفتوحین کو انسان دوستی کا پیغام دیا۔

برصغیر میں اسلام کی اشاعت میں اخلاقی اور روحانی قوت نے نمایاں کردار ادا کیا۔ مابعد الطبیات سے متنفر یا بے نیاز لوگوں کو دائرہ اسلام میں داخلے کے لیے جوش و جذبہ بڑھ گیا۔ اس کی دو بڑی وجوہات نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ پہلی وجہ دنیوی فوائد کے حصول کے لئے غیر مسلموں نے اسلام میں پناہ ڈھونڈھی۔ فاتحین کی جانب سے مفتوحین سے جزیہ کی وصولی اور اس کا نفاذ معاشی بوجھ کی نسبت نفسیاتی حملہ زیادہ تھا اسلام قبول کرنے کے بعد وہ اس سے نجات پاسکتے تھے۔ فیروز شاہ تغلق کے دور میں اس بات کی منادی کی گئی جو شخص دائرہ اسلام میں داخل ہوگا اسے جزیہ کی ادائیگی سے بری الذمہ تصور کیا جائے گا۔ تو بے شمار لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔[2]

دوسری بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اسلام کے زیادہ ترقی پسند سماجی نقطہ نظر میں بھی نچلے طبقہ کے لئے کشش موجود تھی۔ اس بات کا اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے کہ ذات پات کے غیر انسانی نظام کے باغیوں کو اسلام نے بہت جلد اپنے اندر جذب کرلیا۔ کئی اسباب کی بنا پر برصغیر میں مقامی اور اسلامی ثقافتی گروہوں کے درمیان تہذیبی سطح پر ابلاغ کے اولین وسیلہ کا وظیفہ تصوف نے سرانجام دیا۔ یہ بات بلاتعجب کی جاسکتی ہے۔ کہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت و تبلیغ صوفیاء کرام کے ذریعہ سے ہوئی۔

---

1 برنی، ضیاء الدین، **تاریخ فیروز شاہی** (سر سید اکیڈمی، علی گڑھ، 1973ء)، ص110

2 برنی، ضیاء الدین، **تاریخ فیروز شاہی**، ص110

شبیر احمد اس طرح رقم طراز ہیں:

"اس عمل میں سندھ اور ملتان کی علمی حالت بہت اچھی تھی ابن حوقل اور مقدسی جنہوں نے اس علاقہ کی سیاحت کی تھی۔ یہاں کے بلند علمی معیار کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ حدیث کا یہاں بہت چرچا تھا۔ تاریخ اور تراجم کی کتابوں میں سندھی الاصل (منصوری الدیبلی) علمائے حدیث کا ذکر ملتا ہے۔ جیسے ابو جعفر محمد بن ابراہیم الدیبلی، ابراہیم محمد بن ابراہیم الدیبلی، ابوالقاسم شعیث بن محمد بن احمد شعیث بن بزیخ بن سوار (ابن قطعان الدیبلی)، ابو العباس احمد بن عبد اللہ بن سعید الدیبلی، ابو محمد بن عبد اللہ بن جعفر مرۃ المنصوری المقری اور ابو نصر الفتح بن عبد اللہ السندی"۔[1]

یہی وہ سب تھے جنہوں نے اپنی توجہ خالص مذہبی اور الہیاتی مسائل پر مرکوز رکھتے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے برصغیر میں مسلم فکر کی داغ بیل ڈالی۔ تاہم ان ارباب علم کی ذہنی اور فکری حاصلات محض تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔

صوفیاء کا کردار

بنیادی طور پر اسلام میں جن تین امور کو اہمیت حاصل ہے ان میں اسلام، ایمان اور احسان ہے۔ احسان کا تعلق اسلام اور ایمان سے بڑا گہرا ہے کیونکہ حسن ایمان اور حسن اسلام یعنی حسن عمل کا نام "احسان" ہے۔ نماز کی ادائیگی اللہ تعالی کے بیشتر بندے کرتے ہیں لیکن جو حسن اور اخلاص اللہ کے مقربین میں نظر میں آتا ہے۔ وہ عام لوگوں کا خاصہ نہیں ہے۔ حدیث جبرائیل کی رو سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایمان، اسلام اور احسان بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضاحت فرمائی کہ حقیقتاً احسان یہ ہے کہ کسی کام کو بہترین ممکنہ طریقے سے سرانجام دینا۔ شوق تیرا اگر نہ ہو میری نماز کا امام، میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب۔[2]

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ازالۃ الخفا میں لکھتے ہیں کہ تصوف احسان ہی کو کہا جاتا ہے۔[3] جب ہندوستان میں اللہ کے نیک بندے تجار مشائخ اور مجاہدین کی صورت میں یہاں اسلام کی داغ بیل پڑی جس سے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکمل چھاپ ہندوستانی معاشرہ پر پڑنی لازمی تھی۔

جو صوفیاء اور مشائخ خالص داعیان اسلام کی حیثیت سے ہندوستان میں آئے ان میں داتا گنج بخش علی ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بختیار کاکی، قاضی حمید الدین ناگوری، سید سیف الدین عبد الوہاب جیلانی خصوصی اہمیت وحیثیت کے حامل ہیں۔

---

1 شبیر احمد، **قرون وسطی کے ہندوستان میں فلسفہ وحکمت کا آغاز وارتقاء** (اقبال ریویو، لاہور: جنوری 1976) ج7، ص14

2 محمد اقبال، علامہ، **کلیات اقبال**، (ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2014ء)، ص403

3 شاہ ولی اللہ، **ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء** (دار القلم: دمشق، 1998ء)، ج2، ص142

صوفیاء وعلماء نے حدیث جبرائیل میں احسان کو تصوف قرار دیا ہے۔ کیونکہ تصوف کا اصل پیغام یہی ہے کہ انسان اپنی عبادت کے وقت یہ خیال کرے گویا وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ اور وہ اس سے مخاطب ہے تزکیہ بالنفس در حقیقت نفس کے وسوسوں سے نجات حاصل کرنا ہے۔

نفس کی پاکیزگی کے متعلق قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَاOوَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا﴾[1]

(بے شک مراد کو پہنچا جس نے اسے ستھرا کیا اور نامراد ہوا جس نے اسے معصیت میں چھپایا)۔

حقیقت میں جسے اسلامی تصوف کہا جاتا ہے، کا تعلق قرآن وحدیث نیز رسول اللہ کی طرز زندگی سے ہے۔ لیکن جیسے وقت گزرا تصوف نے فروغ حاصل کیا اس کا ربط تعلق مختلف سماج تہذیب اور مذہب سے ہوتا گیا۔ اسی اس کی اصلی شکل میں تبدیلی آگئی جب ہندوستان میں تصوف متعارف ہوا تو یہاں صوفیاء نے خود کو تہذیبی اور معاشرتی صورت حال سے جوڑ کر ہندوستانی معاشرہ کو اپنے قریب کرنے کی کوشش کی۔

اس ماحول میں درست سمت کا تعین دینے والے صوفیاء ومشائخ بھی اس معاشرہ کا حصہ بنتے رہے۔ جنہوں نے قرآن وحدیث یعنی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کو واضح کرنے اور معاشرہ میں اسلام کے واضح تصور کو متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ تدبر اور حکمت عملی سے اسلام کا پیغام ہر فرد تک پہنچانے کی بھرپور کوشش کی۔

خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

> "صوفیاء کا کہنا ہے کہ پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی اتنی ستھری اور معیاری تھی کہ ان کے پاکیزہ اخلاق اور عمدہ سلوک کی وجہ سے انہیں عرب جیسے سخت معاشرے میں اسلام کے پیغام کو پھیلانے میں کامیابی ہوئی۔ اسی وجہ سے صوفیاء نے سلوک اور عمدہ اخلاق کو تصوف میں بنیادی طور پر اختیار کرنے پر زور دیا ہے"۔[2]

ہندوستان میں صوفیاء کی آمد کا سلسلہ مسلمانوں کے حملوں اور فتح کے ساتھ ہی شروع ہو چکا تھا۔ خواجہ ابو اسحق کارزونے کے مرید شیخ صفی الدین حقانی نے بہاول پور، پاکستان میں آکر دین اسلام کی تبلیغ شروع کی صوفیا کی آمد سب سے پہلے سندھ اور ملتان میں اور پھر اس کے بعد لاہور صوفیاء کا مرکز بنا۔ سلطان محمود غزنوی کے ہندوستان فتح کے دوران علی ہجویری جنہوں نے کتاب اللہ کی ترویج وتشریح اور تصوف کی اصل کو فراہم کیا اور لوگوں کی صحیح سمت کی طرف نشان دہی کی۔

---

1 الشمس 91:9-10

2 نظامی، خلیق احمد، **تاریخ مشائخ چشت**، ج1، ص49

شیخ ابوالحسن علی ہجویری (1009-1077) جو کہ **کشف المحجوب** کے مصنف تھے۔ انہوں نے ہمیشہ خالص علم، خالص عبادات اور خالص تصوف کی بات کی۔ وہ بغیر صحیح علم اور عمل کے محض ظاہری رسومات کے خلاف تھے۔ یعنی ایسا علم جو چیزوں کی غیر حقیقی شکل دیکھائے۔ انہوں نے صحیح عبادت کو اپنانے پر زور دیا جو اللہ اور انسان کے درمیان سے تمام پردے ہٹادے اور انسان کو اللہ کے قریب کر دے۔ اور یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب انسان خود کو رسومات سے دور کر کے علم کے ذریعے اپنے نفس کی تربیت کرے۔ متعدد صوفیہ کے نزدیک معرفت جہالت کو جان لینے کا نام ہے۔

کشف المحجوب میں انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ کسی سچائی کی کے بارے میں الفاظ ترتیب دے لینا علم نہیں بلکہ اس کا صحیح علم ہونا ضروری ہے۔ انہوں نے انسانی فکر کی پاکیزگی پر زور دیا۔ کیونکہ جس انسان کے دل پر دنیاوی حرص ولالچ کا پردہ ہو وہ حقیقی علم حاصل نہیں کر سکتا علم انسان کے لیے حجاب کیسے بنتا ہے۔

حضرت علی ہجویری لکھتے ہیں:

> "آنکہ نیاموز د بر جہل مصر باشد شرک بود و آنکہ بیاموز د واندر کمال علم خود وی لامعنی ظاہر ہو اگر دو پندار علمش بر خرد دندا ندکہ علم وی بجز اندر علم عاقبت نیست کہ سمیعات اندر حق معانی تاثیری نباشد عجز او از در یاضت علم دریافت شد"[1]
>
> "وہ لوگ جو نہیں جانتے اور جہل پر مصر ہیں مشرک ہیں اور وہ لوگ جو جانتے ہیں اور ان پر ان کے علم نے حقیقی معنی ظاہر کر دیئے ہیں ان پر فضل الٰہی سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان کا علم اپنے انجام سے لاعلمی اور عجز کے سوا کچھ نہیں کیوں کہ سچائیوں کا نام رکھ لینے سے ان کا ادراک نہیں ہوتا۔ علم حاصل کرنے سے انسان کو محض اپنی لاعلمی کا ادراک ہوتا ہے"

چنانچہ گنج بخش علی ہجویری اس بات پر بار بار زور دیتے ہیں کہ علم حاصل کرنا ہی اللہ کو پہچانے کا ذریعہ ہے۔ انہوں نے سچائی کی تلاش میں پر عزم رہنے کی تلقین کی۔ انہوں نے اپنی کتاب میں خلاف شرع عناصر کی مخالفت کی اور کٹر مذہبی رویوں کو بھی ناپسند کیا ہے۔ وہ اللہ کے خوف کی بجائے سچی محبت اور خالص اطاعت کا رشتہ استوار کرنے کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے علم کے حصول کے ساتھ عمل کرنے پر یکساں زور دیا ہے۔

برصغیر میں مسلم فکر کی بنیاد رکھنے والا یہ صوفی دانشور فنون لطیفہ کے بارے میں نہایت نفیس خیالات کا حامل تھے۔ نسل انسانی کے تہذیبی اور جمالیاتی ورثے کو اپنے نفیس ذوق کے ذریعے فروغ دیا۔ سید علی ہجویری کے نظام فکر کی اہمیت یہ ہے انہوں نے فکر اسلامی کو تصوف کے تحت اسلام کی حقیقی تشریح کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی۔

اسی طرح **خواجہ معین الدین** چشتی (1143-1236) نے پختہ اور منظم طریقے سے کام کا آغاز کیا۔ غوری

---

1 الہجویری، ابوالحسن علی بن عثمان، **کشف المحجوب**، (اسلامک بک فاونڈیشن لاہور، 1985ء)، ص 19

کی فتح کے ساتھ ہی آپ نے اپنی تحریک کی بنیاد ڈالی جس نے 18 صدی عیسوی تک ہندوستان میں عروج حاصل کیا۔ اور ہندوستان کے گوشے گوشے میں اسلام کا پیغام عوام تک پہنچا۔ معین الدین چشتی نے اجمیر میں آکر دین اسلام کی تبلیغ شروع کی۔

اس وقت ہندوستان کی معاشرتی حالت کافی ابتر تھی۔ پورا معاشرہ ذات پات دولت اور اقتدار کی ہوس میں ڈوبا ہوا تھا۔ خواجہ معین الدین چشتی کے بہتر سلوک اور اعلی اخلاقیات نے ہندوستانی معاشرہ پر جادو کا اثر کیا۔ آپ نے دین اسلام کی انسان دوستی کے پہلو کو متعارف کروایا اور مساوات کی تعلیم کو عام کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوتے گئے۔[1]

معین الدین چشتی نے تکریم انسانیت پر مبنی باوقار زندگی گزارنے کے طریقہ کو متعارف کروایا۔ آپ نے نو مسلموں کی تعلیم وتربیت کی انہوں نے اپنے مریدوں کو اسلام کی تعلیمات سے آشنا کیا۔ ان کے شاگردوں میں سب سے مشہور **خواجہ بختیار کاکی** (1173-1235) ہیں۔ "خزینۃ الاصفیاء" میں ہے کہ: ہزار در ہزار از صفاء و کبار بخدمت آن محبوب کردگار حاضر شدہ مشرف بہ شرف اسلام۔[2] ہزاروں لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مشرف بہ اسلام ہوتے۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی خواجہ معین الدین اجمیری کے سب سے عزیز اور مشہور ومعروف خلیفہ مانے جاتے ہیں۔ جس وقت آپ دہلی میں مقیم ہوئے اس وقت دہلی پر سلطان التمش کی حکومت تھی۔ وہ آپ کے حسن سلوک اور برتاؤ سے بے حد متاثر ہوا اور آپ کا مرید ہو گیا۔ خواجہ بختیار کاکی نے دین اسلام کی تبلیغ اور تصوف کی اشاعت کے لیے خاصی جدوجہد کی اور اپنے طلبہ کو دین اسلام کی روایتی اور روحانی خصوصیات سے آراستہ کیا۔[3]

حضرت خواجہ دہلی سے اجمیر گئے تو راستہ میں کئی ہندو مسلمان ہوئے۔ آپ کی تعلیمات کا سب سے غالب پہلو اخلاق کی ترویج اور معاشرہ کو ذات پات، اونچ پنچ چھوا چھوت جیسی بیماریوں سے آزاد کرانا تھا۔ آپ نہایت متقی اور اعلیٰ پائے کے صوفی انسان تھے آپ نے انسانی فکر کی تطہیر وپاکیزگی کے لیے ہندوستانی معاشرہ میں واضح اقدامات کیے۔

اسی طرح **خواجہ نظام الدین اولیاء** (1325-1238ء) کے افکار کی اساس محبت کے تصور پر رکھی گئی ایسی

---

1 نام ونسب: ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کے بانی خواجہ معین الدین حسن چشتی سنجری قدس سرہ العزیز بلدہ سجستان میں پیدا ہوئے آپ کا سلسلہ نسب حضرت علی المرتضیٰ سے ملتا ہے۔ (سید صلاح الدین، عبدالرحمن، بزم صوفیہ، ابوالبرکات اکیڈمی لاہور) 1988ء، ص 35) "خواجہ معین الدین تولید و در بلدہ سجستان بود" (حوالہ) **تاریخ فرشتہ**، ج2، ص375

2 لاہوری، غلام سرور، مفتی، **خزینۃ الاصفیاء** (فیاض کرمانی پبلشرز لاہور)، ص259

3 نام بختیار اور قطب الدین عرف عام میں خواجہ کاکی کہلاتے تھے۔ (تفصیل کے لیے "**بزم صوفیہ**" ص63) آپ 1111ء میں پیدا ہوئے۔

محبت جو گروہی تعصبات اور گروہوں سے بالاتر ہو کر تمام بنی نوع انسان کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے۔ وہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ انسان کی تخلیق کا بنیادی مقصد ذات باری تعالیٰ کی محبت ہے۔ لیکن وہ خدا کے لیے محبت کو انسانیت کے لیے محبت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ کیونکہ اس عمل کے بغیر اللہ کی محبت کا دعویٰ نامکمل دکھائی دیتا ہے۔

نسل انسانی کے لیے سماجی انصاف، محبت، ظلم و تشدد کا خاتمہ اور ذہنی آزادی کے بغیر خدائی محبت کی تکمیل نہیں ہوتی وہ انسان دوستی کو دراصل اللہ کی محبت کا ضامن سمجھتے ہیں اور اسے **"راحت القلوب"**[1] میں لکھتے ہیں کہ ان کے ہاں دوستی کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ نظام الدین اولیاء کے زمانہ میں دہلی کی مسلم سلطنت مستحکم بنیادوں پر استوار ہو چکی تھی۔ تاریخ میں سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت کے زمانہ کو سنہری القاب سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اس زمانہ میں کسانوں اور دست کاروں کا ایک بڑا طبقہ انسان دوست صوفیا کے حوالے سے اسلام قبول کر چکا تھا۔ نئے نظریہ حیات اور نئے اور فوجی و سیاسی مراکز کے قیام سے برصغیر کے مختلف ثانوی گروہوں کے درمیان ابلاغ کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا اور ایک نیا ثقافتی سانچہ وقوع پذیر ہوا۔ سلطان علاءالدین خلجی کے عہد میں ثقافتی سانچہ میں دوررس تبدیلیاں کی گئیں۔ حکمران طبقہ کی سطح پر نئی تبدیلیوں کے اثرات سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانہ سے واضح ہوتے چلے آرہے تھے۔

علاؤالدین خلجی اپنی محدود صلاحیتوں کی بنا پر اس تقاضے سے عہدہ برآ نہ ہو سکا اور اس کے خیالات محض حلقہ ارباب تک محدود رہے۔ یہاں تک کہ آئندہ صدی میں بھی بہت سے لوگوں نے اس تقاضے کی تسکین کی کوشش کی۔ اگر اس سارے پس منظر میں خواجہ نظام الدین اولیاء کے فکری نظام کا جائزہ لیا جائے جن کی پیدائش التمش کے عہد میں ہوئی تھی۔ انہوں نے بلبن اور علاؤالدین خلجی کی آزاد خیالی کے دور میں پرورش پائی اور زندگی کے دن بسر کیے۔ تو ان کے خیالات اپنے عہد کا آئینہ نظر آتے ہیں۔ جب حکمرانوں نے زندگی کے مادی اور روحانی پہلوؤں کو الگ الگ کر کے اپنی تمام تر توجہ اول الذکر پر مذکور کر دی۔ چنانچہ خواجہ نظام الدین اولیاء نے سیاسی اقتدار کے مقابلہ میں واضح طور پر روحانی اقتدار کا تصور پیش کیا۔

خلاصہ بحث

اس تمام بحث سے جو مفصل طور پر کی گئی اس سے یہ واضح ہوتا عربوں کی برصغیر اور برصغیر کے باشندوں سے گہری واقفیت ہمیشہ سے رہی ہے۔ جو بعد میں اسلام کی روشنی کے پھیلاؤ میں مدومعاون ثابت ہوئی اور آگے جا کر ان تمام روابط نے نمایاں کردار ادا کیا۔

---

1 ہندوستان کے صوفیانہ ادب میں "راحت القلوب" کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ ہندی مسلمانوں کی روحانی زندگی میں اسے اہمیت حاصل رہی ہے مزید دیکھئے (ایم۔ اے حفیظ اختر صدیقی، **شلوک فرید**) ص 7 سے معلومات لی جاسکتی ہیں۔

برصغیر میں فکر اسلامی اور اسلامی رجحانات کے پھیلاؤ میں ہندوستان کی علمی اور روحانی شخصیات مثلاً جو صوفیاء اور مشائخ خالص داعیان اسلام کی حیثیت سے ہندوشان میں آئے ان میں داتا گنج بخش علی ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بختیار کاکی، قاضی حمید الدین ناگوری، سید شرف الدین یحیٰ منیری[1] خصوصی اہمیت وحیثیت کے حامل ہیں کا کردار بڑا واضح نظر آتا ہے۔

آپ نے مسلمانوں کے دین و ایمان کو غالی صوفیوں کی بے اعتدالیوں، ملحدین کی تحریفات اور باطنیت و زندقہ کے اثرات سے محفوظ رکھا۔ ہاشمی خاندان سے تعلق رکھنے والے شیخ منیری نے ہندوستان میں صحیحین کی تدریس کا آغاز کیا اور آپ کے مکتوبات تصوف و معرفت کے شاہکار تصور کیے جاتے ہیں۔ راجگیر میں قائم آپ کی خانقاہ سے نصف صدی تک خلقِ خدا کی دینی وروحانی رہنمائی فرماتے رہے۔

صوفیا نے یہاں کے مسلمانوں کو ایک نئی راہ دیکھائی اور لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے مسلمان فاتحین نے ایک نیا نظریہ حیات متعارف کرایا جس میں ترقی پسندانہ تخلیقی روح موجود تھی۔ اس سے قبولِ اسلام کی دو بڑی وجوہ نظر آتی ہیں ایک تو یہ فائدہ ہوا کہ غیر مسلموں کو اسلام میں پناہ ملی اور دوسرا وہ جزبہ جس سے وہ نفسیاتی بوجھ سے آزاد ہوئے ۔ کیونکہ نسل انسانی کے لیے سماجی انصاف، ظلم و تشدد کا خاتمہ اور ذہنی آزادی پہلی شرط ہے جس کے بغیر فلاح ممکن نہی، اسی اُسلوب کے تحت برصغیر کے مسلمان فاتحین، علماء کرام اور صوفیاء کرام نے کام کیا۔

---

1 شیخ احمد شرف الدین یحیٰ منیری (661 ہجری-782 ہجری) ہندوستانی برصغیر کے عظیم صوفی، محدث اور مفسر تھے۔

باب سوم: برصغیر میں فکر اسلامی کی اصلاح و تجدید کے محرکات اور ابتدائی تحریکات

(سولہویں سے اٹھارہویں صدی تک کی کاوشوں کا جائزہ)

فصل اول: برصغیر میں فکر اسلامی کی تجدید و اصلاح کا جواز اور پس منظر

فصل دوم: اصلاح و تجدید کی ابتدائی تحریکات کے کارنامے

باب سوم

برصغیر میں فکر اسلامی کی اصلاح و تجدید کے محرکات اور ابتدائی تحریکات

تعارف باب

اس باب میں برصغیر میں فکر اسلامی کی اصلاح و تجدید کے محرکات اور تحریکات اصلاح کا جائزہ سولہویں صدی سے لے کر اٹھارہویں صدی کے اختتام تک لیا گیا ہے۔

برصغیر میں مسلمانوں کی پہلی باقاعدہ حکومت سلطنت دہلی (1206-1526) زوال پذیر ہو کر مسلم مغلیہ سلطنت (1526-1857) میں تبدیل ہو گئی۔ اسی سلطنت کے آخری صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے عملاً اقتدار پر قبضہ قائم کر لیا (1773-1858)۔

اس باب کو دو فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ فصل اول میں برصغیر میں فکر اسلامی کی تجدید و اصلاح کی ضرورت کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس وقت کے ان معاشرتی، سیاسی اور فکری عوامل کا جائزہ شامل ہے۔ یہ فصل برصغیر میں تجدیدی و اصلاحی تحریکوں کے پس منظر، ضرورت و جواز کا احاطہ کرتی ہے۔

فصل دوم میں اصلاح اور تشکیل جدید کی راہنما اہم شخصیات (خاص طور پر شیخ سرہندی اور شاہ ولی اللہ) کی حکمت عملی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسلامی فکر کی تجدید و اصلاح کے لیے ان شخصیات نے جو کردار ادا کیا، ان کے طریقہ کار، ان کی فکری و عملی کاوشوں اور ان کے نتائج کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں خاص طور پر راسخ الاعتقادی کی روایت، شریعت و طریقت کے درمیان توازن کی وضاحت شامل ہے۔

فصل اول:

برصغیر میں فکرِ اسلامی کی تجدید واصلاح کا جواز اور پس منظر

برصغیر میں برطانوی راج کی ابتدائی تجارتی سرگرمیوں کا آغاز سترہویں صدی کے شروع سے ہوا ایک صدی کا سفر کر کے اٹھارہویں صدی کے آخر تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت(1858-1773) میں تبدیل ہو گیا۔ برطانوی اقتدار نے برصغیر میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کو ختم کر کے رکھ دیا۔ اور برطانوی حکمرانوں کی تمام کوشش اور قوت اسی بات پر صرف ہوئی کہ مسلمانوں کے تمام ملی نظریات کو ختم کیا جائے تا کہ مسلمانوں کو سیاسی، مذہبی ،سماجی، اخلاقی اور ثقافتی طور پر تباہ کر کے ہر حیثیت سے غلام بنایا جائے تا کہ ان کا کوئی جداگانہ وجود باقی نہ رہے۔ مسلمانوں نے اس نئی حیثیت کو قبول کرنے سے مکمل انکار کر دیا۔ کہ مسلمان ہندوستان میں بسنے والی ایک مخلوق نہیں بلکہ اپنی ایک جداگانہ اور الگ حیثیت کی حامل ایک قوم ہے۔

داخلی وخارجی عناصر

اخلاقی، سیاسی اور معاشی انحطاط اور اس کے ابتدائی آثار توکئی صدیاں پہلے پہلے شروع ہو چکے تھے۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتے گئے۔ دوسروں کے عطا کیے گئے القابات۔ اور مناجیب میں عزت محسوس ہونے لگی مغل بادشاہوں کی بعد ڈیڑھ صدی بھی نہیں گزری تھی کہ اسلام کا اقتدار برصغیر پاک وہند کی سرزمین سے اٹھا کر پھینک دیا گیا۔ اور سیاسی رعب ودبدبہ اور اقتدار ہوئے ہی برصغیر میں مسلمان بدحالی اور غلامی کی زندگی کے گزارنے لگے۔

جن کمزوریوں نے مسلمانوں سے ان کی بادشاہت اور اقتدار چھینا تھا وہ سب انیسویں صدی میں اسی طرح ظاہر تھیں بلکہ ان کمزوریوں میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ عمومی اور عوامی سطح تک اخلاقی توازن، بھوک اور افلاس کے باعث کہیں گم ہو چکا تھا۔ حکومتی عہدوں سے مسلمانوں کو ہٹا دیا گیا۔ مسلم قوم انگریز حاکم اور ہندو اکثریت کی دوہری غلامی میں گرفتار ہو گئے۔ اس وقت کی مجموعی قومی حالت سے متعلق مولانا سید ابوالاعلیٰ کا تبصرہ قابل غور ہے:

> "انفرادیت اور خود پرستی جوڈھائی سوبرس سے ان کی قومیت کو گھن کی طرح لگی ہوئی ہے انتہائی حد کو پہنچ گئی۔ یہاں تک کہ اجتماعی عمل کی کوئی صلاحیت ان میں باقی نہیں رہی۔ اور وہ تمام صفات نکل گئیں جن کی بدولت ایک قوم کے افراد اپنے قومی مفاد کی خاطر اس کی حفاظت اور اپنے قومی وجود کی حمایت کا لیے مجتمع ہو سکتے اور مشترک جدوجہد کر سکتے"۔[1]

---

1 مودودی، سید ابوالاعلی، **تحریک آزادی ہند اور مسلمان** (اسلامک پبلیشرز شاہ عالم مارکیٹ: لاہور) ص 45

برطانوی سامراجی حکمت عملی نے مسلمانوں کو معاشی طور پر بدحال کیا اور جو قوم خزانوں کی مالک تھی اسے معیشت کے ہر ذرائع سے ایک ایک کر کے محروم کیا گیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کے خاتمے کے بعد اس حکمت عملی کو اپنایا گیا کہ ہر شعبہ سے ایک ایک کر مسلمانوں کو دور کیا جائے تاکہ ان کی معاشی حیثیت تباہ حال ہو۔
برسر اقتدار طبقہ کا یہ دباؤ رہا کہ انہی کے رہن سہن اور طریقہ ہائے زندگی کو اپنایا جائے۔ مسلمانوں میں جن دو چیزوں کا خاتمہ انیسویں صدی کے آغاز میں کیا گیا وہ تھا سیاسی اقتدار کا خاتمہ اور معاشی وسائل سے محرومی۔ انتظامی حکمت عملی میں ہندوؤں کو جگہ دی گئی جس سے مسلمانوں اور حکومت درمیان خلیج اور بھی بڑھتی گئی:

> "اس طریقہ کار سے ہندوؤں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آیا جو تقریباً ڈیڑھ صدی تک مسلمان مزارع کا اقتصادی اور ثقافتی طور پر استحصال کرتا رہا۔ اس کے متوازی مسلم معاشرے کے جاگیردارانہ ڈھانچہ بھی تیزی کے ساتھ بکھرتا رہا ہے۔ دہلی اور اس کے مضافاتی علاقوں کی 1875ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں تباہی اور بربادی اور اسی کے ساتھ وہ دوسرے ادارے جو صدیوں سے مسلم ثقافت کی افزائش اور ترقی میں سرگرم تھے۔ وہ سب نسیا منسیا ہو گئے۔ فارسی کی بجائے انگریزی کو تعلیم اور انتظامیہ کی زبان بنانے سے مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ ہندوؤں کے لئے تو صرف ایک غیر ملکی زبان سے دوسری غیر زبان میں تبدیلی تھی۔"[1]

برصغیر اسلامی ہند اس قسم کے عملی کلچر کے تحفظ کے عمل سے پہلے کبھی نہیں گزرا تھا۔ اس لئے اس کے اپنے ثقافتی اور تہذیبی چیزوں کو چھوڑ کر ایک مخاصم تہذیب و ثقافت کو قبول کرنا تھا۔

تہذیبی عدم فعالیت

برصغیر پاک و ہند کا مسلمان مغربی تہذیب اور برسر اقتدار کے طبقہ کے دباؤ اور اس انقلابی فعالیت سے ناواقف تھا اس طرح اس کو ہندوؤں کی نسبت خود برطانوی اقتدار پرست طبقہ پر انحصار کرنا پڑا۔ اجتماعی حیثیت سے مسلمانوں میں اس وقت مجموعی طور پر پائی جانے والی خرابیاں بھی اثر انداز ہو رہی تھیں۔ جو مسلمانوں کی قومی طاقت اور مضبوطی کو کسی گھن کی طرح ختم کر رہی تھی۔ اسی سے اس بات کا اندازہ لگایا جانے لگا کہ آنے والے وقت میں مسلمان اپنے تہذیبی ورثہ کی حفاظت کر بھی سکیں گے یا نہیں۔

برصغیر پاک و ہند پر برطانوی تسلط ہوا اور آہستہ آہستہ تہذیبی انحطاط آیا تو مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی جو اسلامی تہذیب و ثقافت اور اس کی خصوصیات سے ناواقف تھی۔ حتی کہ لوگ ان خصوصیات کے شعور سے عاری نظر آئے جو اسلام کو اور غیر اسلام ممیز کرتی ہیں۔ اسلامی تعلیم اور اسلامی تربیت مفقود ہو چکی تھی۔ اور برصغیر کے افراد منتشر طور پر ہر طرح کے بیرونی اثرات کو قبول کر رہے تھے۔ ان کی نمایاں خصوصیات تاثر اور انفعال تھا۔

---

1 جابلی، جمیل، ڈاکٹر، (مترجم) **برصغیر میں اسلامی کلچر**، (ادارہ ثقافت ملت اسلامیہ: لاہور، 1990ء)، ص404

کوئی بھی شخص جو ان کو روٹی اور اسائش دینے کی صلاحیت رکھتا تھا ان کی ذہنیت کو اپنے سانچے میں ڈال سکتا تھا:

> "اب مسلمان معاشرہ میں اتنی طاقت باقی نہ رہی تھی کہ وہ اپنے افراد کو حدود کے باہر قدم رکھنے سے روک سکے۔ یا ان کے خیالات اور طور طریقوں کو غیر اسلامی ہونے سے روک پائے۔ یا اسی چیزوں کی اشاعت سے روک سکے جس سے معاشرہ میں انتشار پھیلنے کا خدشہ ہو۔ ہوتا یہ ہے کہ چند سرکش افراد غیر اسلامی اسلوب کو اپنانے میں چند دن شور مچانے کے بعد وہی بغاوت پورے معاشرہ میں پھیل جاتی ہے۔"[1]

افراد کی قومی تربیت اتنی ناقص الحال تھی کہ مسلمانوں کے اپنے حالات سے سمجھونہ کرنا سیکھ لیا تھا۔ اور ہر بیرونی اثر کو آزادانہ قبول کر رہے۔ جب بھی کوئی چیز قوت کے ساتھ آئی اور اطراف میں اس کا اثر پھیلا خواہ وہ کتنی ہی غیر اسلامی کیوں نہیں۔ اس کی گرفت سے مسلمان اپنے آپ کو نہیں بچا سکے تھے۔ اور طوعاً کرھاً اس کے اثر کو قبول کر رہے تھے۔

لامرکزیت اور سماجی انتشار

فکری زوال کا ایک اور بڑا پہلو معاشرے میں فکری و نظری وحدت کا فقدان ہے۔ جب قوم نسل، زبان، مسلک اور سیاسی وابستگی کی بنیاد پر تقسیم ہو چکی ہو۔ یہ تقسیم اتنی گہری ہو کہ مشترکہ قومی مفاد پر اتفاق مشکل ہو جائے۔ یہی ہوا برصغیر کے مسلمانوں کے ساتھ۔ علماء، دانشور، اور رہنما سب اپنے اپنے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے، جس سے سماجی ہم آہنگی کو شدید نقصان پہنچا۔

کسی بھی قوم کے کچھ مجموعی اوصاف ہوتے ہیں۔ جس کے مطابق کوئی بھی قوم یا جماعت اپنا وجود قائم کرتی ہے۔ مسلمانوں میں قومی انتشار اور بدنظمی کی بڑی وجہ بیرونی اثر کو قبول کرنا اور پھر اس کے مطابق اسلوب زندگی ترتیب دینا تھا۔ مجموعی طور پر انگریز حملوں میں مسلمانوں نے اپنے سیاسی اقتدار کو کھویا تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ وہ اخلاقی اوصاف بھی کم ہونے لگے تھے جو کسی قوم کا خاصہ ہوتے ہیں۔ جن کے مطابق کوئی بھی قوم اپنے مفادات کی حفاظت کرتی ہے۔ یا بہتری کے لیے کوئی اجتماعی کوشش کرتی ہے:

> "برصغیر کے مسلمانوں میں اطاعت کا مادہ ختم ہو رہا تھا کہ وہ کسی کو اپنا رہنما تسلیم کریں اور اس کی بات مانیں ان میں اتنا ایثار نہیں کہ وہ کسی کی بات مانیں اور ان کی ہدایت پر چلیں۔ کسی بڑے مقصد کے لیے اپنے ذاتی مفاد، اپنی ذاتی رائے، اپنی آسائش، اپنے مال اور جان کی قربانی کسی حد تک بھی گوارا کر سکیں۔"[2]

گویا لامرکزیت اور انفرادیت کی روز بروز بڑھتی ترقی نے مسلمانوں کے شیرازہ قومیت کو بڑا نقصان پہنچایا۔ متشدد ماحول میں اجتماعی صلاحیت کی عمر کم ہو جاتی ہے۔ شخصی اغراض اور ذاتی مفادات اجتماعی مفادات کی جگہ لے لیتے

---

1 نظامی، خلیق احمد، **شاہ ولی اللہ اور اٹھارہویں صدی کی سیاست** (مکتبہ رحمانیہ اردو بازار: لاہور، 1951ء)، ص 133

2 مودودی، **تحریک آزادی ہند**، ص 55

ہیں۔ انہیں حالات سے برصغیر کے مسلمانوں کا سامنا رہا تھا۔

اخلاقی انحطاط

اباحیت اور نفس پرستی نے مسلمانوں داخلی طور پر کمزور بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ کیونکہ اباحیت پسند طبقہ صرف صرف اپنی نفسانی خواہش کا احترام مانگتا ہے۔ نفس پرستی اور اباحیت پسندی ایک ایسا فلسفہ ہے جس کے پیروکاروں کو ہر گناہ ثواب لگتا ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں ایسا طبقہ پیدا ہوا جس میں ہر برائی کے لیے ایک قانونی جواز پیدا کرنے کوشش کی گئی جس سے مسلم معاشرہ کے بے شمار افراد متاثر ہوتے نظر آئے۔ ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا کہ ظاہر ہے اسلام نے زندگی کے ہر شعبہ میں حلال و حرام کی مضبوط حدیں قائم کر دی ہیں۔ اب ان کو توڑنا اور ان کی خلاف ورزی کرنا قانونا جرم ہو گا۔ لیکن اباحیت پسند ذہن کے لیے یہ پابندیاں قبول کرنا بڑ وحشت ناک ہے۔ اس لیے وہ اس سے نجات کے لیے طرح طرح کے طریقے ڈھونڈتے ہیں۔ جو طبقہ آزادی پسند ہوتا ہے وہ دل و جان سے آزادی کو پسند کرتا ہے اس کے پاس محدودیت کا کوئی تصور موجود نہیں ہوتا ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

> "گزشتہ ڈیرھ سو برس کا تجربہ بتا رہا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنوں نے جو کچھ کرنا چاہا۔ اس کے لیے انہیں مسلمانوں ہی کی جماعت سے انہیں ایسے خائن لوگ مل گئے جنہوں نے تحریر سے، تقریر سے، ہاتھ اور پاؤں سے حتی کہ تلوار اور بندوق تک سے اپنے مذہب اور قوم کے مقابلہ میں دشمنوں کی خدمت کی ہے۔"[1]

نفاق کا خطرہ ہر دور میں مسلمانوں کے ہے ایک بڑا خطرہ رہا ہے۔ یہی لوگ اسلام کی اساسی تعلیمات پر حملہ آور ہوتے ہیں سادہ لوح مسلمانوں کو دہریت اور الحاد کی دعوت دیتے ہیں۔ ان میں بے دینی اور اسلامی قوانین کی خلاف ورزی نہ صرف خود کرتے ہیں بلکہ کھلم کھلا زبان اور قلم سے بھی اس کی تشہیر میں مصروف رہتے ہیں۔ لہذا ان کمزوریوں کے ساتھ اپنے قومی تشخص اور اسلامی تہذیب کی خصوصیات اور اپنے آپ کو نئے نقصان سے محفوظ رکھنا کافی مشکل امر ہے۔

جب معاشرہ اخلاقیات کو صرف نصابی موضوعات تک محدود کر دیتا ہے، تو عملی زندگی میں دیانت، احترام، قربانی اور عدل جیسی صفات ناپید ہو جاتی ہیں۔ معاشرتی رویوں میں خود غرضی، جھوٹ، خیانت اور ظلم عام ہوتے ہیں۔ فکری زوال کی یہ صورت اخلاقی اقدار کی کمزوری سے گہرا تعلق رکھتی ہے، کیونکہ اخلاقی بلندی ہی فکری ارتقاء کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔

---

1 مودودی، **تحریک آزادی ہند**، ص57

جب ایک قوم کا مقصدِ حیات صرف مادی آسائشیں اور دنیاوی کامیابیاں بن جائیں تو وہ اعلیٰ انسانی اقدار سے دور ہو جاتی ہے۔ آج کے نوجوان خواب، نصب العین اور جدوجہد کے بجائے فیشن، شہرت، اور سہولیات میں کھو گئے ہیں۔ اس سوچ نے قوم کی اجتماعی ترجیحات کو متاثر کیا، اور اعلیٰ فکری، علمی اور روحانی مقاصد پسِ پشت چلے گئے۔

ضعیف الاعتقادی اور مذہبی بے اعتدالی

علوم اسلامی کی عمومی تعلیم سے محرومی کی وجہ سے مسلم معاشرے میں اس دور میں پائی جانے والی ضعیف الاعتقادی نے کئی مذہبی بے اعتدالیوں کو فروغ دیا۔ پہلی قسم صوفیاء کی جگہ لینے والے کم علم جانشینوں کی طرف سے شروع کی گئی رسومات تھیں، جن میں شریعت کے ظاہری احکامات سے انحراف بھی شامل تھا۔ اس میں نماز کو کم اہمیت دینا، اللہ اور رسول ﷺ کے متعلق غیر محتاط زبان کا استعمال جیسے "انا الحق" کے دعوے کرنا، وحدت الوجود کے غلط تصور کو عام کرنا اور مریدوں کو شریعت کی بجائے طریقت پر زیادہ زور دینا شامل تھا۔

دوسری قسم کی بداعتدالیاں معاشرتی رسم و رواج سے متعلق تھیں۔ ان میں محرم کے موقع پر تہوار کی طرح تقریبات کا انعقاد، بزرگان دین کے مزارات پر سجدہ کرنا، قبروں پر چادریں چڑھانا، مزارات سے حاجتیں مانگنا اور عرس کے موقع پر غیر شرعی رسومات کی ادائیگی خاص طور پر شامل تھیں[1]۔ یہ رسومات مسلمانوں کے عقائد کو متاثر کر رہی تھیں اور شرک کی طرف لے جا رہی تھیں۔

تیسری قسم کی بداعتدالیاں ہندو معاشرے سے متاثر ہو کر اپنائی گئی تھیں۔ [2]اس میں ہندو مندروں کی زیارت اور وہاں نذر و نیاز پیش کرنا، برہمنوں سے نیک و بد شگون معلوم کرنا، بیوہ خواتین کی شادی کی مخالفت، عورتوں کا سر پر چوٹی رکھنا جو ہندو عورتوں کی تقلید تھی، پتوں پر کھانا کھانا جو ہندو رسم تھی، اور دیوالی، ہولی جیسے ہندو تہواروں میں شرکت شامل تھی۔

بلاشبہ ایسی روش آہستہ آہستہ مسلمانوں کے عقائد کو کمزور کرتی ہے اور انہیں غیر مسلم رسومات کی طرف مائل کرتی ہیں۔ یہ توحید کے تصور کو متاثر کرتی ہیں، عقیدے میں شرک کے عناصر داخل کرتی ہیں اور نئی نسل میں مذہبی شناخت کو کمزور کرتی ہیں۔

فکری زوال کے نمایاں اسباب

فکری زوال کسی بھی قوم کے انحطاط کا ابتدائی اور بنیادی مرحلہ ہوتا ہے۔ جب کوئی معاشرہ علم، شعور، تخلیق، تحقیق اور تنقید کی روش سے ہٹ کر جمود، تقلید اور سطحی سوچ کا شکار ہو جاتا ہے تو اس کے اثرات اس کی

---

[1] محمد اکرم، شیخ، رودِ کوثر، ص، 76

[2] ایضاً، ص80

سیاست، معیشت، تعلیم، ثقافت، اور مذہب تک جا پہنچتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں فکری زوال کی تاریخ استعماریت، مذہبی فرقہ واریت، تعلیمی پسماندگی، اور سیاسی ناپختگی سے جڑی ہوئی ہے۔ اس زوال کے کئی نمایاں پہلو ہیں، جنہیں سمجھنا اصلاحِ احوال کے لیے ناگزیر ہے۔

1۔ تنقیدی فکر کا فقدان: فکری زوال کی سب سے بڑی علامت تنقیدی سوچ کی موت ہے۔ برصغیر میں تعلیمی نظام نے طلبہ کو صرف رٹا لگانے کا عادی بنا دیا ہے، جس کے نتیجے میں سوال اٹھانے، تحقیق کرنے اور مسائل کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے۔ میڈیا اور سیاست میں بھی اختلاف رائے کو برداشت نہیں کیا جاتا، جس سے مکالمہ اور اجتہادی فکر کمزور ہوئی۔ تنقیدی مکالمے کے بجائے تعصبات اور جمود کو تقویت ملتی ہے۔[1]

2۔ تحقیق کا بحران: برصغیر میں تعلیم صرف ڈگری کے حصول یا نوکری کے حصول تک محدود ہو چکی ہے۔ نصاب بوسیدہ، اساتذہ غیر تربیت یافتہ، اور تحقیق کی روایت تقریباً ناپید ہو چکی ہے۔ جامعات علمی مراکز کے بجائے بیوروکریٹک ادارے بن چکی ہیں۔ تعلیمی اداروں میں علمی سوالات اور تخلیقی تحقیق کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔[2]

3۔ مکالمے کی کمی: اختلاف رائے برداشت کرنے کی صلاحیت کا فقدان ایک بیمار معاشرے کی نشانی ہے۔ آج کا سماج مکالمہ کے بجائے مناظرے، الزام تراشی اور جذباتیت کو ترجیح دیتا ہے۔ سوشل میڈیا نے اس بیماری کو اور بھی شدید کر دیا ہے، جہاں دلائل کے بجائے توہین اور طنز کو بڑھاوا دیا جاتا ہے۔ مکالمہ ختم ہونے سے فکری ارتقاء رک جاتا ہے۔[3]

4۔ زبان دانی کی کمزوری: زبان، فکر کا آئینہ ہوتی ہے۔ جب زبان میں کمزوری آ جائے تو اظہار بھی محدود ہو جاتا ہے۔ آج کی نسل نہ اپنی مادری زبان میں مہارت رکھتی ہے اور نہ ہی غیر زبانوں میں۔ اردو، عربی، فارسی، یا انگریزی کسی میں بھی فکری اظہار کی بھرپور صلاحیت باقی نہیں رہی۔ یہ زبان دانی کی کمزوری فکری صلاحیت کو براہِ راست متاثر کرتی ہے۔[4]

5۔ تخلیقی اقلیت کا فقدان: ہر معاشرے میں ایک تخلیقی اقلیت ہوتی ہے جو نئے خیالات، حل اور تصورات پیش کرتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایسے مفکر، مصلح اور تخلیق کار ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر کوئی ہو بھی تو اسے نظر انداز یا دیوار سے لگا دیا جاتا ہے۔ ریاستی و مذہبی ادارے اکثر اس اقلیت کو دبانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔[5]

---

[1] Usmani, Muhammad Taqi. *Islam and Modernism*. Karachi: Maktaba Ma'ariful Qur'an, 1990

[2] Abu Yahya .ادارہ انذار "**مسلمانوں کے زوال کا اصل سبب**." Last modified November 21, 2019. Accessed April 13, 2025

[3] Usmani, Muhammad Taqi. Islam and Modernism. Karachi: Maktaba Ma'ariful Qur'an, 1990

[4] Rafiuddin:(1959)

[5] Abu Yahya:(2025)

6۔ نو آبادیاتی سیکولرازم: نو آبادیاتی نظام نے اسلامی فکر کو نجی دائرے تک محدود کر دیا۔ جدید ریاستی نظام میں مذہب کو سیاست، معیشت اور قانون سے نکال دیا گیا۔ اس علیحدگی نے اسلام کی ہمہ جہتی فکری ساخت کو متاثر کیا، اور دینی فکر کو صرف عبادات یا فقہی معاملات تک محدود کر دیا۔[1]

7۔ سیاسی و معاشی عدم مساوات: جب کسی معاشرے میں سیاسی نظام غیر جمہوری، کرپٹ اور غیر شفاف ہو، تو وہاں فکری رہنمائی ناپید ہو جاتی ہے۔ ایسے ماحول میں فکری آزادی دب جاتی ہے، اور دانشوروں کو سننے والا کوئی نہیں ہوتا۔[2] معاشی تفریق جب شدید ہو جاتی ہے، تو علم و فکر بھی ایک مخصوص طبقے تک محدود ہو جاتی ہے۔ غربت میں جکڑا ہوا طبقہ فکری ترقی کے وسائل سے محروم رہتا ہے۔ ایسی صورت میں قوم کی اکثریت صرف زندہ رہنے کی جدوجہد میں لگی رہتی ہے، اور فکری بلندیاں ان کی پہنچ سے باہر ہو جاتی ہیں۔[3]

8۔ مسلم ثقافتی کا زوال: ثقافت محض رسوم و رواج نہیں، بلکہ ایک فکری تسلسل کا نام ہے۔ جب معاشرہ اپنی ثقافت کو مغرب کی نقالی میں چھوڑ دے، تو اس کا فکری ارتقاء رک جاتا ہے۔ فنون لطیفہ، لباس، زبان اور رویے سب نقل پر مبنی ہو جاتے ہیں۔ نتیجتاً معاشرہ اپنی انفرادیت کھو بیٹھتا ہے۔ مسلم تہذیب کی حفاظت نہ ہونے کی وجہ سے، مسلمانوں کی ثقافتی شان خاک ہو گئی تھی۔

9۔ تاریخی شعور کی کمی: قومیں تاریخ سے سبق سیکھ کر آگے بڑھتی ہیں۔ لیکن برصغیر میں تاریخ کو یا تو مسخ کیا گیا یا بھلا دیا گیا۔ نئی نسل کو نہ اسلامی تاریخ کی فکری گہرائی کا علم رہا، نہ برصغیر کے فکری و تہذیبی ورثے کی پہچان۔ اس شعور کی کمی نے فکری سمت گم کر دی۔

نو آبادیاتی نظام کے اثرات

برطانوی استعمار نے برصغیر میں مسلمانوں کے تعلیمی، سماجی، اور سیاسی ڈھانچے کو تبدیل کر دیا۔ روایتی مدارس اور اسلامی تعلیمی اداروں کی جگہ مغربی طرز کے اسکولوں نے لے لی، جس سے مسلمانوں کی فکری بنیادیں متزلزل ہو گئیں۔ استعماری پالیسیوں نے مسلمانوں کو معاشی اور سیاسی طور پر کمزور کیا، جس کے نتیجے میں ان کی خود اعتمادی متاثر ہوئی۔ یہ تبدیلیاں مسلمانوں کی تہذیبی شناخت کو دھندلا کرنے کا سبب بنیں، اور ان کے علمی و فکری زوال کا آغاز ہوا۔

مغربی استشراقی اشرافیہ نے سیکولرازم کو ایک فکری اور سیاسی نظریہ کے طور پر اسلامی دنیا میں متعارف

---

[1] Usmani:(1990)

[2] Rafiuddin, Moharnmad. "The meaning and purpose of Islamic research." The Qur'anic Horizons 5, no. 1 (1999): 12

[3] Rafiuddin, Muhammad:(1959)

کرایا۔ اس نظریے نے مذہب کو ریاستی معاملات سے الگ کرنے کی کوشش کی، جس سے اسلامی معاشروں میں دینی اقدار کی اہمیت کم ہوئی۔ سیکولرازم کے فروغ نے مسلمانوں کی فکری یکجہتی کو متاثر کیا اور ان کے درمیان نظریاتی تقسیم پیدا کی۔ یہ عمل مسلمانوں کی تہذیبی شناخت کو کمزور کرنے کا باعث بنا۔

مدرسہ کے نظام کو مغربی انداز تعلیم سے بدلنے کے نتیجے میں اسلامی تعلیمات کی گہرائی اور معنویت متاثر ہوئی۔ نئی تعلیمی پالیسیوں نے مسلمانوں کو اپنی علمی روایت سے دور کر دیا، جس سے ان کی فکری نشوونما رک گئی۔ اس تبدیلی نے مسلمانوں کو اپنی تہذیبی وراثت سے بیگانہ کر دیا اور ان کی علمی ترقی میں رکاوٹ بنی۔

اسلامی دنیا میں مذہبی فکر کا جمود اس وقت پیدا ہوا جب اجتہاد اور تحقیق کی روایت کمزور پڑ گئی۔ علماء نے تقلید کو ترجیح دی، جس سے فکری تنوع اور اجتہادی سوچ محدود ہو گئی۔ یہ جمود مسلمانوں کو نئے چیلنجز کا سامنا کرنے سے قاصر بنا، اور ان کی فکری ترقی میں رکاوٹ پیدا کی۔

برصغیر میں فکری زوال ایک ہمہ گیر بحران ہے جو علمی، اخلاقی، سماجی اور سیاسی میدانوں میں نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ اس زوال کی بنیادی علامت تنقیدی سوچ کا خاتمہ اور تقلیدی رجحانات کا فروغ ہے، جس نے تحقیق، مکالمہ، اور تخلیق کو شدید متاثر کیا۔ تعلیمی نظام میں معیار، مقصدیت، اور فکری تحریک کی کمی نے طلبہ کو محض ڈگری کے حصول تک محدود کر دیا ہے۔

اخلاقی انحطاط، عیش و عشرت، اور مادی سوچ نے انسانی اقدار کو پس منظر میں دھکیل دیا ہے، جب کہ سماجی ہم آہنگی، زبان دانی، اور تخلیقی اقلیت کا فقدان فکری انتشار کو بڑھاتا ہے۔ اس زوال کے پس پردہ محرکات میں سب سے اہم نوآبادیاتی اثرات ہیں، جنہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی و تہذیبی ساخت کو مسخ کر کے ان کی خوداعتمادی کو کمزور کیا۔

سیکولرازم کے نفاذ اور مذہب کو نجی دائرے تک محدود کرنے سے فکری وحدت متاثر ہوئی۔ اسی طرح تعلیمی نظام کی ناکامی، اجتہاد کی بجائے تقلید، اخلاقی اقدار کا خاتمہ، اور قیادت کی ناپختگی نے اس زوال کو مزید گہرا کیا۔[1] یہ تمام عوامل ایک ایسے فکری ماحول کو جنم دیتے ہیں جہاں نہ سوال باقی رہتا ہے، نہ خواب، اور نہ ہی کوئی بلند نصب العین۔ اس تناظر میں فکری احیاء کے لیے ضروری ہے کہ تاریخی شعور کو بیدار کیا جائے، مکالمے کو فروغ دیا جائے، اور ایک نئی تخلیقی قیادت ابھاری جائے جو علمی میراث کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر سکے۔

Zaman, Muhammad Qasim. The ulama in contemporary Islam: custodians of change. Princeton University Press, 2010.

حفاظت دین کا خدائی اہتمام

اب تک ان موضوعات پر گفتگو کرنے کی ضرورت اس لیے تھی تاکہ ان تمام محرکات کو واضح کیا جائے جس کے تحت فکر اسلامی کی تشکیل جدید اور اس کی ضرورت واہمیت پر بات کی جاسکے۔ کیونکہ جب تک مسلمانوں کے مختلف طبقات کے رجحانات کو نہ سمجھ لیا جائے۔ اس وقت تک کسی بھی مثبت پہلو سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا سکتا ہے۔

اللہ تعالی نے اس ضابطہ حیات کی حفاظت کی ذمہ داری کا وعدہ فرمایا اور ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَه لَحٰفِظُوْنَ﴾[1]

(بیشک ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور بیشک ہم خود اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔)

مگر یہ حفاظت فرشتوں جماعت کے ذریعے نہیں ہو گی بلکہ انسانوں کی جماعت کے ذریعے ہو گی۔ کسی بھی چیز کی حفاظت کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اسے کسی جگہ محفوظ کر کے رکھ دیا جائے۔ لیکن قرآن مجید کی حفاظت کی ذمہ داری جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ زمانہ نزول لے کر قیامت تک ایک جماعت موجود رہے گی اور ایک تسلسل کے ساتھ اسی پر عملی لحاظ سے کام کرتی رہے گی۔ جو دین تمام بنی نوع انسان کے لیے کسی بھی تفریق کے بغیر، یعنی قومیت رنگ و نسب کی تقسیم اور تخصیص کے بغیر ہدایت کا اعلان کرتا ہے۔ اور جس کے احکامات پر عمل کرنے کے لیے ہر عہد میں ایک جماعت موجود رہی ہے۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے اس دین کے احکامات دائمی حیثیت کے حامل ہوں گے۔ جس پر ہر زمانہ میں عمل کرنا آسان ہو گا۔

یہ بات یقینی ہے کہ لازمی طور پر اِس میں ایسی گنجائش تو ضرور ہو گی کہ ناساز گار حالات میں بھی ان پر عمل پیرا ہوا جاسکے۔ دین جن احکامات کا مجموعہ ہے اس میں مجموعی لچک ہو گی۔ یہ لفظ "لچک" کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ کی تبدیلی کا عذر یا بہانہ بنا کر انہیں توڑا نہیں جاسکتا۔ ان کی حیثیت اور ہیت کو اسی طرح محفوظ رکھتے ہوئے ان کو قابل عمل بنایا جائے گا۔ اس کی یہ خصوصیات تو یوں ہو گی کہ بدلتے ہو حالات اور نئے اٹھنے والے سوالات کا جواب دینے کے اہل ہو گا۔ ماضی میں جتنی بھی تشریع اور قانون سازی کی جو کوشش کی گئی ہیں وہ در اصل انھیں سوالات کے جوابات ہیں اس دین کے پیروکار ہر زمانہ میں کتاب و سنت کے دائرے میں رہتے ہوئے زمانہ کے اعتبار سے ہونے والے تغیر و تبدل پر غور وخوص کرتے رہتے ہیں۔ اورِ س کے لئے راستہ بھی متعین کرتے رہے ہیں۔

فکر اسلامی کی اصلاح و تجدید کی حقیقت و نوعیت

اسلام ایک کامل دین کی حیثیت میں اپنے آپ کو متعارف کرواتا ہے اور اپنے پیروکاروں کو آزاد اور خود مختار

---

1 الحجر 9:15

دیکھنا چاہتا ہے کیونکہ مسلمان اور ظلم و جبر اور غلامی جیسی چیزیں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتی ہیں۔ اسلام کا داعی اور اسکے ماننے والے کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ غلامی کی فضا میں رہ کہ اپنا کام کر سکے اور اپنے ضابطہ حیات کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے۔ اللہ سبحان و تعالی کے ارشاد مطابق:

﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾[1]

(بیشک اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے)۔

﴿ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾[2]

(اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔)

اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ کا معنی و مطلب سمجھا جائے تو یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دین اسلام پر پوری طرح اسی وقت عمل ہو سکتا ہے جب انسان اپنے آپ کو ساری قید و بند کی صعوبتوں سے سے آزاد کر لیتا ہے۔ اور صحیح معنوں میں اللہ کو اپنا خالق حقیقی مان لیتا ہے۔ چونکہ یہ بات واضح ہے اسلام حکمرانی اور غلبہ حاصل کرنے کے لیے آیا ہے۔ وہ باطل نظاموں کے تحت جزوی اصلاحات کے لیے نہیں۔

ارشاد باری تعالی ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾[3]

(وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کر دے اگرچہ مشرکوں کو ناپسند ہو۔)

اسلام نے اپنے ماننے والوں کے لیے یہ مزاج ترتیب دیا ہے کہ برائی اور خرابی کی مخالفت کی جائے خواہ وہ کسی بھی رنگ میں ہو اور اللہ سبحان و تعالی کی حاکمیت اور ملکیت زندگی کے ہر شعبہ میں واضع کرنے کی کوشش کی جائے۔ خواہ اس کا تعلق سیاسی ہو یا سماجی و معاشی اگر تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے یہی کش مکش نظر آتی ہے۔

مشہور اسلامی مفکر فتحی حسن ملکاوی کے الفاظ میں اسلام اللہ کا بھیجا ہوا واحد وہ دین ہے جو اللہ کے یہاں قابل قبول ہے اور تمام رسول اسی دین کو لے کر اپنی اپنی قوم میں آتے رہے۔ البتہ مسلمان اسلام کے احکام پر اپنے کم یا زیادہ علم کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کا یہ علم دراصل اللہ کے بھیجے ہوئے کلام کے تعلق سے ان کا بشری فہم ہوتا ہے یا ان علماء کا فہم ہوتا ہے جن کے ذریعے ان تک دین کا یہ علم پہنچا ہے۔ یہ فہم نصوص پر غور و

---

1 آل عمران 19:3

2 البقرہ 208:2

3 الفتح 29:48

فکر کے نتیجے میں حاصل ہونے والا ایک فہم ہوتا ہے اور اس میں صحیح اور غلط کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ چنانچہ دین اس معنی میں کہ اللہ کا بھیجا ہوا دین ہے اور تدین اس معنی میں کہ اس دین کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی انسانی کوشش ہے، دونوں کے فرق کو ملحوظ رکھنا بہت اہم ہے۔

گویا اسلام کو سمجھنے کے لئے جو بھی کوشش ہو گی وہ اسلامی فکر کے زمرے ہی میں رکھی جائے گی۔ یہ اسلامی فکر کا ایک پہلو ہوا۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ کسی بھی مخصوص تناظر میں کسی مخصوص موضوع پر غور و فکر کرتے ہوئے اگر کسی نے اپنے فریم ورک اور مصادر معرفت کے طور پر اسلامی مصادر یعنی قرآن و سنت کا انتخاب کیا ہے تو اس کے نتیجے میں سامنے آنے والی فکر کو بھی اسلامی فکر کے زمرے میں رکھا جائے گا۔

انسانی فکر کی تشکیل میں دو چیزیں بنیادی ہوتی ہیں جو اس فکر یا نتیجہ فکر کی شناخت فراہم کرتی ہیں۔ ایک وہ موضوع جس پر غور و فکر کرکے انسان کسی نتیجہ تک پہنچا ہو اور دوسری وہ بنیاد اور وہ مرجع جس پر غور و فکر کی پوری عمارت قائم کی گئی ہو۔ فکر کی تعریف اور اجزائے ترکیبی سمجھنے کے بعد سوال اٹھتا ہے کہ اسلامی فکر کیا ہے؟ اسلامی فکر کو دو پہلوؤں سے سمجھا جا سکتا ہے۔

اسلامی فکر کی تشکیل کیسے ہوتی ہے؟ اسلامی فکر کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ اسلامی فکر کو کسی بھی پہلو سے دیکھیں تو اس میں تین اہم اجزاء ہیں جو اسلامی فکر کی تشکیل کو ممکن بناتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ایک اسلامی مفکر اسلامی فکر کی تشکیل اور پیشکش کے حوالے سے تین محاذوں پر غور و فکر اور اجتہاد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک طرف اس کو سیاق اور حالات کو مکمل طور سے سمجھنے کی کوشش کرنی ہوتی ہے۔

دوسری طرف اس کو نصوص کو سمجھنے کی کوشش کرنی ہوتی ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہنی ضروری ہے کہ نصوص کے سمجھنے میں اختلاف کا ہونا طبعی بھی ہے اور یقینی بھی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن و سنت کا اکثر حصہ اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے ظنی ہے یعنی اس میں متعدد مفہوم اخذ کرنے کی گنجائش موجود رہتی ہے اور کبھی یہ متعدد مفہوم آپس میں ایک دوسرے سے تکامل کی نسبت رکھ سکتے ہیں اور کبھی باقاعدہ تضاد یا اختلاف حقیقی کے بھی امکانات ہوتے ہیں۔ اسلامی تاریخ میں ہونے والے اختلافات جن کے باعث ہر شعبے میں متعدد مسالک اور مدارس منظر عام پر آئے اسی کا نتیجہ ہیں۔ اور ان اختلافات کی ایک اہم وجہ یہ بھی دیکھی جا سکتی ہے کہ نصوص کو سمجھنے کے لئے مختلف فریم ورک اور منہج استعمال میں لائے جاتے ہیں۔

احیائے فکر کی مساعی

شیخ شرف الدین یحیٰ منیری[1] صاحب تصنیف صوفی تھے۔ انہوں نے انوار الہی سے دل روشن کرکے لوگوں

---

1 شیخ شرف الدین منیری 5 جولائی 1263 کو صوبہ بہار کے ضلع پٹنہ میں منیر کے مقام پر ایک ممتاز علمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ یہ خاندان

کی روحانی رہبری کی زہد و تقوی میں کامل اہمیت کے حامل رہے۔ بر صغیر میں مسلم راسخ الاعتقادی کے دو بنیادی عقائد رہے۔ اور یہ اس فلسفہ سے منطقی طور پر اخذ ہوتے ہیں۔ جسے راسخ العقیدہ نے فلسفہ وحدت الوجود کی نفی میں پیش کیا تھا اور جسے فلسفہ وحدت الشہود کا نام دیا جاتا ہے۔ شیخ منیری نے طریقت کا ایک مختلف تصور پیش کیا۔ شریعت سے مراد اعمال کے مجموعہ کا وہ حصہ جس کی تقلید امت کے لئے ضروری ہے۔ لہذا طریقت کل اور شریعت جزو کا نام ہے۔ شیخ منیری نے اپنے فکری نظام کے حوالے سے تیرھویں اور چودھویں صدی کے بر صغیر میں اس معتدلانہ آزاد خیالی کی روش کے خلاف راسخ الاعتقادی کا دفاع کیا۔

انہوں نے لکھا:

> "شریعت حقیقت کا لازمی جزو ہے۔ شریعت کا تعلق انسان سے اور حقیقت کا تعلق ذات باری تعالیٰ سے۔ اول الذکر جسم ہے تو مؤخر الذکر روح ہے۔ جس طرح زندگی کا انحصار ان دونوں کے ملاپ پر ہے۔ اسی طرح ایمان کی تکمیل بھی دونوں کے امتزاج سے ہوتی ہے۔ غیر شرعی خواہش باطل ہے۔ غیر دینی عقلی دلائل گمراہ کن ہیں شریعت پر کاربند ہونے سے ہی فلاح ممکن ہے"۔[1]

شیخ منیری نے راسخ الاعتقادی کا دفاع کیا۔ علی ہجویری اور مکتبہ فکر چشتیہ کے دانش وروں نے جس فکر کا اجراء کیا شیخ منیری نے اس کا بھرپور پرچار کیا۔ چونکہ اس میں رد عمل اتنا شدید نہ تھا لیکن شدت کے تمام امکانات موجود تھے جن کی حقیقی طور پر تکمیل بعد میں سر احمد سرہندی کے ہاتھوں میں ہوئی۔

شرف الدین یحییٰ منیری کے زمانے کے درمیانی دور میں بر صغیر میں مسلم آزاد خیالی کے خلاف راسخ الاعتقادی کا اہم ترین رد عمل تحریک مہدویت کی صورت میں رونما ہوا۔ سید محمد جونپوری مہدی اور خدائی نجات دہندہ ہونے کے مدعی تھے۔

پندرہویں صدی کے بر صغیر میں مہدی کے تصور[2] نے روشن خیالی اور انحرافی نظریات کے فروغ کے علاوہ اس بنا پر بھی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ سید محمد جونپوری ثقافتی اور تہذیبی مرکز جونپور میں 9 ستمبر 1443 کو پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی زندگی کی داستان ذہانت اور علم کی جستجو کے واقعات سے رنگین ہے۔ وہ موشگافی میں دلیر اور مباحثہ میں شیر تھے۔ اس لئے جونپور کے علماء انہیں اسد العلماء کے نام سے پکارتے تھے۔[3]

زہد و تقوی میں ممتاز تھا۔ آس پاس کے علاقے میں ان کی بدولت اسلام کی اشاعت ہوئی یہ گھرانہ بیت اللہ سے ہجرت کر کے آیا (ڈاکٹر محمد اسحاق، **شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اور ان کا حلقہ محدثین** 1974) ص 51

1 منیری، شرف الدین احمد یحییٰ، مخدوم، **مکتوبات صدی** (اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، انڈیا: 1969ء) ص 509

2 مہدی کا تصور مذہبی نفسیات کا لازمی جزو ہے اور اکثر مذاہب میں اس کا تصور پایا جاتا ہے۔ اس سے مراد ایک ایسا نجات دہندہ ہے جس کی ضرورت بانی مذہب کے بعد پیدا ہونے والی انحرافی عقائد کا خاتمہ کرنے اور تجدید مذہب کے لئے محسوس کی جاتی ہے۔

3 اختر، محمد عباد اللہ، خواجہ، **مشاہیر اسلام** (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور) ص 171

قرآن فہمی اور بیان قرآن میں سید جونپوری نہایت ممتاز ہوتے گئے۔یہی وجہ تھی کہ لوگ جوق در جوق ان کی طرف کھنچے چلے آئے۔ سید جونپوری کی تعلیمات میں سب سے زیادہ اہمیت اتباع سنت کو حاصل تھی۔ انہوں نے شریعت ظاہری کی حمایت کا بیڑا اٹھایا اور وہ علوم رسمیہ، زہد و درویشی اور تقوی میں بھی لاجواب تھے۔
مولانا ابوالکلام آزاد "تذکرہ" میں لکھتے ہیں:

"ان کا نقطہ نظر انحرافی نہیں تھا وہ شریعت اسلام کے پابند تھے درحقیقت مہدویت کے علاوہ انہوں نے کوئی بدعت روشناس نہیں کرائی بلکہ تقویت دین اسلام اور اعلائے شریعت رسول سے کام رکھا۔ ان کا مقصد حیات دعوت و تبلیغ حق واحیائے شریعت قیام فرض امر بالمعروف و نہی عن المنکر تھا۔ وہ اپنے آپ کو شریعت کی پابندی کرنے والا، بدعتوں سے دور کرنے والا اور صداقت کی طرف بلانے والا تصور کرتے تھے"۔[1]

ظاہری علوم کے ساتھ انہوں نے طریقت، جسمانی اور ذہنی ریاضت کے کڑے مراحل طے کیے۔ رہبانیت کی زندگی اختیار کرنے کا فیصلہ بھی کیا لیکن روحانی سکون کی تلاش میں لگے رہے۔ اس دوران احیائے دین کا تصور ان کے ذہن میں ابھرنے لگا کچھ عرصہ بعد انہوں نے آیاری کا رخ کیا مالوہ کے شہر چندیری سے اپنی تبلیغی تحریک کا آغاز کیا۔

تاریخ اسلام میں مہدویت کے دیگر دعویداروں کے برعکس ان کے ہاں کوئی واضح سیاسی مقاصد کار فرما نظر نہیں آئے وہ مکمل طور پر مذہبی اور سماجی محرکات کے زیر اثر عمل پیرا دکھائی دیتے ہیں۔ مہدویت ایک طویل عرصہ تک جبر و تشدد کا نشانہ بنی رہی اور ارباب اقتدار کہ جبر کا نشانہ رہی تاہم اکبری دور میں یہ تحریک زوال پذیر ہو گئی۔ اور اس تحریک کی تخلیقی روح ختم ہو گئی اور اس سے وابستہ لوگ مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔

1 آزاد، ابوالکلام، مولانا، **تذکرہ** (ساھیتہ اکادیمی، دہلی: 1963ء) ص40

فصل دوم:

اصلاح و تجدید کی ابتدائی تحریکات کے کارنامے

انگریز اقتدار کے اثرات کا واسطہ مسلمانوں کے ہر طبقہ سے پڑا وہ مسلمان طبقہ جن کا روزگار برصغیر کے حکمران طبقہ سے وابستہ تھا جب برصغیر میں مسلمانوں کی خود مختاری ریاستی طور پر ختم ہوگئی تو اس نے مسلمان سپاہی طبقہ کو بے روزگار کر دیا۔ انہوں نے دوسرے پیشوں کو اختیار کرنا اپنے لیے عار محسوس کیا اور دوسری ریاستوں کا رخ کیا۔ اس عمل میں ان کی جڑیں اور بھی کمزور ہوئی گئیں۔

"مجموعی طور انگریز اقتدار نے طبقہ اعلیٰ کے مسلمانوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا کیونکہ اپنی حکومت کی وجہ سے ان میں احساس تحفظ تھا ان کی تہذیبی اور ثقافتی روایات کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ اقتدار سے محرومی نے انھیں خلا میں معلق کر دیا اور انھیں احساس ہوا کہ وہ ہندو اکثریت اور برطانوی اقتدار کے درمیان بے سہارا اور بے آسرا ہو کر رہ گئے ہیں۔"[1]

اقتدار کی اسی سیاسی تبدیلی کا واضح طور علمائے کرام اور مذہبی طبقہ پر بھی اثر ہوا۔ کیونکہ مسلمان حکومت میں جو علماء قاضی، مفتی کی حیثیت سے کام کر رہے تھے انھیں برطرف کر دیا گیا۔ حالات کی خرابی اور مسلمانوں کو معاشرتی برائیوں سے بچاؤ کے لیے، معاشرہ کو خالص بنانے کے لئے ہندوانہ رسومات کے خلاف علم بلند کیا۔

تحریک اصلاح کا آغاز

برصغیر کی تاریخ کے اس دور کے مطالعہ سے عیاں ہوتا ہے کہ مسلم تہذیب کے زوال میں عمومی طور تین طرح کے طبقات ابھر کر سامنے آئے:

1۔ پہلا وہ طبقہ جنہوں نے "سمجھوتہ بندی" کی روش کو اختیار کیا۔ جو لوگ ذہنی طور پر مغربی اصول وضوابط سے شکست کھا چکے۔ اور انہوں جدید تہذیب کو اپنانے اور اس کا راستہ اختیار کرنے کی دعوت دی۔

2۔ دوسرا طبقہ وہ جنہوں نے نئے تقاضوں اور نئے پیدا شدہ حالات سے مکمل طور پر صرف نظر کیا اور اپنے آپ کو ماضی کے حسین نظاروں میں گم رکھا۔

3۔ تیسرا طبقہ وہ تھا جنہوں نے مسلم تہذیب وسیاست کے احیا کی ٹھانی۔ حالات نے اپنا رخ بدلا اور ملکی حالات ایسے ہوئے کہ مسلمانوں کی شرکت لازمی قرار پائی۔

تاہم ابھی تک وہ واضح راہ نظر نہیں آ رہی تھی جو مسلمانوں کو غلامی سے کے طوق سے آزادی دلا سکے اور اس

---

1 مبارک علی، ڈاکٹر، **برصغیر میں مسلمان معاشرہ کا المیہ**، (رنگارشات مزنگ روڈ: لاہور، 1974ء)، ص 86

رشتے کو بحالی ملے جو مسلمانوں کا اپنے دین اور تہذیب و ثقافت کے ساتھ مستحکم رہا ہے۔ ان تاریخوں تقاضوں کو پھر سے پورا ہونے کا موقع ملے جس کے اظہار کے لئے پوری ملت اسلامیہ ہند بے چین تھی۔

ایسے میں بر صغیر پاک وہند میں مسلمانوں کی سیاسی، معاشی اور سماجی پسماندگی نے کئی اصلاحی تحریکوں کو جنم دیا۔ یہ تحریکیں تین بنیادی محاذوں پر کام کرتی رہیں: مذہبی احیاء، تعلیمی اصلاح، اور سیاسی و نظریاتی بیداری۔ ان تحریکوں نے مسلمانوں کے فکری، تعلیمی اور سماجی ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی (1551ء–1642ء) کے اصلاحی تحریک

بر صغیر پاک وہند کے سامنے یہ مسئلہ مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے ساتھ شروع ہوا اور اٹھارہویں صدی میں بہت نمایاں ہو کر ابھرا کیونکہ اس وقت مجموعی طور پر ملک کا اجتماعی نظام اسلامی تعلیمات کے مطابق نہ تھا۔ اس لیے مسلمانوں کی تمام کوششوں کا مرکز اجتماعی نظام میں مزید اصلاح اور بگاڑ کا ہر ممکنہ صورت حال کو درست کرنے کی کوشش تھی۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی 1551 عیسوی میں سلیم شاہ سوری کے عہد حکومت میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں تحریک مہدویت اپنے عروج پر تھی۔ اور بر سر اقتدار طبقے کے ساتھ اس کا تصادم شروع ہو چکا تھا۔ شیخ محدث دہلوی طبقہ امراء سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد اولین طور پر سلطان علاء الدین خلجی کے عہد حکومت میں اپنے قبیلہ کے ہمراہ بخارا سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے۔[1]

تاہم، احیائے مذہب کی اس تحریک کا انجام بھی دیگر مذہبی تحریکوں سے مختلف نہ تھا۔ اسی طرح بر صغیر میں احیائے دین کی تحریک کے رہنماؤں میں شیخ شیخ عبد الحق محدث دہلوی (1551–1642) ایک منفرد اور نمایاں مقام کے حامل قرار پاتے ہیں۔ ان کے بارے میں بلا تکلف یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ عقیدہ پرستی کی سب سے بہتر نمائندگی کرنے والے تھے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی کو علمائے ظاہر و باطن نے عام طور پر قبول کیا۔ ان کے افکار اور تحریریں بنیادی طور پر پابند شریعت عالم کی نمائندگی کرتی ہیں۔

شیخ محدث دہلوی قوی قوت حافظہ کے مالک تھے۔ فلسفہ و ادب، فقہ و حدیث میں کمال مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے عزیز و اقارب کے ہمراہ احیائے دین کی تحریک پر فتح پور سیکری کا سفر اختیار کیا۔ جو اکبری دور کا دارالحکومت ہونے کی بنا پر بر صغیر میں ثقافتی و علمی مرکز بن چکا تھا۔ انہوں نے یہاں پر تھوڑی مدت فیضی، مرزا نظام الدین احمد کی صحبت اختیار کی۔ وقت گزرنے کے ساتھ اکبری اعتقادی اور روشن خیالی کے خلاف رد عمل شدید تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے حرمین شریف کا سفر اختیار کیا۔

---

1 محمد فاضل، مولانا، **مکتوبات شیخ عبد الحق محدث دہلوی** (مدینہ پبلشنگ، کراچی) ص284

محمد اسحاق بھٹی لکھتے ہیں:

"شیخ محدث دہلوی عقیدہ پرست علماء کی طرح اپنے آپ کو بے بس پاتے ہوئے حرمین شریف کی جانب روانہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلہ میں وہ ایک برس گجرات رہے اور وہاں کے ممتاز مذہبی عالم شیخ وجیہ الدین احمد العلوی سے کسب فیض کیا۔ جو اپنے دور میں "ملک المحدثین" پکارے جاتے تھے۔ شیخ عبدالحق 1587 میں مکہ مکرمہ پہنچے۔ یہاں انہوں نے کتب صحاح کے سماع کے ساتھ ساتھ علم حدیث کی تکمیل کی جہاں انہیں شیخ عبدالوہاب متقی کی صحبت نصیب ہوئی۔ وہ جلیل القدر ربرگ اور اوصاف وکمالات کے مالک تھے"[1]

وہ شیخ علی متقی کے شاگرد تھے جو ایک نامور محدث تھے۔ حجاز مقدس سے واپسی پر شیخ عبدالحق کی فکری اور ذہنی نشوونما مکمل ہو چکی تھی۔ اور برصغیر کی تہذیبی صورت حال خاصی بدحالی کا شکار تھی۔ چناچہ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس صورتحال کے خلاف رد عمل کا اظہار کیا۔ برصغیر میں احیائے دین کی تحریک کے دیگر رہنماؤں سے ان کا طریقہ کار مختلف تھا۔ انہوں نے دینی علوم کے فروغ کو وسیلہ نجات تصور کیا۔ اور درس و تدریس میں مصروف رہے۔ شیخ عبدالحق اپنے عہد کے شمالی ہند کے کے سب سے بڑے شیخ الحدیث تھے۔[2]

عبدالحق محدث دہلوی سید جونپوری کے نظریے کا رد کرتے ہوئے نبوت کو ولایت سے اعلیٰ و ارفع قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں نبوت اللہ کی طرف سے وارد شدہ ہے جب کہ اس سے انکار کفر ہے۔ اور ولایت اس حدیث کا نام ہے جو بطریق الہام وارد ہوتی ہے۔ جس سے قلب و زبان مطمئن ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے اس نکتہ کو واضح کیا کہ اتباع واضح چیزوں میں کیا جاتا ہے انہوں نے اپنے عہد کی عقلیت پسندی کو ہدف نشانہ بنایا۔ انہوں نے تصوف کو دائرہ شریعت میں رکھنے پر زور دیا۔ اس سلسلہ میں ان کی تعلیمات سیدھی سادھی تھیں اور وہ اس بات کی پابندی پر زور دیتے تھے۔ شریعت کی پابندی کے بغیر منشاو مقصود حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے الہیاتی، تاریخی اور علمی موضوعات پر متعدد کتابیں لکھیں۔

برصغیر میں اسلامی علوم کے احیاء و فروغ کے سلسلہ میں ان کتب نے نمایاں کردار ادا کیا اور ان کی مدد سے سے احیائے دین کی کی تحریک کو کو بڑی تقویت ملی۔ انہوں نے آلاہ پرستی کے رجحان کی نفی کی اور اس اساسی عقیدہ کی اہمیت کو واضح کیا جب تک کوئی اللہ پر ایمان لانے کے بعد رسول اللہ کو رسول تسلیم نہیں کرتا وہ ہرگز مسلمان نہیں ہو سکتا۔

شیخ احمد سرہندی(1564ء–1625ء) اور تجدیدی کام

شیخ احمد سرہندی 26 جون 1564 کو سرہند میں پیدا ہوئے ان کا نام احمد، لقب بدر الدین اور کنیت ابو

---

1 بھٹی، محمد اسحاق، **فقہائے ہند** (ادراہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ، لاہور: 2001ء) ج3، ص213

2 قادری، سید احمد، **تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی** (شاد بک ڈپو، پٹنہ:) ص4

البرکات تھی۔[1] ان کے والد مخدوم عبد الاحد معروف وحدت الوجودی دانشور شیخ عبد القدوس گنگوہی کے صاحبزادے شیخ رکن الدین کے مرید تھے۔ شیخ احمد سرہندی خواجہ باقی باللہ سے متاثر تھے۔ یہ دونوں دانشور تقریباً ہم عمر تھے۔ اور ان میں دوستانہ تعلقات بھی استوار تھے ۔ تاہم شیخ احمد سرہندی ارتقاء کے عمل پر یقین رکھتے تھے۔ ارتقائی پس منظر کے اوپر اگر نظر ڈالی جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے اس وقت کے حالات کا تقاضا تھا کہ عقائد و احکام پر پڑی ہوئی دھول کو صاف کیا جائے۔

ان حالات کا ذکر کرتے ہوئے ابولاعلی مودودی تجدید احیائے دین میں لکھتے ہیں:

"اکبر کے دربار میں یہ رائے عام تھی کہ ملت اسلامیہ جاہل بدوں میں پیدا ہوئی کسی مہذب اور شائستہ قوم کے لئے وہ موزوں نہیں۔ نبوت، وحی، حشر و نشر، دوزخ، جنت، ہر چیز کا مذاق اڑایا جانے لگا۔ قرآن کا کلام الہی ہونا مشتبہ، وحی کا نزول عقلاً مستبعد مرنے کے بعد بعد ثواب و عذاب غیر یقینی، معراج کو علانیہ محال قرار دیا گیا ذات نبوی پر اعتراضات کیے جانے لگے خصوصاً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج کے تعدد پر اور آپ کے غزوات و سرایا پر یہاں تک کہ لفظ احمد اور محمد سے بیزاری ہو گئی جن کے ناموں میں یہ نام تھا ان کے نام بدلے جانے لگے۔ بہائی نظریہ کی بناء بھی دراصل اکبری عہد میں ہی پڑی اس وقت یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کو ہزار سال گزر چکے ہیں۔ اور اس دین کی مدت ایک ہزار سال ہی تھی۔ اس لیے اب وہ منسوخ ہو گیا ہے۔ اور اس کی جگہ ایک نئے دین کی ضرورت ہے۔ اس نظریہ کو سکوں کے ذریعے پھیلایا گیا۔ کیونکہ اس زمانہ میں نشر و اشاعت کا بڑا ذریعہ یہی تھا۔ اس کے بعد نئے دین کی بنیاد ڈالی گئی جس کا مقصد تھا ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب کو ملا کر مخلوط مذہب بنایا جائے"۔[2]

اسلامی تمدن کے نام پر عجیب مرکب تیار ہوا جس میں شرک بھی تھا طبقاتی اور نسلی امتیازات بھی نو ایجاد رسموں کی ایک شریعت بھی۔ ایسے حالات میں شیخ احمد سرہندی نے آنکھ کھولی۔ ان کی تربیت ایسے لوگوں میں ہوئی جو اس دورے ضدلالت میں صالح ترین لوگ تھے ۔ لیکن اپنے گرد و پیش کے فساد کا مقابلہ نہ کر سکے تھے ۔ شیخ احمد سرہندی کو سب سے زیادہ فیض حضرت موصوف باقی باللہ سے پہنچا۔ جو اپنے وقت کے بڑے صالح لوگوں میں شمار کیے جاتے اور اعلی پائے کے صوفی بزرگ تھے۔ حضرت سرہندی جیسے ہی سن رشد کو پہنچے اس فتنہ عواقب کو سمجھ گئے۔ اور پھر مرد مجاہد نے اس کے مقابلے کی بھرپور تیاری شروع کر دی۔ حکومت کے افسروں اور فوج کے سپہ سالاروں پر پر تبلیغ شروع کر دی۔

---

1 محمد دین کلیم، **لاہور میں اولیاء نقشبند کی سرگرمیاں**، ص30 شیخ احمد سرہندی، **مکتوبات**، ص110

2 مودودی، ابوالاعلی، مولانا، **تجدید احیائے دین** (مکتبہ جماعت اسلامی دارالسلام جمال پور، پٹھان کوٹ:) ص146

شیخ سرہندی کے کام کی نوعیت

شیخ احمد سرہندی نے اصلاح کے لیے انقلاب سلطنت کی بجائے نظریات سلطنت کی تبدیلی کو مفید قرار دیا۔ اس طرح آپ نے بادشاہ وقت کی اصلاح سے پہلے کارکنان کی اصلاح کی، جس کی ترتیب یہ تھی کہ:

(الف) غیر سرکاری سنجیدہ کارکنان کی اصلاح، (ب) ارکان دولت کی اصلاح، (ج) بادشاہ وقت کی اصلاح

اللہ نے آپ کی محبت ان لوگوں کے دلوں میں ڈال دی جن کو حکومت میں اثر ورسوخ حاصل تھا۔ آپ نے خود ان کی تعلیم وتربیت اور افکار کی درستی کا اہتمام کیا۔ شریعت اسلامی اور نبوت محمدی کی صداقت پر اعتماد بحال کیا۔ اگر دقیق نظری سے دیکھا جائے تو خلق خدا کی ایک جماعت آپ کے ساتھ تھی۔[1] جن کو اپنا ہمنوا اور حلقہ بگوش کیا۔ آپ نے اعلیٰ افسران اور عہدے داران کے نام مکتوبات آپ نے تحریر کیے۔

شیخ احمد سرہندی نے عدم تشدد کا طریقہ اپنا کر تبلیغ واصلاح میں سنت رسول کی یاد کو تازہ کیا۔ آپ رسول کی اتباع کو نصب العین بناتے ہوئے لائحہ عمل اختیار کیا۔ آپ نے حق کو باطل سے الگ کر کے پیش کیا۔ کلمۃ اللہ کو غالب کیا جس سے کفر وبدعت کے سیاہ بادلوں کا صفایا ہوا۔

شیخ احمد سرہندی نے اپنی اصلاحی تحریک کا آغاز آگرہ سے کیا۔ شیخ احمد سرہندی نے تبلیغ واصلاح کے مختلف طریقے اور ذرائع استعمال کر کے ٹھوس عملی اقدامات اٹھائے۔ آپ نے عہد اکبری میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا پتہ چلایا اور پھر ان کے تدارک کی بھرپور کوشش کی۔ آپ نے یہ بات محسوس کی بادشاہ اور عوام اتباع شریعت سے فرار چاہتی ہے۔

شیخ سرہندی نے اپنی اصلاح کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کی نبوت ورسالت کے اعتقاد پر رکھی۔ یہ آپ اصلاحی کاموں کی بنیاد اور تجدیدی کاموں کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ شیخ احمد سرہندی نے رسول اللہ کی نبوت پر ایمان کی تجدید کی اور مسلمانوں کے ذہنوں سے ایرانی مصری اور یونانی اشراقیت کے اثرات کا خاتمہ کیا۔

آپ نے لکھا کہ: اس نعمت عظمیٰ کے حاصل ہونا، صرف سردار اولین وآخرین حضرت محمد کی پیروی سے وابستہ ہے۔ سالک جب تک اپنے آپ شریعت میں بالکل گم نہ کر دے وہ اپنی زندگی کو شریعت تابع نہ بنالے اس نعمت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکتا۔[2]

---

1 شیخ فرید بخاری یہ اکبر کے زمانے میں میر منشی تھے۔ تخت نشینی کی جدوجہد میں جہانگیر کا ساتھ دیا ان کو صاحب السیف والقلم کا خطاب ملا۔

2 سرہندی، شیخ احمد، **شیخ مکتوبات امام ربانی**، جلد، اول (مترجم) مولانا محمد سعید احمد نقشبندی، مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی، 1976ء ص 100

"وصول باین نعمت عظمی وابستہ باتباع سید اولین آخرین است علیہ وعلی آلہ من الصلوۃ افضلھا من التحیات اکملھا نا تمام خود را در شریعت گم نساز دو با تنثال اوامر وانتا از تورای محلی مگر دو بوئے از میں دولت بمشام جان او فرسد"

شیخ احمد سرہندی کو بدعات سے سخت نفرت تھی۔ آپ رسول اللہ کی محبت میں اس قدر گرفتار تھے۔ جو کام آپ سے تعلق نہ رکھتا ہوتا اسکو بدعت شمار کرتے تھے۔[1] بدعت حسنہ جس کے پردہ میں علماء نے اپنی خواہشات و نفس کو دین کا حصہ بنا رکھا تھا، شیخ احمد سرہندی نے اس کا رد کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں کسی بدعت کو حسنہ نہیں سمجھتا اور سوائے ظلمت و کدورت کے مجھے ان میں کچھ محسوس نہیں ہوتا۔[2]

نظریہ انسانی زندگی کا محور ہوتا ہے۔ اور کسی بھی قوم کا اجتماعی زندگی میں نظریہ کی حیثیت کسی بھی جسم میں روح کی مانند ہوتی ہے۔ نظریات اقوام میں مقلدیت کا شعور پیدا کرتے ہیں۔ نظریات کو عام طور پر دو اقسام میں، تقسیم کیا جاسکتا ہے ہے۔ نظریات اقوام میں مقصدیت کا شعور پیدا کرتے ہیں۔ نظریات کو عام طور پر دو اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: انسانی نظریات الہامی نظریات، انسانی نظریات کے ذریعے مفکرین مسائل کا حل عقل کو بنیا دبنا کر پیش کرتے ہیں۔ جب کے الہامی نظریات کی بنیاد وحی الٰہی پر ہوتی ہے۔

برصغیر میں اسلام کی روشنی مسلمان تاجروں اور صوفیاء کی مرہون منت رہی۔ اسلام نے ہندومت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ہندو راہنماؤں نے مذہب کی اصلاح کر کے عوام کو بدلے ہوئے حالات میں قابل قبول بنانے کی ضرورت کو محسوس کیا یہ لوگ مذہب کے اتحاد کے حامی تھے۔ ان کے نزدیک اسلام اور ہندومت ایک ہی دریا کی نہریں ہیں۔ شیخ احمد سرہندی نے کفر و اسلام کی سرحدوں کا تعین کر کے مسلمانوں میں جداگانہ قومیت کے تصور کو ابھارا اور واحدانیت اور بت پرستی کو ماننے سے انکار کیا۔ آپ نے اس بات کی تردید کی۔ رام اور رحمان کبھی ایک نہیں ہوسکتے خالق اور مخلوق کو ایک سمجھنا بے عقلی ہے۔[3]

شیخ کا تجدیدی کارنامہ

شیخ احمد سرہندی نے جہانگیر اور اعلی حکام کی اصلاح کی اور ان کی زندگیوں کو اسلامی سانچہ میں ڈھالا۔ انہوں نے جابر اور ظالم حکمرانوں کے سامنے کلمہ حق بلند کرنے کی عظیم الشان مثال قائم کی۔ آپ نے ان کو مذہب اسلام

---

1 **مکتوبات امام ربانی**، جلد سوم، مکتوب نمبر 96، ص174

"بعد از ھزار سال ظلمات کفر و بدعت مستولی گشتہ است اور نور اسلام و سنت نقصان پیدا کر دہا"

2 **مکتوبات امام ربانی**، دفتر، دوم، مکتوب نمبر 23، ص39

"ہمہ وقت خصوصاً در میں اوان ضعف اسلام اقامت مراسم اسلام منوط بہ ترویج سنت است و تخریب بدعت گزشتگان در بدعت حسنی دیدہ باشند کہ بعض افراد آنرا مستحسن داشتہ انداماں ایں فقیر در میں مسلہ بایشاں موافقت ندارد و ھیچ فرد بدعت راحسنہ نمیداند و جز ظلمت و کدورت دراں احساس نمی نماید"

3 **مکتوبات امام ربانی**، دفتر، اول، مکتوب نمبر 167 ص51

"رام در حمان رایکی دانستن از نہایت بے عقلی است خالق باخلوق کے نمیشود وچون باچوبی متحد میگیرد"

سے متعارف کرانے اور ان کا صحیح رخ متعین کرنے کے لیے اپنی پوری قوت اور حکمت کو استعمال کیا۔[1]
آپ کی کوشش سے بادشاہ اور اعلی حکام کے رجحانات میں واضح تبدیلی پیدا ہوئی اور وہ اسلام کی طرف توجہ کرنے لگے۔ آپ نے اپنے دور کے گمراہ کن صوفیانہ نظریات کارد کیا۔ اِس دور کے کچھ صوفیاء کی ایک گمراہی یہ تھی کہ انبیاء اور خصوصاً محمد کو اللہ کی ذات کے ساتھ متحد کرتے تھے۔ شیخ احمد سرہندی نے ان کے خلاف آواز اٹھائی۔[2]

شیخ احمد نے شریعت اور طریقت کے راستے کو مضبوط کیا۔ اور صوفیا کے اس بڑے فتنے کی سرکوبی کی۔ آپ نے قلم کے ذریعہ سے علم جہاد بلند کیا۔ بہت سی تصانیف آپ کی یادگار ہیں۔[3] شیخ احمد سرہندی پہلے مصلح ہیں جنہوں نے دو قومی نظریہ کو پورے زور سے پیش کیا۔ اسلام اور ہندومت کا اتحاد ممکن قرار دیا۔ آپ نے غیر اسلامی افعال کے خلاف آواز بلند کی۔ آج برصغیر کی مساجد میں اذانین اور مدارس میں قرآن وحدیث کے درس شیخ احمد سرہندی کے مرہوں منت ہیں۔ "عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ" میں ڈاکٹر زبیر احمد لکھتے ہیں:

"سولہویں صدی کے مسلم برصغیر کی ثقافتی رویے کے خلاف راسخ الاعتقادی کے احیاء کے لیے جس دانشور نے نمایاں ترین کامیابی حاصل کی وہ شیخ احمد سرہندی ہیں۔ جنہیں اسلامی تصوف کا مصلح اعظم اور برصغیر پاک وہند کا عظیم ترین ولی قرار دیا گیا"[4]

شیخ احمد سرہندی نے اپنی تمام تر اصلاحی کوششیں طبقہ اشرافیہ اور حکمران اعلیٰ کی اصطلاح پر مرکوز رکھی تھیں۔ امراء کے علاوہ انہوں نے شاہی افواج میں اپنے افکار کی اشاعت پر خاصی توجہ دی۔ شیخ سرہندی نے اپنے زمانے کی آزاد خیالی کے اہم عنصر آلاہ پرستی کے رجحان کے خلاف پیغمبر کے مقام کو بحال کرنے کی کوشش کی۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے رسالہ اثبات النبوۃ لکھا جو ایک مختصر تحریر ہے۔ اس میں یہ کوشش نظر آتی ہے اس میں عقل پر وحی کی برتری کو ثابت کرنے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اثبات میں روایتی دلائل دیئے گئے اور نبوت کے مفہوم اور معجزات کی ماہیت کے مسئلہ کو زیر بحث لایا گیا۔

ان کی دعوت و تبلیغ کے اثرات جہانگیر (1569-1627) کے دور حکومت میں ظاہر ہوئے جب فتنہ پورے عروج پر تھا۔ اس وقت وہ پوری جرات سے میدان میں آئے اور بدعات اور منکرات کے خلاف آواز بلند کی۔

---

1 **مکتوبات امام ربانی**، دفتر، اول، مکتوب نمبر 65، ص 82
"امروز وجود شریعت شمار مغتنم مے شریم ومبارز در میں معرکہ ضعیف وشکست خوردہ جز شمار انے وانیم حق تعالی سبحانہ موید وناصر"
2 **مکتوبات امام ربانی**، دفتر، اول، مکتوب نمبر 95، ص 114
"محمد بندہ ایست محمد ود ومتناہی واو تعالی نقدس غیر محد واست ونامتناہی"
3 دفتر سوم "معرفت الحقائق" یہ خطوط ہیں: رود کوثر، ص 367
4 زبیر احمد، ڈاکٹر، **عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ**، (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور: 1991ء) ص 325

شروع میں تو حکومت نے سختی نہ کی لیکن جب کلمہ حق واشگاف بلند ہوا تو یہ بات حکومت کو ناگوار گزری اور انہیں دربار میں طلب کیا گیا۔ وہاں انہوں نے با آواز بلند کہا۔ ایک مؤاحد یہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کو سجدہ کرے۔

اس مزاحمت کے بدلے میں ان کو گوالیار میں بند کر دیا گیا لیکن وہاں بھی آپ نے اپنا کام جاری رکھا دیکھتے ہی دیکھتے قید خانے کی کایا پلٹ گئی۔ حکومت کو اپنی غلطی کا بھرپور احساس ہوا اور بادشاہ اورنگزیب نے ان کا دربار میں بھرپور استقبال کیا۔ آپ نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور دور اکبری کی منکرات کی منسوخی عمل میں لائی گئی۔ مجدد الف ثانی نے جن اہم کاموں کی طرف خاص طور پر توجہ دی وہ درج ذیل ہیں:

1۔ آپ نے سب سے پہلے ارکان حکومت کی اصلاح کی طرف توجہ کی۔ کہ اگر ان کے دلوں میں دعوت حق جگہ پیدا کرلے تو عوام کا مائل ہو جانا مشکل نہیں اور اس سے میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔

2۔ دوسری بات جو توجہ طلب رہی وہ یہ کہ انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام پر اس دور میں جو مصائب اور مشکلات آرہی ہیں وہ علمائے وقت کی کمزوریوں اور نااہلی کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے ان کی پردہ دری میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور اس کے بڑے مفید نتائج حاصل ہوئے۔

3۔ اس زمانے کے صوفیاء اکثر و بیشتر ویدانت کے فلسفے، جوگیوں اور برہمنوں کی ریاضتوں سے متاثر تھے احمد سرہندی نے اس اسلوب کا رد کیا۔[1]

ان بنیادوں پہ دیکھا جائے تو مجدد الف ثانی کی شخصیت، اپنے دور میں سب سے نمایاں اہمیت کی حامل ہے۔ جنہوں نے اسلامی ہند کے فکر ارتقاء میں واضح کردار ادا کیا۔ اور ایک نئی جہت کی طرف رخ موڑا۔ یہ باتیں انہیں فکری ارتقاء کے حوالے سے نمایاں مقام عطا کرتی ہیں اور برصغیر میں احیائے دین کے دیگر رہنماؤں سے ممتاز کرتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ (1703ء–1762ء) کا تجدیدی کارنامہ

اسلامی تاریخ میں ہر صدی میں ایسے مجددین پیدا ہوئے جنہوں نے دینِ اسلام کو وقت کے تقاضوں کے مطابق پیش کیا، امت کی رہنمائی کی اور گمراہی و غفلت کے اندھیروں میں چراغ بنے۔ اسلامی تاریخ میں تجدید دین کا تصور نہایت اہمیت کا حامل رہا ہے۔ ہر دور میں ایسے مجددین پیدا ہوئے جنہوں نے امت مسلمہ کی فکری، عملی اور روحانی رہنمائی کی۔

برصغیر کے اٹھارہویں صدی کے عظیم عالم، مجدد اور مصلح شاہ ولی اللہ دہلویؒ (1703ء - 1762ء) اسی سلسلے کی ایک روشن کڑی ہیں۔ آپ نے ایک ایسے دور میں تجدید دین کا فریضہ انجام دیا جب مغلیہ سلطنت سیاسی

---

1 ندوی، مسعود عالم، **برصغیر ہند و پاکستان میں اسلامی تحریک کی تاریخ** (اسلامک پبلیشرز، لاہور: 1972ء) ص 13-14

انتشار اور اخلاقی زوال کا شکار تھی۔ فکری انتشار عام تھا، فرقہ واریت عروج پر تھی، اور مسلمانوں کی دینی و معاشرتی حالت روز بروز کمزور ہو رہی تھی۔ جہالت، بدعات اور مغربی فکری یلغار نے دین کے خالص تصور کو دھندلا دیا تھا۔ ایسے میں شاہ صاحب نے دین اسلام کے تمام پہلوؤں پر تجدیدی نگاہ ڈالی اور امت کو اصل تعلیمات کی طرف رجوع کی دعوت دی۔

وہ بیک وقت حکیم و متکلم بھی تھے، مفسر و محدث اور مجتہد فقیہ بھی۔ علم تصوف پر ان کی گہری نظر تھی اور ایک عالم نفسیات کی طرح وہ انسانی نفس کی باریکیوں سے واقف تھے۔ عملاً وہ ایک صاحب مرتاض صوفی اور صاحب مسند وارشاد بزرگ تھے۔ ان دینی علوم کے ساتھ ساتھ "حکمت عملی" رجسے آج عمرانیات کہا جاتا ہے، انہیں پورا عبور حاصل تھا۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنی کتابوں میں اجتماعی، معاشی، تاریخی اور سیاسی مسائل پر بڑی تفصیل سے بحثیں کی ہیں[1]۔ لہٰذا، حضرت شاہ ولی اللہ کا تجدیدکام جامع نوعیت کا ہے، جس کے برابر کسی اور ک کام کو لانا بہت مشکل ہے۔

قرآن وسنت کی طرف رجوع

شاہ ولی اللہؒ نے تجدید دین کا آغاز امت کو قرآن و سنت کی طرف واپس لانے سے کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے زوال کا ایک بڑا سبب کتاب و سنت سے دوری ہے۔ انہوں نے نہ صرف قرآن کا فارسی ترجمہ کیا بلکہ اس کی حکمتوں پر بھی مفصل کلام کیا۔ وہ قرآن کو صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایک ایسا زندہ ضابطۂ حیات جانتے تھے جس سے دوری امت کو فکری، روحانی اور سیاسی زوال کی طرف لے جاتی ہے۔ ان کے نزدیک تجدید دین کا پہلا قدم قرآن کی تعلیمات کو عوام کے لیے قابلِ فہم بنانا ہے۔

شاہ ولی اللہ نے خود درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو اس زمانے کے عام رواج کے خلاف قرآن مجید کی تعلیم پر زور دیا۔ قرآن مجید کا ترجمہ فارسی میں **فتح الرحمٰن** کے نام سے کیا اور فہم قرآن کی تحریک میں آپ نے علم تفسیر میں معروف کتاب "**الفوزالکبیر فی اصول التفسیر**" تصنیف کی جس سے فہم قرآن کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ نے امت کو فقہی اور مسلکی اختلافات سے نکالنے کی سعی کی۔ وہ نہ تو صرف اہلِ حدیث کی طرح روایت پر اصرار کرتے تھے اور نہ ہی صرف قیاس پر۔ ان کا رجحان اعتدال کی طرف تھا۔ ان کے خیال میں اختلافاتِ فقہیہ میں اصل کا تعین کر کے امت کو ایک اصولی راہ پر لانا ضروری ہے۔ شاہ صاحب فقہی اختلافات کو امت کی وحدت کے خلاف نہیں سمجھتے، لیکن وہ ان اختلافات کو اصولی بنیادوں پر پرکھنے اور امت کے لیے آسانی پیدا کرنے کے قائل تھے۔ ان کی علمی گہرائی نے انہیں مذاہب اربعہ کو سمجھنے اور ان کے درمیان توازن قائم کرنے کی صلاحیت

---

1 محمد سرور، پروفیسر، **ارمغان شاہ ولی اللہ**، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور 2015، ص2 (پیش لفظ)

عطا کی۔

علم حدیث سب سے اہم مقصد معرفت حدیث کا فن ہے۔ تجدید و اصلاح فکر اسلامی کے علمبردار کا یہ کام بنیادی نوعیت کا ہے کہ وہ اس علم کی اہمیت اور وسعت سے آگاہ ہو اور ان حکمتوں سے بھی واقف ہو جو فکر اسلامی کی تشکیل و تجدید میں حدیث اور علوم حدیث کو حاصل ہے۔ اسی بنا پر حضرت شاہ ولی اللہ بحیثیت محدث مشہور ہوئے، اس سلسلہ میں آپ کی کتاب **حجۃ اللہ البالغہ** غیر معمولی تصنیف ہے، جو احکام دین کی حکمتوں سے مالا مال کر دینے والا خزانہ ہے، اس کی حیثیت فکر اسلامی کی تشکیل میں بنیادی ذریعہ کی ہے۔ اغر غور سے پڑھا جائے تو اس کتاب میں ایک امتیازی وصف یہ بھی نظر آتا ہے کہ جہاں وہ رفاہ عام کے اداروں یعنی ارتفاقات کا ذکر کرتے ہیں، وہاں حکمت عملی کو پیش نظر رکھتے ہوئے، تمام احادیث کو انہیں ابواب پر تقسیم کر دیتے ہیں۔ اور پھر خاص خاص موقعوں پر حدیث کی ذیل میں حکمت عملی کا کوئی نہ کوئی نقطہ ذکر کر دیتے ہیں[1]۔ یہ نقات فکر اسلامی کی تجدید کے بنیادی عناصر کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔

حدیث نبوی کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ نے اس کے علم کے فروغ کے لیے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ شاہ ولی اللہ نے مستند احادیث کے مجموعوں کی تدوین و تشریح میں اپنا حصہ ڈالا اور ان کے فہم کو اصول فقہ کے مسلمہ قواعد کے مطابق بنانے کی سعی کی۔ ان کا یہ پختہ یقین تھا کہ سنت نبویؐ دراصل قرآن مجید کی عملی شرح و وضاحت ہے اور اس کے بغیر دین کی مکمل اور صحیح تفہیم کسی بھی صورت میں ممکن نہیں ہے۔ ان کے نزدیک، حدیث صرف تاریخی روایات کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ نبویؐ زندگی کا عملی نمونہ ہے جس کی پیروی ہر مسلمان کے لیے لازم ہے۔

فکر اسلامی کی تشکیل و تجدید

فکر اسلامی میں شاہ ولی اللہ کا ایک اور نمایاں تجدیدی پہلو مختلف اسلامی علوم کے مابین ایک منطقی اور مربوط ربط پیدا کرنے کی ان کی انتھک کوشش ہے۔ دین کی حکمت کی عمدہ وضاحت کا نمونہ حجۃ اللہ البالغہ کی صورت میں پیش کیا۔ اور انہوں نے فقہ، تصوف، اور علم الکلام جیسے مختلف شعبوں میں پائے جانے والے ظاہری اختلافات کو دور کرنے اور ان کو ایک جامع وحدت میں سمونے کی وکالت کی۔ ان کا یہ گہرا ادراک تھا کہ یہ تمام علوم در حقیقت ایک ہی عالمگیر حقیقت کے مختلف پہلو ہیں اور ان کے درمیان کسی قسم کا حقیقی تصادم موجود نہیں ہونا چاہیے۔

انسانی فکر کی تشکیل و تجدید کے سلسلہ میں شاہ صاحب کی طرف سے **تکمیلی ملکات** کی بحث بہت اہم ہے۔ ان کے خیال میں پہلی بات تو یہ ہے کہ مطالعہ و تجربہ اور تعلیم و تدریس کے ذریعے جو علم حاصل ہو اس ے عقل و خرد سے اس طرح ترتیب و ربط میں لانا کہ تضاد اور تزاہم باقی نہ رہے۔ ذہن کی تشکیل و انضباط کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ

---

1 عبید اللہ، سندھی، مولانا، **شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ**، سندھ ساگر اکادی، لاہور: 2008ء، ص 31

انسان وجدان کی وہبی قوتوں کو کام میں لا کر، چشم بصیرت سے تدابیر الٰہی کی حکمتوں کو سمجھے۔ تکمیلی مرحلہ یہ ہے کہ عقل و وجدان کی مدد سے قرآن حکیم سے استفادہ کرے اور ان حقائق پر غور کرے جن کی بنیاد پر انقلابات عالم واقع ہوتے ہیں۔ یہ درجہ رسوخ فی العلم کا ہے۔

فکر اسلامی کی تجدید میں ایسی تحریک از بس لازم ہے: قرآن کی تعلیمات پر غور کرنا، ان سے زندگی کے لیے شاہراہ ہدایت ڈھونڈنا، پھر ان کی نشر و اشاعت کے لیے تعلیم گاہ بنانا اور اس میں راسخین فی العلم کی جماعت تیار کرنا[1]۔ یہ وہ لائحہ عمل ہے جو اسلامی نظریہ حیات کی بنیاد پر فکر انسانی کی تیاری کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

ان کی مشہور کتاب **ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء** اس نقطہ نظر کی بہترین مثال ہے۔ اس میں انہوں نے خلفائے راشدین کے عہد زریں کا تجزیہ کرتے ہوئے نہ صرف ان کے سیاسی کردار پر روشنی ڈالی ہے بلکہ ان کے روحانی اور اخلاقی فضائل کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے، جس سے ان کے نزدیک دین کے ایک ہمہ گیر تصور کی عکاسی ہوتی ہے۔ شاہ ولی اللہ نے مسلم معاشرے میں اتحاد و یکجہتی کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور اس کے حصول کے لیے عملی اقدامات تجویز کیے۔

انہوں نے فقہی مسالک کے درمیان پائے جانے والے اختلافات کو محض اجتہادی آراء کے فرق کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے ایک وسیع تر اسلامی اخوت کے تصور کو فروغ دینے پر زور دیا۔ ان کا یہ استدلال تھا کہ اگرچہ جزوی مسائل میں اختلاف رائے کی گنجائش موجود ہے، لیکن مسلمانوں کو بنیادی عقائد اور اصولوں پر متحد رہنا چاہیے اور ہر قسم کی فرقہ واریت اور گروہ بندی سے سختی سے اجتناب کرنا چاہیے۔

اس سلسلے میں ان کی گراں قدر تصنیف **عقد الجید فی احکام الاجتہاد و التقلید** اجتہاد کی شرعی حیثیت اور تقلید کی حدود کا واضح تعین کرتی ہے، جس کا بنیادی مقصد فقہی اختلافات کو تعصب کی بجائے علمی بحث و تمحیص کے دائرے میں رکھنا تھا۔

شاہ ولی اللہ کے تجدیدی فکر کا سنگ بنیاد قرآن و حدیث کی مرکزی حیثیت پر ان کا غیر متزلزل ایمان اور ان کی تعلیمات پر گہرا زور تھا۔ انہوں نے اس بات کو واضح طور پر بیان کیا کہ اسلامی فکر کی تمام تر عمارت انہی دو لافانی سرچشموں پر استوار ہونی چاہیے اور ان کی تفہیم کسی بھی قسم کی ذاتی رائے یا تقلیدی جمود سے پاک ہونی چاہیے۔

عوام الناس کی سہولت کے لیے انہوں نے قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا، جس کا مقصد عام مسلمانوں کو براہ راست کلام الٰہی سے جوڑنا اور علماء کی روایتی تشریحات پر انحصار کو کم کرنا تھا۔ اس اقدام کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ فارسی برصغیر کے مسلمانوں کی علمی و ادبی زبان تھی اور اس ترجمے نے

---

1 عبید اللہ، سندھی، مولانا، **شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ**، ص 43

قرآن کے پیغام کو ایک وسیع طبقے تک پہنچانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اپنی شہرہ آفاق تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں وہ بیان کرتے ہیں کہ تمام علوم کا مدار کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے۔ جو شخص ان دو اصلوں سے منہ پھیرے گا وہ گمراہ ہو جائے گا۔

شاہ ولی اللہ نے نہایت واضح اور دوٹوک انداز میں قرآن و سنت کو تمام اسلامی علوم کا ماخذ قرار دینے پر یہ زور نہ صرف علمی حلقوں کے لیے ایک رہنما اصول کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ عام مسلمانوں کو بھی براہ راست ان بنیادی ماخذوں سے جڑنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ان کا یہ موقف تقلیدی جمود کو توڑنے اور اجتہاد کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی طرف ایک اہم قدم ہے۔

شاہ ولی اللہ نے صوفیاء کے طرزِ عمل اور نظریات پر تنقیدی نظر ڈالی، اور تصوف کو شریعت کے تابع کرنے کی کوشش کی۔ ان کے نزدیک اصل تصوف وہی ہے جو روحانیت کے ساتھ شریعت کی پاسداری بھی کرے۔ تصوف، شریعت کے بغیر ایک بے روح جسم کی مانند ہے۔ یہ بات اس دور کے صوفیانہ مزاج پر ایک اصلاحی وار تھی۔ شاہ صاحب کا موقف یہ تھا کہ وہ تصوف جو شریعت سے منحرف ہو، وہ حقیقی تصوف نہیں بلکہ بدعت ہے۔ انہوں نے روحانی تربیت کو دین کا حصہ ضرور مانا، لیکن اسے شریعت سے آزاد ہرگز نہیں سمجھا۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فکر اسلامی میں جو تجدیدی کارنامے سر انجام دیے، وہ آج بھی اہل علم اور امت مسلمہ کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ انہوں نے دین کو محض ظاہری رسومات سے نکال کر علم، عمل، عدل، حکمت، اور روحانیت کے جامع نظام میں ڈھالا۔ ان کی علمی خدمات نے نہ صرف برصغیر بلکہ پورے عالم اسلام کو متاثر کیا۔

عدل اجتماعی کے لیے فکری نظام

شاہ ولی اللہؒ کی فکر میں اقتصادی عدل کو اسلامی معاشرے کا لازمی جزو تصور کیا گیا۔ انہوں نے اپنے دور کے ظالمانہ اور طبقاتی معاشی نظام پر تنقید کرتے ہوئے اسلامی اصولوں پر مبنی معیشت کی تشکیل پر زور دیا۔ شاہ صاحب کا تصور دین صرف عبادات تک محدود نہیں تھا، بلکہ وہ دین کو ایک مکمل نظامِ حیات سمجھتے تھے جس میں عدل، مساوات اور انسانی فلاح مرکزی اہمیت رکھتے ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ نے زوال پذیر مغلیہ سلطنت کا مشاہدہ کرتے ہوئے اسلامی سیاسیات میں اصلاح کی ضرورت پر زور دیا۔ ان کے نزدیک ریاست کا مقصد شریعت کا نفاذ اور عوام کی فلاح ہے۔ وہ حکمرانوں کو محض طاقتور افراد نہیں بلکہ عدل و انصاف کے محافظ کے طور پر دیکھتے تھے۔ ان کی سیاسی فکر آئندہ تحریکاتِ آزادی اور اسلامی نظام کے قیام کی بنیاد بنی۔

برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی و سماجی انحطاط پر شاہ ولی اللہ نے اپنی گہری تشویش کا بارہا اظہار کیا۔ انہوں نے اس المناک صورتحال کا باریک بینی سے تجزیہ کرتے ہوئے اس کے بنیادی اسباب میں اخلاقی پستی، علمی بے راہ

روی، اور سیاسی انتشار کو کلیدی عناصر کے طور پر شناخت کیا۔ انہوں نے حکمرانوں کو عدل و انصاف کے قیام کی پرزور تلقین کی اور عام لوگوں کو اسلامی اخلاقیات پر سختی سے کاربند رہنے کی دعوت دی۔

ان کے نزدیک ایک مثالی اور فلاحی معاشرے کی تشکیل کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ حکمران شریعت اسلامی کے مطابق اپنی حکومت چلائیں اور رعایا اپنے تمام فرائض کو ایمانداری اور دیانت داری کے ساتھ انجام دے۔ ان کے سیاسی افکار ان کی مختلف تحریروں میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں، جہاں وہ ایک ایسی مثالی اسلامی ریاست کے بنیادی خدوخال بیان کرتے ہیں جو عدل، مساوات، اور شورائیت کے اصولوں پر مبنی ہو۔

شاہ ولی اللہ نے معیشت اور معاشرت کے حوالے سے بھی اہم اصلاحی نظریات پیش کیے۔ انہوں نے سود کی حرمت اور عادلانہ معاشی نظام کی ضرورت پر زور دیا۔ اسی طرح، انہوں نے معاشرے میں طبقاتی امتیاز اور ظلم و ستم کے خاتمے کی وکالت کی اور ایک ایسے معاشرے کے قیام پر زور دیا جہاں تمام افراد کو یکساں حقوق حاصل ہوں اور کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔

شاہ ولی اللہ کا فکری کام فکر اسلامی کی تاریخ میں ایک انقلاب آفرین باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف ماضی کے عظیم علمی ورثے کو ایک نئی فکری بصیرت کے ساتھ پیش کیا۔ انہوں نے مستقبل کے لیے ایک ایسا روشن فکری راستہ بھی استوار کیا جو قرآن و سنت کی مضبوط بنیادوں پر قائم، عقلیت پسندی پر مبنی، اور ہر دور کے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔

ان کی لازوال تعلیمات نے برصغیر کے مسلمانوں کی دینی اور سیاسی بیداری میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کیا اور ان کے گہرے اثرات آج بھی اسلامی دنیا کے فکری منظرنامے پر نمایاں طور پر محسوس کیے جاتے ہیں۔ وہ بلاشبہ ایک ایسے عظیم مصلح اور مفکر تھے جنہوں نے آنے والی نسلوں کے لیے علم و حکمت کا ایک گرانقدر خزانہ چھوڑا۔ شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کی بھی بھرپور کوشش کی۔ انہوں نے مختلف فقہی مسالک کے درمیان موجود اختلافات کو اجتہادی بنیادوں پر حل کرنے اور ایک وسیع تر اسلامی اخوت کے تصور کو فروغ دینے پر زور دیا۔

اس ضمن میں ان کی تصنیف عقد الجید فی احکام الاجتہاد و التقلید اجتہاد کی اہمیت اور تقلید کی حدود کا تعین کرتی ہے، جس کا مقصد فقہی اختلافات کو تعصب کی بجائے علمی بحث و تمحیص کے دائرے میں رکھنا تھا۔ برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی و سماجی انحطاط پر شاہ ولی اللہ نے گہری تشویش کا اظہار کیا۔ انہوں نے اس صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے اسباب میں اخلاقی زوال، علمی پسماندگی، اور سیاسی انتشار کو اہم قرار دیا۔ انہوں نے حکمرانوں کو عدل و انصاف کی تلقین کی اور عام لوگوں کو اخلاقی اقدار پر کاربند رہنے کی دعوت دی۔ ان کے نزدیک ایک صالح معاشرے کی تشکیل کے لیے ضروری ہے کہ حکمران شریعت کے مطابق حکومت کریں اور رعایا اپنے فرائض کو ایمانداری سے

انجام دے۔ ان کے سیاسی افکار ان کی مختلف تحریروں میں بکھرے ہوئے ہیں، جہاں وہ ایک مثالی اسلامی ریاست کے خدوخال بیان کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ کے تجدید کام کی نوعیت و وسعت

مجموعی طور پر، شاہ ولی اللہ کے فکری کام فکر اسلامی کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف ماضی کے علمی ورثے کو نئی بصیرت کے ساتھ پیش کیا بلکہ مستقبل کے لیے ایک ایسا فکری راستہ بھی ہموار کیا جو قرآن و سنت کی بنیادوں پر استوار، عقلیت پسندانہ، اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔ ان کی تعلیمات نے برصغیر کے مسلمانوں کی دینی و سیاسی بیداری میں اہم کردار ادا کیا اور ان کے اثرات آج بھی محسوس کیے جاتے ہیں۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں برصغیر پاک و ہند کے علمی افق پر شاہ ولی اللہ دہلوی ایک ایسی تابندہ ستارے کی مانند نمودار ہوئے جس نے فکر اسلامی کی کائنات کو اپنی تجدیدی کرنوں سے منور کر دیا۔ آپ محض ایک عالم دین نہ تھے، بلکہ ایک جامع شخصیت کے مالک تھے جنہوں نے مصلح، مفکر، اور سماجی رہنما کے طور پر اپنے دور کے فکری جمود کو چیلنج کیا اور اسلامی علوم کی تفہیم و اطلاق کے لیے ایک بالکل نیا دائرہ کار پیش کیا۔ ان کا تجدیدی عمل صرف سطحی اصلاحات تک محدود نہیں تھا، بلکہ اس کا مقصد قرآن و سنت کی اصل روح کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا، مسلم معاشرے میں اتحاد کی فضا پیدا کرنا، اور ان کے زوال پذیر سیاسی و سماجی حالات کا مؤثر مقابلہ کرنا تھا۔

شاہ ولی اللہ دہلوی (1703-1762) جو موجودہ دور اور قرون وسطی کے ہندوستانی اسلام کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی کی وفات کے بعد اور عالمگیر بادشاہ کی وفات سے چار سال پہلے 1703 ء میں نواحی دہلی میں پیدا ہوئے۔ ایک طرف ان کا زمانہ اور ماحول کو اور دوسری طرف ان کے کام کو جب آدمی دیکھتا ہے تو انسانی عقل حیران رہ جاتی ہے۔ کہ اس دور میں اس خیالات اور اس نظر و ذہنیت کا مالک انسان کیسے پیدا ہو گیا۔ فرخ سیر، محمد شاہ رنگیلے اور شاہ عالم کے ہندوستان کو کون نہیں جانتا اس تاریک و تنگ زمانہ میں نشو و نما پا کر پل بڑھ کر ایک آزاد مفکر منظر عام پر آتا ہے۔ جو زمانہ اور ماحول کی ساری بندشوں سے آزاد ہو کر سوچتا ہے۔ جو صدیوں کے تعصبات اور تقلیدی علم کے راستہ کو چھوڑ کر زندگی کے ہر مسئلہ پر محققانہ اور مجتہدانہ نگاہ ڈالتا ہے۔

مولانا مودودی لکھتے ہیں:

> "شاہ صاحب تاریخ انسانی کے لیڈروں میں سے ہیں جو خیالات کے الجھے ہوئے جنگل کو صاف کر کے فکر و نظر کی ایک سیدھی شاہ راہ بناتے ہیں اور ذہن کی دنیا میں حالات موجودہ کے خلاف ایسی بے چینی اور تعمیر نو کا ایسا دل آویز نقشہ پیدا کرتے چلے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ناگزیر طور پر تخریب فاسد و تعمیر صالح اللہ کے لیے تحریک اٹھتی ہے۔ اس قسم کے لیڈر اپنے خیالات کے

مطابق کوئی تحریک اٹھاتے ہوں تاریخ میں اس کی مثالیں کم ملتی ہیں"۔[1]

اٹھارہویں صدی مسلمانان برصغیر کے انحطاط کا دور ہے۔ جب گمراہ کن نظریات بام عروج پر تھے۔ لیکن اسی زمانہ میں شاہ ولی اللہ کی معقولیت اور اعتدال پسندی نے برصغیر کی معاشرت، اخلاقیات اور تعلیم پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ آپ نے مذہبی افکار میں دین اسلام کو احیاء بخشا تصوف اور علم کے امتزاج سے باعمل علما و اور مجاہد تیار ہوئے۔ اور زوال پذیر مسلم معاشرے میں اصلاح کو ممکن بنایا۔

شاہ ولی اللہ کے اصلاحی افکار میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ آپ نے برصغیر کے مسلمانوں کے عقائد کی اصلاح پر زور دیا۔ کیونکہ ہندوستان پر ہزاروں سال ایسے فلسفیانہ مذہب کی حکمرانی رہی جس سے ان لوگوں میں مشرکانہ عقائد اور رسوم پیدا ہو گئیں۔ اہل قبور سے مدد مانگی جانے لگی، اہل کفر کے تہواروں اور ان کی رسوم وعادات کی تقلید ہونے لگی، بزرگوں کے نام پر قربانی دی جانے لگی، ہندوؤں کی رسومات مسلمانوں میں سرائیت کر گئیں تھیں۔

شاہ ولی اللہ نے اس مرض کا علاج قرآن مجید کا مطالعہ اور فہم کو قرار دیا۔ سرکاری زبان فارسی ہونے کی وجہ سے عام مسلمان قرآنی مطالب سمجھنے سے قاصر تھے۔ شاہ ولی اللہ نے اللہ کے کلام کو عام فہم بنانے کے لیے قرآن کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔ مظہر انصاری لکھتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ نے اللہ کے کلام کو آسان اور عام فہم بنانے کے لیے قرآن کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا اور اس ترجمہ کا نام فتح الرحمن رکھا۔[2]

اس ضمن میں لوگ آپ کے مخالف ہو گئے۔ اور آپ پر کفر کہ فتوے لگائے گئے۔ آپ نے اپنی علم فہمی اور بصیرت سے ایسا انقلابی ترجمہ کیا جس سے لوگوں کے لئے قرآن کا سمجھنا آسان ہو گیا۔ اصلاح عقائد اور فہم قرآن ہے آپ کی ایک اور کوشش "الفوز الکبیر" ہے، یہ کتاب مختصر مگر سراپائے علم ہے۔ اس کے مقدمہ میں شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

> "فقیر ولی اللہ بن عبدالرحیم کہتا ہے کہ جب اللہ نے اس فقیر پر کتاب اللہ کے فہم کا دروازہ کھولا تو اس کی خواہش ہوئی کہ بعض نکات اور مفید رسالہ میں لکھ دیے جائیں امید ہے اللہ کے کرم سے طالب علموں کے لیے ان قوائد کے فہم کے بعد قرآن کے مطالعے کو سمجھ کی راہ کشادہ مل جائے گی"۔[3]

---

1 مودودی، سید ابوالاعلی، **تجدید احیائے دین**، ص68

2 انصاری، مظہر، دہلوی، **شاہ ولی اللہ**، (فیروز سنز لمیٹیڈ، لاہور، 1985ء)، ص40

3 شاہ ولی اللہ، **الفوز الکبیر فی اصول التفسیر مع فتح الخبیر** (مقدمہ، سنگ میل، لاہور، 1383ھ)

"دور فہم معانی کتاب اللہ گردو کہ اگر عمرے در مطالعہ تفاسیر باگذراندن آنھا بر مفسران علی انھم اقل قیل فی ھذا الزمان بسر بر قدبان ضبط و ربط بدست نیارند"

آپ نے اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا جس میں قرآن نے جس فرقوں کی تردید کی ہے۔ اصلی عقائد، فہم قرآن میں دشواریوں کے اسباب، فنون تفسیر اور قرآن حکیم کا انوکھے اور دلکش اسلوب کو بیان کیا۔

آپ نے اپنی توجہ ان عوامل کی طرف مبذول کی جو مسلم معاشرہ کے زوال میں کار فرما ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اکٹھا رہنے سے جو ہندوانہ رسوم مسلم معاشرہ میں رواج پا گئی تھیں ان کے خاتمہ کی بھرپور کوشش کی۔ ہندو معاشرہ میں بیوہ کے نکاح کو معیوب سمجھتے تھے۔ آپ نے اس رسم کے خاتمہ کی تحریک چلائی۔ آپ نے فروعات اور شعبدہ بازوں سے بچنے کی تلقین کی۔

احسان الحق لکھتے ہیں:

"شاہ ولی اللہ نے صوفیا اور مشائخ کی سرزنش کی، وہ حجروں میں بیٹھ کر پیری مریدی کرنے اور نذرانے وصول کرنے کی بجائے باعمل زندگی گزاریں۔ حلال رزق کمائیں تاکہ ایک صالح معاشرہ وجود میں آئے جو احیائے دین کا باعث ہے"۔[1]

شاہ ولی اللہ نے نصاب کے مقاصد کا تعین کیا جو طلبا میں خود سوچنے کی عادت ڈالے اور ذہنی جمود کو توڑے۔ کیونکہ تعلیم کا مقصد انسان کے فطری ادراک کی تربیت کرنا ہے۔ تاکہ وہ معرفت الٰہی حاصل کر سکے۔ شاہ ولی اللہ نے نظامِ شریعت، احکام قوانین اور عبادات پیش کر کے ہر ہر ایک کی حکمت سمجھائی انہوں سلامی تعلیمات کو عقلی بنیادیں فراہم کیں۔ آپ غیر اسلامی فلسفہ زندگی سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔ قمر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

"شاہ ولی نے اسلامی فلسفہ حیات کو اپنے رنگ میں پیش کیا اور اِس کے لئے وہ تمام بنیادیں فراہم کیں جو اس کو بر تر ثابت کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ اس کے علاوہ شاہ ولی اللہ نے اسرار دین کو کر کے جو گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں اور اسلامی تعلیمات کی حکمتوں کو حکیمانہ انداز میں دلیل و برہان کے ساتھ پیش کیا یہ صرف ان ہی کا حصہ ہے"۔[2]

شاہ ولی اللہ ہر زمانہ میں اجتہاد کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کا دائرہ عمل بے حد وسیع ہے۔ آپ اخلاقی تعلیم کے لیے مذہبی تعلیم کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ مذہب طلبا کے اخلاق کی تکمیل کرتا ہے۔ آپ نے رضائے الٰہی کے حصول جدت پسندی اور صالح نظام حیات کے لئے ساری زندگی کوشش کی۔ اور معتدلانہ فضا کو قائم کیا۔

ہر زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے نئے مادی علوم سے پیدا شدہ شبہات اور اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش اور فلسفیانہ جہات کا مثبت انداز میں جواب دیا۔ اور افراد کو اسلامی شریعت اور اسلامی عقائد

---

1 اختر، احسان الحق، **حضرت شاہ ولی اللہ**، (سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور)، س۔ن، ص 167

2 عثانی، قمر احمد، **امام راشد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی**، (فیروز سنز لمیٹیڈ، لاہور، 1995ء)، ص 20

کی حقانیت کو ذہن نشین کروانے کے لیے بھرپور خدمات سر انجام دیں۔ کسی زمانے میں یہ خدمات امام رازی، ابن رشد اور امام غزالی نے انجام دیں۔ اور کسی زمانے میں مولانا روم، عزالدین اور عبدالسلام ابن مسکویہ نے یہ ذمہ داری احسن طور پر نبھائی تو کسی دور میں امام ابن تیمیہ نے۔

خاص طور پر مجدد الف ثانی کے بعد سے برصغیر میں اسلام کی جو نشاۃ ثانیہ ہوئی اور پھر برابر ایسے علماء برصغیر کی سرزمین پر پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے زمانہ کے لحاظ سے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے قائل رہے اور ہمہ تن اس حوالہ سے کام کیا۔

باب چہارم: برصغیر میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی جہات

(انیسویں اور بیسویں صدی کا مطالعہ)

فصل اول: روایت پسند علماء کی تحاریک

فصل دوم: تجدد پسند مفکرین کے فکری رجحانات

فصل سوم: جدت پسند علماء و مفکرین کی تجدیدی کاوشیں

باب چہارم

برصغیر میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی جہات

(انیسویں اور بیسویں صدی کا مطالعہ)

تعارف باب

برصغیر پاک وہند کی تاریخ میں انیسویں صدی ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال اور برطانوی استعمار کے عروج نے مسلمانوں کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی ڈھانچے کو بنیادی طور پر متاثر کیا۔ اس دور میں مسلمان معاشرہ نہ صرف سیاسی اقتدار کے خاتمے کے صدمے سے دوچار تھا بلکہ فکری و نظریاتی چیلنجوں کا بھی سامنا تھا۔ ایک طرف مغربی تہذیب و تمدن کا غلبہ تھا تو دوسری طرف مسلم معاشرے کے اندر بدعات، خرافات اور جمود کا غلبہ تھا۔

اس پس منظر میں، برصغیر کے مسلمان مفکرین اور علماء نے اسلامی فکر کی تشکیل نو کی ضرورت محسوس کی۔ یہ تشکیل نو محض ایک رد عمل نہیں تھی بلکہ ایک مثبت اور تعمیری عمل تھا جس کا مقصد مسلمانوں کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا تھا۔ اس عمل میں مختلف فکری رجحانات نے جنم لیا جو بنیادی طور پر تین اہم دھاروں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں: ایک تو روایت پسندی کی بنیاد پر قائم، دوسرا جدت پسند کے رجحان پر گامزن اور تیسرا تجدید کی تحریک کا علمبردار۔

لہٰذا یہ باب تین اہم فصلوں پر مشتمل ہے:

فصل اول میں روایت پسند علماء اور تحریکات کے کام کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں سید احمد شہید، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا احمد رضا بریلوی اور مولانا محمود الحسن جیسی اہم شخصیات کے افکار و نظریات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

فصل دوم تجدد کی اہم جہات و رجحانات کا تفصیلی جائزہ پیش کرتی ہے۔ اس میں ان فکری و نظریاتی رجحانات کا تجزیہ کیا گیا ہے جو برصغیر کے مسلمانوں کی فکری تشکیل میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ یہ فصل خاص طور پر تجدد کے مختلف پہلوؤں، ان کے اثرات، اور ان کے نتائج پر روشنی ڈالتی ہے۔

فصل سوم جدت پسندی کی تحریک اور تجدیدی رجحانات پر مرکوز ہے۔ اس میں ان علماء و مفکرین کی فکری کاوشوں کا جائزہ لیا گیا ہے جنہوں نے عصری تقاضوں کے مطابق دینی تعلیمات کی نئی تعبیر پیش کی۔ یہ مفکرین مسلمانوں کو جدید علوم سے آشنا کرانے اور انہیں معاصر دور کے چیلنجوں کا سامنا کرنے کے قابل بنانے کے خواہاں تھے۔

فصل اول

روایت پسند علماء کی تحاریک

برصغیر میں مسلمانوں کی فکری تشکیل جدید کا آغاز ان علماء و مفکرین کی کاوشوں سے ہوا جنہوں نے ماضی کی روایت اور زمانے کی جدت کے درمیان توازن قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہ علماء تین فکری زاویے رکھتے تھے۔ ایک روایت پسند جو اسلامی افکار و اقدار کی حفاظت پر زور دیتے، دوسرے جدت کے حامی جو عصری تقاضوں کے ساتھ مطابقت کے خواہاں تھے، اور تیسرے دونوں کے درمیان راہ وسط کے طرفدار۔

برصغیر کے دور انحطاط میں جب اجتماعی زندگی کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھین لی گئی تو اس دور میں اس بات کی ضرورت اہل علم نے مجموعی طور پر محسوس کی کہ حفاظت دین کا ایک بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس علمی روایت کو محفوظ کیا جائے اور علمائے اسلاف سے جو کچھ پہنچا ہے اُسے اگلی نسل میں منتقل کیا جائے۔ ایسی شخصیات اور ان کی تحریکات کا تجزیہ آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

سید احمد شہید(1786ء-1831ء)اور ان کی تحریک مجاہدین

سید احمد شہید بریلوی صاحب موجودہ اُتر پردیش (انڈیا) کے رائے بریلی میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ شاہ عبد العزیز دہلوی کے مرید تھے اور مجاہدین تحریک کے بانی تھے۔ ایک طرف انہوں نے برصغیر کی امت مسلمہ کے معاشرتی حالات کی اصلاح کا کام کیا اور دوسری طرف انہوں نے برطانوی استعمار کے خلاف جہاد کا اعلان کیا تھا اور 1831 میں بالاکوٹ کی لڑائی میں شہید ہوئے۔

احیائے دین و تہذیب کی بات کی جائے تو شاہ ولی اللہ محدث دہلی اور عبد الحق محدث دہلوی کے بعد اگر کسی نے تجدید دین کے لئے اصلاحی کوششوں کو تسلسل دیا، تو سید احمد شہید کی شخصیت اس ضمن میں بہت واضح نظر آتی ہے۔

سید احمد بریلوی کی جماعت کا مقصد "نظام دعوت" تھا تاکہ غیر مسلم ہندوستان میں اسلام کی تطہر اور فکر کی بالیدگی کے لئے لیے تبلیغ کے مراکز کا جال بچھایا جاسکے۔ دیہاتوں کو اہم مرکز بنایا گیا۔ عوام میں تقاریر کے ذریعے مسلمانوں کی اخلاقی، سیاسی اور مذہبی حالت کو درست کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جس نے لوگوں کے ملی اور مذہبی جذبے کو ابھارااور انہیں شاندار ماضی کی یاد دلائی۔

اس تحریک کا بنیادی مقصد اصلاحی تھا۔ حالات اس تحریک کے موافق تھے، کیونکہ اس وقت مسلم معاشرہ کے ہر طبقے میں، خواہ اس کا تعلق کاشتکار سے ہو یا جاگیردار سے، بے چینی، ذہنی ہلچل اور انتشار پایا جاتا تھا۔ زندگی میں پیدا ہونے والی اس بے چینی نے انہیں پریشان اور فکر مند کر دیا تھا۔ سید احمد بریلوی نے اپنی تحریک کے مقاصد کی

وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ صرف ایک ہی صورت روحانی قوت اصلاح فکر ہی وہ طاقت ہے جس کے ذریعے برصغیر کے مسلمان ایک بار پھر اپنا وقار بحال کر سکتے ہیں۔ اور مادی وسائل کو حاصل کر سکتے ہیں۔

آپ کی اس کاوش اور اصلاح فکر کی اس ترغیب کو دیکھتے ہوئے وہ علماء جو علم و فضل میں آپ عالی مرتبہ تھے آپ کے حلقہ میں شامل ہو گئے اور یہ امید باندھی کہ یہی قوت ایک بار پھر مسلمان معاشرہ میں تبدیلی لے کر آئے گی۔ اصل میں اس تحریک کے نمایاں کام شاہ ولی تحریک کے مقاصد کو اجاگر کرنا تھا۔

> "سید احمد بریلوی کی تحریک دراصل شاہ ولی اللہ دہلوی کے پروگرام کو نظریہ سے عمل میں لانے کی شکل میں لانے، سوچ بچار کی زندگی کو سرگرم عمل زندگی میں بدلنے، فرد کی آزادی کی بجائے معاشرتی تنظیم اور منتخب اشرافیہ کی تعلیم و تربیت کی بجائے عوام کو آزادی فکر کی طرف مائل کیا۔"[1]

بدعات کے خلاف مزاحمت

سید احمد شہید نے ان بدعات کے خاتمے کی بھرپور کوشش کی جو برصغیر کے لوگوں کی زندگیوں کا حصہ بن چکی تھیں۔ اگر ان کی تقسیم مذہبی اخلاقی حالت میں کی جائے تو اس کا رنگ بہت واضح نظر آئے گا۔ جن کا ذکر "سیرت سید شہد" میں ابو الحسن ندوی نے کیا اور "موج کوثر" میں شیخ محمد اکرام نے بھی ان کی وضاحت کی ہے۔ اور ایسی کئی بد عات جو تصوف کے ذریعہ سے اسلام میں داخل ہو گئی تھیں۔ ان میں نماز و روزہ سے دوری اور قبروں پر جا کر مراد مانگنا تعویز باندھنا، سجدہ کرنا، مرشدی عزت و تکریم کرنا اولیا اللہ کے نام پر نذر و نیاز جس میں فضول خرچی واضح طور پر کی جاتی ہے۔

اور ایسی بدعات جو ایک دوسرے کی مخالفت میں شروع ہوئیں جیسے عزاداری، شادی بیاہ کی رسومات، چالیسواں کی روٹی کی تقسیم، بیوہ کی شادیوں کی ممانعت، تدفین و تکفین کی رسومات یہ سب وہ مذہبی اور اخلاقی بدعات تھیں۔ جن کو سید احمد کی کتاب صراط مستقیم میں بھی بیان کیا گیا۔ مسلمانوں نے رسول ﷺ کے طریقہ کار کو چھوڑ دیا تھا۔ سید شہید نے اس بات کی شد و مد سے وضاحت کی قوم کی کامیابی اسی میں ہے کہ ان تمام خرابیوں اور رسومات کو ترک کر دیا جائے۔

> ((تمامی رسوم ہندو سندھ و فارس وردم را کہ خلاف محمدؐ عربی باشد یا زیادتی از طریقہ صحابہ شود ترک نماید و انکار کراہت بران اظہار کند))[2]

---

1 ندوی، الوالحسن علی، **سیرت سید احمد شہید** (مجلس تحقیقات و نشریات اسلام: لکھنو، 1986ء)، ج2، ص185

2 سید اسماعیل، **صراط مستقیم**، دار کتب دیوبند: 1985ء) ص215

(ہر وہ رسم جو سندھ و فارس نے اختیار کی جو سنت نبوی یا طریقہ صحابہ کے مخالف ہے۔ جسے بعد میں جاری کیا گیا ترک کیا جائے، کیونکہ اسی میں نجات ہے)

رسول ﷺ کے معجزات میں سے ایک لافانی معجزہ یہ ہے کہ آپ کی تعلیمات اور فیض کا چشمہ کبھی بند نہیں ہو سکتا ہے۔

امت کی ضروریات بہت دیر تک جامد نہیں رہ سکتی ہیں۔ ہر زمانہ اور ہر جگہ اسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا رہا کہ اللہ کا دین زندہ ہے اور آپ کی تعلیمات کی پیروی جاری و ساری ہے۔ آپ کے پیروکار، صحابہ اکرام، سلف صالحین، مصلحین و مجددین، اساتذہ و تلامذہ کے مختلف طبقات دین کی خدمت پر مامور رہیں انہی میں سے مرد مجاہد سید احمد شہید ہیں۔ آپ نے اپنی تحریک کا آغاز دعوت و تبلیغ سے کیا سیرت رسول کسی کے فکری پہلوؤں پر نگاہ رکھی جائے تو پر واضح ہوتا ہے کہ آپ کے دنیا میں آنے کا سب سے واضح مقصد شریعت کا نفاذ ہے۔

آپ نے ہندوستان کے تین بڑے صوفیاء کے مکاتیب نقشبندی، قادری اور چشتی کو آپس میں ملانے اور باہم مربوط کرنے کا کام جاری رکھا۔ اور انہیں ایک سلسلہ میں آنے کی شامل ہونے کی دعوت دی۔ جسے انہوں "طریقہ محمدیہ" سے موسوم کیا انہوں نے ہر مسلمان کے جوش عمل اور سرگرمی کو اللہ کی محبت و عبادت کے تابع ہونا ضروری قرار دیا۔ اس انحطاطی دور میں انہوں نے صوفیا کے باطنی تجربے کے حصوں کو اکٹھا کیا۔ اور ایک فعال مصلح کے طور پر عقیدہ راسخ کے احیاء اور تشکیل نو پر لگایا۔

آپ نے تبحر علمی سے کام لیا اور اپنا دائرہ عمل عام مسلمان گروہوں سے جوڑ لیا۔ جن سے وہ ملاقاتیں کرتے تھے۔ خاص کر ایسے مسلمان جو برائے نام مسلمان تھے جنہوں چند سالوں پہلے اسلام قبول کیا تھا اور ان کی عبادات کے طریقے ہندوانہ تھے۔ ان میں برصغیر کے متضاد طبقوں کی ایک معقول تعداد جن میں امیر، غریب، جاہل و عالم سب شامل تھے انہوں نے اس زمانے کے مسلمانوں کی شکست و رحمت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا:

> "انیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستانی مسلمانوں کی اسلامی طرز کو محفوظ کرنے اور از سر نو تعمیر کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے جس میں بالخصوص قرآن اور سنت پر زیادہ زور دیا جاتا تھا اور سطحی و خارجی معقلانہ و خلاف شرع اعمال، انتخاب پسندی اتحاد مذاہب رجحانات کی پوری نفی کی جاتی تھی۔ وہ تمام رومی، فارسی، اور ہندوستانی رسومات جو رسول اللہ کی تعلیمات کے متناقص تھیں سب کی نفی کی گئی تھی۔"[1]

1 ندوی، ابوالحسن، **سیرت سید احمد شہید**، ص189

فکری اور عملی اصلاح کی تحریک

اگر اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی زندگی کی درست قوتوں کا استعمال اور اس کا مصرف درست نہ ہو تو شجاعت و دلیری اکثر حریفانہ مقابلوں اور کاموں میں ضائع ہو جاتی ہے۔ سید احمد شہید نے اپنی قوم اس بات کی دعوت دی کہ شجاعت و بہادری کا دیکھانے کا اصل میدان اور قوت کا درست استعمال برائی کے خلاف استعمال ہے۔ انہوں نے اس بات کو شدت محسوس کیا کہ مسلمانوں میں بہترین صلاحیتیں اور جوہر موجود تو ہیں لیکن جماعتی فقدان کے باعث وہ کارآمد نہیں۔ دینی فقدان کے باعث کوئی مفید حرکت نظر نہ آرہی تھی۔

درجہ بالا بحث کا مقصد ان پہلوؤں سے پردہ اٹھانا ہے۔ جو اس تحریک کے مقاصد کا حصہ اس تحریک کی تعبیر و تفہیم کے لیے یہ ضروری ہے ولی اللہی فکر سے جوڑا جائے۔ اور اس کی مکمل جامعیت کو زیر نظر رکھا جائے۔ جو ولی اللہی جماعت کا طرہ امتیاز رہا تھا۔ سید احمد شہید اور شاہ اسحق کی امامت و امارت میں اس تحریک نے اپنے کام اور جامعیت کو ہمیشہ قائم رکھا۔ حقیقت و طریقت، فقہ، حدیث، شریعت و تصوف کے ساتھ دعوت و جہاد کا عمل جاری رہا۔ اسی طرح انہوں نے سنت مستقیم اور تصوف و طریقت سے وابستگی کو برقرار رکھا۔ کیونکہ شریعت الہیہ ان شخصیات میں جذب ہو چکی تھی۔ اور یہ لوگ شاہ ولی اللہ کی جماعت کے بہترین اور سچے جانشین ثابت ہوئے۔

اسی طرح اس تحریک کی فکر کو شوکانی کی فکر سے جوڑا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ امام شوکانی زیدی تھے۔ اور "*ارشاد الفحول*" کا مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ امام ولی اللہ اور ان کی جماعت اجماع کو شرعی حجت تسلیم کرتے ہیں۔ مولانا حسین مدنی نے آپ کے خطوط جو آپ نے گوالیار کے سردار کو لکھے ان سے یہ نتائج اخذ کرتے ہیں۔ کہ آپ ہندوستان کو اپنی زمین اور ملک تصور کرتے تھے آپ نے ہمیشہ انگریز قوم کو پردیسی یعنی "بیگانگان بعید الوطن" سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ لڑائی کا عزم رکھتے تھے۔ جہاد سے آپ کا مطلب و مراد نہیں تھا کہ آپ برصغیر پر اپنی پر حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ شریعت الہیہ کے نفاذ ہے آپ نے یہ ساری کوششیں کیں۔

> "ہندو اور مسلمان دونوں انگریز کے ہاتھوں پامالی کا شکار تھے۔ آپ کی عرض اجنبی اقتدار سے نجات تھی۔ آپ نے ہندو راجپوت کو توپ خانہ کا امیر مقرر کیا۔ اس سے یہ واضح ہے آپ ہندوؤں کو اپنا محکوم نہیں سمجھتے تھے۔"[1]

سید احمد شہید نے ایک ایسی جماعت کی بنیاد رکھی جس کا محور و مقصود عوام تھی۔ جن کا سربراہ آورہ لوگوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لہذا یہ بات بلا تردد کہی جا سکتی ہے۔ کہ سید شہید نے برصغیر میں ایک عوامی رہنما کا خطاب

---

1 مدنی، حسین احمد، مولانا، **نقش حیات**، ج2، ص11

حاصل کیا۔ انہوں نے پر زور انداز میں مسلمانانِ ہند کے عقائد میں شامل بدعات کا خاتمہ کے لئے جہاد کیا۔

ایک مسلم انداز فکر ہے کہ ہمارے ہاں بر صغیر کی تمام تاریخوں صرف ہندو مسلم تضاد و فساد کے ضمن میں دیکھا جاتا ہے۔ ہر ایک بات کو ضرورت سے زیادہ آسان اور اور حقیقی طور پر قبول کیا جاتا ہے۔ تحقیق کے لئے جس ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اکثر ناپید ہے۔ سیرت سید احمد شہید کے فکری پہلوؤں کو سمجھنے اور تاریخ سیرت کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بارے میں درجہ ذیل امور واضح کرنا ضروری ہے۔ سید شہید کی تحریک ولی الہی تحریک کا شعبہ تھی۔ جن کا اولین پہلو دعوت و تربیت کے شعبہ میں کام کرنا تھا۔ تجدید اور اتباع سنت کا موقف ایک رہا۔

جس طرح ولی اللہی جماعت نے فرقے اور مسلک کے فروغ سے اجتناب کیا اسی طرح سید احمد کی جماعت نے دین الہیہ کے نفاذ کی بھرپور کوشش کی۔ جماعت ہمیشہ مسلمانوں کو ہر طرح کے جبر اور ظلم و ستم سے بچانے کے لیے کوشاں رہی۔ سید احمد شہید فکر اسلامی کی تشکیل نو اور اس کے مؤیدین میں انیسویں صدی کے اوائل کے مفکرین میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

شریعت الہیہ کے نفاذ کی کوشش

سید شہید کے افکار و نظریات اور تدبر و تدابیر میں اتباع نبوی کی حیثیت بہت واضح نظر آتی ہے۔ اسی وجہ سے ان کا مقام احیائے دین کی کوشش کرنے والے مشائخ میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اللہ کے ہزاروں بندوں نے بلاشبہ اسلام کے لیے گراں قدر کام لیا مصلحین اور مشائخ آئے لیکن ان کے عمل کے دائرے محدود نظر آتے ہیں۔ سید احمد شہید نے اس نقطہ کو . بہت اچھی طرح سمجھ لیا۔ کہ شریعت اسلامیہ کا قیام اور اسلامی نظام حیات کا اجراء اور ماحول تبدیلی کے بغیر یہ سب کوشش بیکار ثابت ہوں گی۔ اس لیے فضا تبدیل کرنے اور جڑ مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔

"سید شہید اسی نقشہ پر کام کرنا چاہتے تھے جس پر آپ ﷺ اور آپ خلفائے نے کام کیا تجربہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ سب زیادہ تعبداری اسی میں اور قیامت تک اسلام کی ترقی کے لئے وہی نظام عمل ہے۔"[1]

اسلام کے عملاً نفاذ کا لازمی نتیجہ صاحب اقتدار جماعت کے کردار، اخلاق اور اعمال کی اشاعت ہے:

﴿الَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ﴾[2]

(وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دیں)

یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ شرعی حکومت کے نفاذ کے بغیر شریعت اور شارع کے احکام پر پوری طرح عمل نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اسلام کے نظام عمل کا ایک پورا حصہ ہے جو کہ حکومتی احکامات پر موصوف ہے۔ اسلام

---

1 ندوی، ابوالحسن، سید، **سیرت سید احمد شہید**، ص54

2 الحج22:41

دیگر مذاہب رسوم ورواج اور محض عقائد کا نام بلکہ یہ پورے نظام زندگی کا نام ہے۔

سید شہید اس بات سے استدلال کرتے ہیں عقائد کے ساتھ زاویہ نظر اور دل ودماغ کا اللہ کے احکام کو قبول کر لینے کے ساتھ یہ تجدید ممکن ہے۔ اور اسلام کی حفاظت بھی قوت کے بغیر ممکن ہے۔ اس لیے اسلام مسلمانوں سے غلبہ وعزت احترام اور اقتدار حصول کے پر زور دیتا ہے۔ برائیوں کو روکا جا جاسکے اور کلمہ حق بلند کیا جاسکے امت مسلمہ بہترین قوم کہلانے کی حق دار اسی صورت میں جب وہ برائی کو روکنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

قوت واختیار کا حصول برائے عملی اصلاح

تغیر وتبدل کے لیے ہمیشہ قوت واختیار کی ضرورت ہوتی ہے اس تحریک کے بانی کے افکار کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ عمل کی بالیدگی کے لئے قوت واختیار کے حصول کے خواہاں تھے۔ تاکہ غیر اللہ سے نجات ممکن ہو سکے۔ احیائے خلافت اسلامیہ ان کی جدوجہد کا مرکز رہی۔ اگر تاریخ کے اوراق اٹھا کر دیکھے جائیں تو ایسے مجاہدین موجود ہیں جنہوں نے عظیم الشان سلطنتیں قائم کیں۔ لیکن سید شہید نے اللہ کے نام کی سربلندی کے لئے اور اللہ سبحان کی خوشنودی اور رضا کے لئے کام کیا۔

> "سید شہید نے مسلمان قوم کے غلبہ کے لئے نہیں بلکہ "اسلام" ایک مکمل دین، عقیدہ وعمل اور مسلک زندگی کو قائم کرنے کے لے رسول کی شریعت مطہرہ کی خاطر اپنے خون کا آخری قطرہ بہایا[1]"

سید شہید نے سیرت نبوی کی اس خصوصیت کو نمایاں کرنے میں ایک جاندار کوشش کا اظہار کیا اور اللہ کے حکم کی سربلندی کے لیے ہمیشہ کھڑے رہے۔

برصغیر پاک وہند کی فضا معاشرتی اور اخلاقی انحطاط کا شکار تھی۔ انیسویں صدی کے ہندوستان میں ایسی کوئی منظم تحریک نظر نہیں آتی۔ جنہوں نے احیائے سنت کی کوئی ایسی اصلاحی کوشش کی ہو۔ اس کی ایک وجہ یہ کہ اسلام جب ہندوستان کے حصہ میں آیا تو ایران اور افغانستان سے گزر کے آیا۔ اس میں بھی وہ خرابیاں موجود تھیں جو ہندو مذہب اور اس کی تہذیب وتمدن سے پیدا ہو چکی تھیں۔ سید شہید نے دعوت وتبلیغ کا آغاز ایسی خرابیوں کے خاتمہ کے لیے کیا۔ کیونکہ اگر "شرک جلی" کی کوئی صورت دیکھی جائے تو وہ سب اس وقت کے مسلمانوں میں موجود تھا۔

درباروں پر چادریں چڑھانا، سجدہ کرنا، چراغاں کرنا، میلہ لگانا، اولیاء اللہ اور بزرگان دین سے حاجت روائی کرنا۔ شرک وبدعات اور جہالت اس معاشرہ کے اجزائے ترکیبی تھے۔ سنت وشریعت جو صرف کتب تک محدود تھی اور ہر بدعت بدعت حسنہ تصور کی جارہی تھی۔ ان تمام خرابیوں کے باوجود ایک تحریک عزم واستقلال سے اپنے کام میں لگی رہی۔

---

1 ندوی، ابوالحسن، سید، **سیرت سید شہید**، ص57

آباد شاہ پوری لکھتے ہیں:

"سید احمد شہید نے انیسویں صدی کے آغاز میں ایک ایسی دینی فضا قائم کی اور ایک ایسی جماعت سامنے آئی جو اس صدی میں سیرت صحابہ کا نمونہ تھی متقی اور عبادت گزار اخلاق و کمال سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے والے اور جوش و جہاد اور یقین و خصوص کی ایسی ہوا اس سر زمین پر صدیوں بعد آئی اور اگر یہ بات اصلاح و تربیت میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔"[1]

تحریک جہاد اور اس کا مرکزی نقطہ

اس تحریک کا مرکزی نقطہ وحدانیت کامل تھا۔ اللہ کی وحدانیت و قدرت جس کا کوئی مد مقابل برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ ان تمام عقائد قلع قمع کرنا تھا جو کثیر الاتعداد ثقافتی اور کثیر الاتعداد مذہبی راوبط سے اخذ کئے گئے تھے۔ اِس تحریک کا اصل رخ ان ہندو مذہبی افعال و اعمال کی طرف تھا جو اسلام میں شامل کر لئے گئے تھے۔ اسی رواداری کے باعث کچھ تعلیم یافتہ ہندو سید احمد بریلوی کے گرویدہ ہو گئے۔

آپ کی تحریک نے آزاد خود مختار ریاست جو اسلامی اصول و ضوابط کے مطابق ہو کے مقصد کو مقدم رکھا تا کہ حقیقی اسلام کی کار فرمائی ممکن ہو سکے۔[2] سفر حج کے دوران ایک کنواں پر جب آپ کی ملاقات چند خواتین سے ہوئی جنہیں زبردستی سکھ بنایا گیا تھا ان کی پکار پر سکھوں کے خلاف جہاد کا ارادہ کیا گیا۔ اِس پورے واقعہ کو سوانح احمد میں مولوی محمد جعفر نے ذکر کیا ہے۔ سید صاحب نے جہاد فی سبیل اللہ کا آغاز کیا۔ فریضہ حج کے بعد عام بیعت کا سلسلہ شروع ہوا۔

جولائی 1861ء چار سو مردوں عورتوں اور بچوں رائے بریلی سے کلکتہ روانہ ہوئے اور راستے میں پٹنہ مونگیر بنارس اور آلہ آباد کے ہزاروں آدمیوں کو ہدایت دی۔ شاہ عبد العزیز کے مریدین پورے برصغیر میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے بعد ان کے خاندان نے بھی سید احمد کی بیعت کی۔ شاہ عبد العزیز نے سید احمد کے خواب کو اشارہ غیبی تصور کیا۔ مولانا عبد الحئ اور شاہ محمد اسماعیل نے سید احمد شہید کی بیعت کی۔ اور اس کے بعد شاہ اسحاق صاحب بھی سید احمد کے حلقہ میں شریک ہوئے۔

یہ حضرات علم و عمل میں مشہور اور شاہ عبد العزیز کے بعد برصغیر میں اہل علم لوگ مشہور تھے۔ ان کی بعیت سے مجلس شوریٰ مکمل ہوئی اور شاہ صاحب کے خاندان نے سید احمد کی بیعت کی۔ سید احمد اپنے کردار اور گفتار میں اخلاص کا نمونہ تھے۔ عبد الحئ اور شاہ محمد اسماعیل کی وجہ سے پورے ہندوستان سے لوگ آپ کی بعیت کے لیے آنے لگے۔ شاہ اسماعیل اسلامی موضوعات پر مدلل تقریر کرتے جس سے لوگ بے حد متاثر تھے۔

---

1 آباد شاہ پوری، **سید بادشاہ کا قافلہ**، (البدر پبلیکیشنز: لاہور، 1998ء)، ص 111

2 مہر، غلام رسول، **سید سر گزشت مجاہدین** (شیخ غلام علی اینڈ سنز: لاہور، 1975ء)، ص 483

برصغیر میں یہ دور شدت پسندوں کا تھا۔ جس میں سکھ اور انگریز دہلی تک چھائے ہوئے تھے۔ان کی عملداری میں رہتے ہوئے ان کے خلاف بغاوت اور جہاد کی بنیاد جہاد فی سبیل اللہ کی بجائے ایک بغاوت تصور کی جاتی۔ وہاں رہتے ہوئے ان سے مقابلہ کرنا ایک طرح کی ناکام کوشش ہوتی اور مسلمانوں کی جگ ہنسائی ہوتی۔ اس لیے سید احمد شہید کی سرکردگی میں پورے برصغیر کے دورے کیے۔

وقت کی ضرورت کے پیش نظر سید شہید اپنے قافلے کے ہمراہ روانہ ہوئے۔اور مختلف علاقوں میں دعوت و تبلیغ کا کام کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ گوالیار، ٹونک، سندھ، کوئٹہ، پشاور، قندھار، چارسدہ اور نوشہرہ ان علاقوں میں آپ نے اپنے مراکز قائم کیے۔ اور سکھوں کے خلاف باقاعدہ طور پر جہاد کا اعلان کیا۔اور سید احمد شہید امیر جماعت مقرر ہوئے۔ان علاقوں کے سردار اس اتحاد میں شریک ہوئے اور اپنے علاقوں میں شرعی احکام کے کا نفاذ کا اعلان کیا۔ لیکن پشاور کے سرداروں کی غداری کی وجہ سے تحریک کو بعض مقامات پر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

سید احمد شہید کی **تحریک جہاد** اور حاجی شریعت اللہ کی "**فرائضی تحریک**" کا برطانوی انتظامیہ پر یہ اثر ہوا کہ مسلمان انتہا پسند ہیں ان میں دوسروں کے لیے رواداری موجود نہیں لہذا انہیں سختی سے کچلا جائے۔اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کا ایک طبقہ جنہوں نے محسوس کیا کہ انگریزی اقتدار سے جنگ کرکے یا ان سے بغاوت کا علم بلند کرکے اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ جا سکتا لہذا ان کے ساتھ مفاہمت کی پالیسی پر عمل دار آمد کیا جائے۔

بہر حال اسلامیان ہند میں تحریک مجاہدین مختلف حیثیتوں سے اپنی نوعیت کی ایک منفرد تحریک تھی۔ یہ مسلم ہند کی وہ انقلابی تحریک تھی جس کا اثر مذہبی عقیدہ اور عمل و فکر کی تجدید و احیاء کے سلسلے میں دیرپا اور انقلابی تھا۔ یہ تحریک بالعموم مغرب مخالف تھی اور غیر واضح طور پر اس تحریک نے عالمی اسلامی اتحاد کے لیے راستہ ہموار کیا۔

مولانا رشید احمد گنگوہی(1829ء-1905ء) اور اصلاح فکر اسلامی میں ان کی کاوشیں

مولانا رشید احمد گنگوہی اسلامی ہند کے اس دور میں پیدا ہوئے جب مسلمانوں کے جاہ و جلال اور اقتدار کا جھنڈا اپنی سربلندی کھو چکا تھا۔ اور اگر برصغیر کے مسلمانوں کے مستقبل کی نظر دوڑائی جائے پستی اور بے بسی نظر آرہی تھی۔ انگریزوں کے تسلط کی وجہ مسلمان بے بسی کے عالم میں دینی وملی اور ثقافتی سلامتی کی راہیں تلاش کر رہے تھے۔ ایسے حالات میں مولانا نانوتوی کے ساتھ جو سب سے نمایاں مصلح شخصیت نظر آتی ہے۔

مغلیہ سلطنت کے خاتمہ کے بعد برصغیر پاک وہند کو اقتصادی اور معاشی کمتری کے ساتھ ساتھ ذہنی اور فکری انتشار کا سامنہ کرنا پڑا۔ ان نازک حالات میں قومی، ملی، دینی اور فکری افکار کی تعمیر و تشکیل میں مولانا رشید احمد گنگوہی کا کردار بڑا واضح نظر آتا ہے۔ان کی زندگی اصلاح امت کے کارناموں سے بھرپور ہے۔ [1]

---

1 محمد طیب، قاری، مولانا، **روداد دارالعلوم دیوبند**، ص10

مولانا رشید احمد گنگوہی نے اپنے قوت فکر سے اِس تاریک دور میں جب بدعتوں کا رواج عام تھا، برصغیر میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی جہاں مولانا نانوتوی نے بیرونی فکری حملوں کا جواب دیا اور ادیان باطلہ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان کے حملوں کا بھرپور جواب دیا۔ جبکہ مولانا رشید احمد گنگوہی مسلمانوں میں پیدا ہونے والی داخلی کمزوریوں کا سدباب کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

آپ کے تاریخ ساز کارناموں میں مشرکانہ عقائد کے نفوذ کی راہیں بند کرنا ہے جس میں آپ نے کافی حد تک کامیابی حاصل کی دار العلوم دیوبند کا قیام اس مشن میں کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی نے اپنے درس و تدریس اور واعظ وارشاد کے ذریعہ سے ایک ایسی سے متحرک کے جماعت تیار کی جو مشرکانہ رسومات، بدعات اور رسم و رواجوں میں جھگڑے ہوئے معاشرہ کو اسلام کے صحیح اصولوں سے متعارف کرانے اور سیدھی راہ پر لانے کا حوصلہ رکھتی تھی۔

تزکیہ باطن اور فکری تعلیم و تربیت

مولانا رشید احمد گنگوہی کو تمام علماء میں حضرت مہاجر مکی کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں سبقت حاصل ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی میں لکھاہے:

"مولانا نانوتوی اور رشید احمد گنگوہی اسی وقت کے دوست ہیں۔ دونوں نے جناب عبد الغنی سے حدیث پڑھی اور مہاجر مکی سے سلوک و تصوف سیکھا۔ اس دوران ان کا ذریعہ معاش مطلب تھا۔"[1]

آپ نے انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا اور مہاجر مکی کے دوسرے شاگردوں اور ساتھیوں کے ہمراہ معرکہ شاملی میں شجاعت اور دلیری سے جہاد میں حصہ لیا۔ معرکہ شاملی کے بعد گرفتاری ہوئی اور رہائی کے بعد آپ نے درس و تدریس کا آغاز کیا۔ آپ ایک سال کے اندر صحاح ستہ ختم کروادیتے شہرت دیکھ کر دور دور سے طلبا حدیث سیکھنے کے لیے آپ کے پاس سے آنے لگے۔ طلبا سے ہمیشہ محبت سے مخاطب ہوتے اور درس حدیث کے دوران ایسے واقعات اور مضمون سناتے کے سننے والے میں عمل کا شوق پیدا ہو جاتا۔

"اتباع سنت اور اللہ کے ذکر اور احکام کی پابندی کی دعوت دیتے ہیں۔ تین سو سے زائد افراد نے آپ سے حدیث کا درس حاصل کیا۔ طلبا میں رغبت آخرت کو ابھارا اور مثالی کام اور عمل کی دعوت کی ترغیب دی۔ حضرت گنگوہی اپنی خانقاہ میں ہی درس دیتے آپ کے تلامذہ تکمیل حدیث کے بعد اپنے زمانہ اور علاقہ کے بڑے اہل علم اور اہل علم تقوی ثابت ہوئے۔"[2]

مولانا گنگوہی تصوف، علم حدیث کے ساتھ ساتھ علوم اسلامی اور فقہ اسلامیہ سے گہری رغبت تھی۔ فتاوی

---

1 گیلانی، مناظر احسن، **سوانح قاسمی**، ج1، ص167

2 عاشق الٰہی، میرٹھی، **تذکرۃ الرشید**، (کتب خانہ، اشاعت العلوم: سہارن پور، 1997ء)، ص38

رشیدیہ آپ کی فقہی بصیرت اور علمی صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔

آپ تقوی، شریعت اسلامیہ پر استقامت بدعات کا رد، سنت رسول ﷺ کی اتباع اور شعار اسلام کو پھیلانے میں لگے رہے۔ علم و عمل کی زندہ وجاوید تصویر رہے۔ مولانا گنگوہی صرف فقہ حنفی کے ماہر نہ تھے بلکہ آپ چاروں مذاہب فقہیہ کے ماہر تھے۔ دار العلوم میں درس تدریس کے شعبہ سے وابستہ ہوئے تو تعلیمی اور تعمیری سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ مولانانانوتوی کی وفات کے بعد آپ نے مکمل طور پر مدرسہ کی سرپرستی سنبھال لی۔ اور دار العلوم دیوبند کی تعمیر و ترقی کا ایک دور شروع ہوا۔

مولانا رشید احمد گنگوہی شاہ ولی اللہ کے سیاسی افکار سے کافی قریب تر تھے۔ آپ سرسید احمد خان کو مسلمانوں کا خیر خواہ تو تصور کرتے تھے۔ لیکن ان کے مذہبی خیالات سے بالکل نامتفق رہے۔ انہوں نے معاشرتی مسائل جس میں عورتوں کے قانون حق وراثت اور ہندوں سے لی گئی تباہ کن رسومات کا رد کیا۔ بیواؤں کے دوسرے نکاح کی تحریک چلائی یہ سب سید احمد شہید کی تحریک کے اساسی نظریات رہے۔ سنت کے قیام واستحکام کے معاملہ میں انہوں نے ہر ممکنہ کوشش اور جد وجہد کی۔ مولانا کے نزدیک سنت میں کسی قسم کی تبدیلی یا استخراج بدعت کی ہی ایک صورت ہے۔ یا کسی بھی مذہبی رسم میں تبدیلی کو بدعت کبیرہ یا بدعت صغیرہ سے تعبیر کیا کا سکتا ہے۔"[1]

مولانا گنگوہی کی پوری زندگی خدمت دین سے عبارت رہی۔ ایک طرف تزکیہ باطن، سلوک اور تعلق مع اللہ سے بھرپور زندگی اور دوسری طرف آپ دینی علوم پڑھا رہے تھے۔ آپ کی ساری توجہ احادیث مبارکہ پڑھانے پر رہتی اور اسی وجہ سے دور دراز سے لوگ آپ کے پاس علوم دینیہ پڑھنے آتے۔

آپ کو فقہی مسائل پر عبور حاصل تھا اسی لئے آپ کو فقیہ النفس مخاطب کیا گیا، مسائل شرعیہ میں اہم ترین مسائل کا حل اس کی بہترین شکل آپ کی فتاوی رشیدیہ ہے۔ جس میں بلاخوف آپ نے بدعات کا رد کیا۔ مشترکانہ عقائد اور خلاف شرع رسم ورواج جو دین میں داخل ہو گئے اور مصنوعی صوفیا کے مجاوروں نے اسلام کے نام پر جو بدعات اور غیر اسلامی کاموں کی تائید کی آپ اس کا رد کیا۔

اگر برصغیر ہند کے کسی اسلامی دور کا جائزہ لینا ہو اُس دور کے فتاوی کی کتب کو دیکھنا چاہیئے۔ کہ اس دور میں مسلمانوں کا ذہنی مزاج کیا تھا؟ ان کے ذہنی و فکری رجحانات کیا تھے؟ ان کا رہن سہن کا طریقہ کیا تھا؟ روزمرہ زندگی کے عوامی عقائد کیا تھے؟ غرض یہ کہ پورے اسلامی معاشرہ کی تصویر واضح ہو جائے گی۔ اسی نقطہ نگاہ کے پیش مولانا کی جو کی کتاب "**فتاوی رشیدیہ**" جو کہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔

انیسوی صدی کے مسلمانوں کے حالات زندگی کی خبر دیتا ہے۔ اس دور کے مسلمانوں کے معاشرتی مظاہر

---

1 محمد میاں، **علمائے حق**، ص192

ہی نہیں بلکہ ذہین بھی طرح طرح کی برائیوں اور خرافات میں۔ مبتلا رہے۔ خلاف دین و شرع جو رسم ورواج اور مشرکانہ عقائد مسلمانوں کے دل و دماغ میں راسخ ہو چکے تھے۔ ان کی جگہ اسلامی تعلیمات کے تعلیمات کی واضح اور درست شکل کو پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مولانا رشید احمد گنگوہی نے اس جہاد کا آغاز کیا اور اپنے ساتھ اپنے تلامذہ کی ایک بہترین جماعت تیار کی۔

مولانا نے جرات مندی سے مسلم معاشرہ کو غیر اسلامی طور طریقوں سے نجات دلانے کی کوششوں میں لگے رہے۔ دیگر بدعات کی طرح میلاد اور عرس کی کئی شکلیں معاشرہ میں رائج تھیں۔ پورے برصغیر میں عرس بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے تھے اور مصنوعی صوفیا مزاروں اور قبروں پر بیٹھ جاتے اور میلہ لگتا۔ مسلمان بھی ہندو یاتریوں کی طرح اجمیر، کلیر وغیرہ کا سفر اختیار کرتے۔ آرائش وزیبائش کا سامان خریدتے چڑھاوے اور نقدی نذرونیاز کے نام مزاروں پر بیٹھنے والے مجاور وصول کرتے۔ ہارمونیم اور تالیوں کی گونج میں شب قوالی ہوتی۔

حضرت گنگوہی کے دور میں ساری خرافات دین کے نام پر موجود تھیں۔ ان عرسوں اور میلوں کے متعلق مسائل کا حل معلوم کرنے کے لیے پورے ملک سے سوالات آئے۔ جن کے جوابات مولانا صاحب خود تحریر کرتے "فتاوی رشیدیہ" کے مطالعہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ نے ان کا حل اور جواب مدلل انداز میں پیش کیا۔ صفحہ نمبر 101 سے 141 تک اسی قسم کے سوالات کے جوابات تحریر کئے گئے ہیں۔[1]

عرس اور میلوں کا ایک پہلو قبروں کا طواف ٹھیک اسی طرح کیا جاتا تھا جس طرح حجاج کرام بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہی نے اس بارے میں استدلال کیا اور شاہ ولی محدث دہلوی نے "حجۃ البالغہ" میں جسے رقم کیا، آپ کا بھی وہی موقف رہا۔ اولیا اللہ کا طواف قبور حرام ہے اور شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اسی طرح استعانت اہل قبور کے بارے میں جب لوگوں نے استفسار کیا، تو رشید احمد گنگوہی استدلال کرتے ہیں کہ:

> "یہ ایک مشرکانہ گمراہی کے سوا کچھ نہیں۔ استعانت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا اور اس کی مدد حاصل کرنا۔ لیکن کسی صاحب قبر سے استعانت حاصل کرنا گناہ کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔[2]

میت کو ایصال ثواب کرنا ایک مسلمہ مسئلہ ہے جس کی بہترین صورت مسکینوں کو کھانا کھلانا، اجر و ثواب کی نیت سے کسی مدرسہ یا مسجد کی تعمیر کرانا، کنواں کھدوانا وغیرہ۔ یہ سب کام صدقہ جاریہ کی بنیاد ڈال رہے ہیں۔ لیکن مولانا گنگوہی استدلال کرتے ہیں جو کام تنبیہ بالکار ہو گا۔ وہ ثواب کی بجائے گناہ وہ بدعت ہے اور ممنوع ہے۔ مثلاً تیجہ، گیارہویں، چہلم، وغیرہ یہ سب ہندوستان میں ہندوؤں سے مستعار لیا گیا۔ اس لئے علمائے کرام نے غیر شرعی قرار دیا

---

1 گنگوہی، رشید احمد، **فتاوی رشیدیہ**، ص112

2 گنگوہی، رشید احمد، **فتاوی رشیدیہ**، ص114

ہے۔[1]

بدعات کی ایک لمبی فہرست ہے۔ بر صغیر کے مسلمانوں کی معاشرتی اور ثقافتی زندگی میں ہر قدم پر رسم و رواج اور طرح طرح کی خرافات کا عام رواج تھا۔ علمائے سوء نئی نئی بدعتوں کے ایجاد میں عامۃ الناس کو گمراہ کر رہے تھے۔ قبور پر اذان ایک غیر شرعی ہے۔ اور قرون ثلثہ میں اس کا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔ اس امر کا ثبوت فقہ کی کئی کتب میں موجود ہے۔ علامہ خیر الدین نے حاشیہ بحر الرائق، شرح تنقیح محمود البلخی میں قبور پر اذان کا رد کیا ہے۔[2]

بہت ساری مشرکانہ عادات رسم و رواج، پیر پرستی، عرسوں قوالیوں کا رواج، وغیرہ وغیرہ۔ رد بدعات کی تحریک اصلاح مولانا گنگوہی کے دم قدم سے ایک کامیاب بدعات کے خاتمہ کے لئے اس تحریک کا آغاز مولانا گنگوہی سے ہوا۔ علمائے دیوبند کی پوری جماعت خرافات اور بدعات کے ابطال کے لیے صف باندھ کر کھڑی ہوگئی۔ اور اپنی تصانیف و تالیفات سے اس کارد پیش کیا۔ اسلام میں خلاف شرع رسم ورواج اور مشرکانہ عقائد کے رد اور اس سارے خس کو صاف کرنے میں مولانا کی شخصیت قائد کی حیثیت اختیار کرتی ہے۔

تصنیفی خدمات کے ذریعے اصلاح

علامہ رشید احمد گنگوہی نے درس و تدریس کے علاوہ کتب کی تصانیف کی جانب بھی توجہ فرمائی۔ رشید احمد گنگوہی کی جانب علمائے ہند کا جھکاؤ بھی بہت زیادہ تھا۔ آپ اپنے دور کے اعلیٰ پایہ کے مصلح اور متقی و پرہیز گار عالم تھے۔ آپ نے کئی اہم موضوعات پر قلم اٹھایا اور عامتہ الناس کی ہدایت کا سامان کیا۔ "**امدادالسلوک**" مولانا گنگوہی کی تصوف و سلوک پر یہ کتاب 117 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مولانا نے سلوک و طریقت کی حقیقت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

شریعت کے احکامات اور اس کی معنویت کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہو کر اللہ کے احکام کی پیروی کا نام طریقت ہے۔ آپ اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ شریعت اللہ تعالیٰ کا قانون ہے اور مومنین کی زندگی کے اصول وضوابط مجموعہ کا ہے۔ ان اصول وضوابط کو سمجھنا اور ان کی تہہ تک پہنچنا ہی طریقت ہے اور ان کی بجا آوری کے لیے لگے رہنا۔ طریقت در حقیقت صوفیانہ اصطلاح ہے۔ اس کا پہلا دروازہ شریعت ہے۔ اور شریعت پر عمل پیرا ہو کر پختگی اور استقامت سے عبادات میں لگے رہنا طریقت ہے۔

طریقت شریعت سے الگ نہ کوئی مقام رکھتی ہے اور نہ ہی کوئی مسلک آپ نے اس کتاب میں شیخ کامل کے فضل کے تحت استدلال کیا ہے۔ شیخ خواہ کسی بھی قوم یا قبیلہ سے تعلق رکھتا ہو اصل بات راہ حق پر چلنا ہے۔ اور راہ حق

---

1 گنگوہی، رشید احمد، **فتاوی رشیدیہ**، ص131

2 رملی، خیر الدین، علامہ، **بحر الرائق** (دار الکتب العلمیہ: بیروت، 1993ء)، ص265

قرآن و سنت اور اجماع امت ہے۔ اور جو شخص اس پر قائم ہے وہ قبول ہے ورنہ سب مردود اور بے کار ہے۔[1]

رشید احمد گنگوہی استدلال کرتے ہوئے احادیث مبارکہ کی روشنی میں صالحین کی صحبت اور ہم نشینی کو افضل گردانتے ہیں۔ لکھتے ہیں صالح کی مثال عطر فروش جیسی اگر وہ عطر نہ بھی دے تب بھی اس کی خوشبو ضرور حاصل ہو گی۔ مولانا گنگوہی نے شیخ میں جن شرائط کا ہونا لازمی قرار دیا ہے وہ یہ ہیں:

"شیخ قرآن و حدیث کا ماہر ہو۔ صرف عالم ہی نہ ہو بلکہ صفات عالیہ سے بھی متصف ہو۔ مال و متاع کی محبت سے آزاد ہو۔ مخلوق سے میل ملاپ کم اور صدقہ خیرات کی کثرت کرتا ہو۔ مکارم اخلاق سے شخصیت بھرپور ہو، صبر، شکر، توکل، اللہ پر قناعت، سخاوت، فکر آخرت، صدق و اخلاص وغیرہ آپ نے ان تمام مکارم کو شمار کرایا ہے۔ جن سے شیخ متفق و متصل ہونا ضروری ہے۔"[2]

امداد السلوک میں خلاف معمول صوفیاء کرام کے اقوال، کشف، کرامات اور ملفوظات کا ذکر کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ آپ نے امداد السلوک کے ذریعہ سے تصوف کی حقیقت کو باخوبی سمجھایا ہے۔ اور یہ واضح ہوتا ہے کہ اس راستہ کے تمام مجاہدے اور ریاضتیں انسان میں شریعت اور روح شریعت کا یقین پیدا کرنے کا سامان ہے۔ رسم و رواجوں میں جھگڑے ہوئے اور راہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کی اصلاح اور ذہنی اصلاح کے موضوع پر ایک قابل قدر کتاب مولانا رشید احمد گنگوہی کی علمی قابلیت کا واضح ثبوت ہے۔

"**سبیل الرشاد**" مولانا گنگوہی کی متفرق ضوعات پر لکھی گئی کتاب ہے جس میں مختلف شکوک و شبہات اور اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ رسالہ کل 40 صفحات پر مشتمل ہے۔ جس دور میں مولانا گنگوہی نے کام کیا وہ تاریخ کا وہ دور ہے جہاں چاروں اطرف سے فرقہ واریت کا حملہ تھا۔ اور لوگوں کو طرح طرح سے ورغلایا جارہا تھا۔

دارالعلوم کا قیام اس دور میں برصغیر ہند پر ایک بڑا احسان تھا۔ مسلمانوں کو ذہنی پریشانیوں سے نجات دلا کر تعلیم کی راہ پر لگایا اور مسلمانوں میں پھیلی ہوئی بدعات کے خلاف جہاد کا آغاز کیا۔ "سبیل الرشاد" اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مولانا گنگوہی نے جہاں لوگ نص قرآنی کو چھوڑ کر قیاس اور علماء کی آرا پر عمل نے کر رہے تھے اور ان کے اقوال کو رسول اللہ کی احادیث پر ترجیح دے رہے تھے قول صحابہ کو ترک کر کے اپنے اقوال پر عمل پیرا تھے۔

آپ نے "سبیل الرشاد" کا آغاز صحابہ کی تعریف سے کیا پھر تابعی کی تعریف لکھی اور اس کے بعد آنے والے لوگوں کے بارے میں لکھا۔ مولانا نے قرات خلف الامام، مسئلہ تقلید اور تقلید کی وضاحت کرتے ہوئے اسے دو جز میں تقسیم کیا اور فرمایا کہ تقلید کی ایک صورت جس کی قطعی ممانعت ہے۔ جبکہ دوسری شرعاً واجب اور درست ہے۔ تقلید کی ایک شکل آباء و اجداد کی رسم و رواجوں کی پیروی جبکہ دوسری رسول اللہ اور صحابہ رسول کے نقش قدم

---

1 گنگوہی، رشید احمد، **امداد السلوک**، ص19

2 گنگوہی، رشید احمد، **امداد السلوک**، ص28

پر چلنا ہے۔ اور قرآن حکیم نے اسی طرف اشارہ کیا ہے:

﴿فَسْـــــئَلُـــوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾[1]

(اگر تم نہیں جانتے تو علم والوں سے پوچھو)۔

پھر مولانا گنگوہی قرآن حکیم سے استدلال کرتے ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾[2]

(اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان کی جو تم میں سے حکومت والے ہیں)۔

اس آیت مبارکہ کی روشنی میں یہ دلیل ہے کہ "اُولِي الْاَمْرِ" اپنے عمومی معنوں کے لحاظ سے علما کرام میں خلف اور فقہاء دین میں اور متعدد مفسرین کرام جن میں امام شوکانی، ابن کثیر اور قاضی البیضاوی نے اس کا معنی فقہاء اور علماء ہی لیا ہے۔ اور ان کی اتباع ضروری ہے۔[3]

"**تصفیۃ القلوب**" مولانا کی یہ کتاب ضیاء القلوب کا اردو ترجمہ ہے جو آپ کے شیخ مہاجر مکی کی تصنیف ہے۔ اِس کتاب میں تصوف کے مراتب آداب سلوک وطریقت وغیرہ کو ذکر کیا گیا۔

"ضیاء القلوب کی افادیت اور اہمیت و حقیقت کو واضح کرنے کے لیے آپ نے اس کا ترجمہ "تصفیۃ القلوب" کے نام سے کیا تاکہ لوگ تصوف کی صحیح روح سے واقفیت حاصل کر سکیں۔"[4]

اس کے علاوہ مولانا کی علمی یادداشتوں کی فہرست میں "**اوثق العری، زبدۃ المناسک ، ہدایۃ الشیعہ**" جیسی کتب شامل ہیں۔ مولانا گنگوہی کو علم قرآن اور علم حدیث میں حد درجہ کمال حاصل تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فقہی بصارت عطا کی۔ تمام اہل علم آپ کی ثقاہت اور صلاحیتوں کے معترف رہے۔

مولانا نانوتوی نے دار لعلوم کو قائم کر کے ایک علمی روایت کو جاری کیا۔ اور اہل علم کی ایک جماعت پیدا کرنے کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور اس جماعت کی ذہنی و فکری تربیت کا اہتمام مولانا گنگوہی نے کیا۔ جرات گفتار اور حق کا اظہار مولانا گنگوہی کا ورثہ رہا اور یہی جذبہ اصلاح اور دعوت و تبلیغ آپ کے تلامذہ کی نمایاں خوبی ٹھہرا۔ جن میں مولانا محمود الحسن اور حسین احمد مدنی نمایاں نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے آپ کی وراثت کو عام کیا۔ اگر برصغیر کی علمی شخصیات کا جائزہ لیا جائے تو مولانا علمی قد میں پوری تاب سے کھڑے نظر آتے ہیں۔

---

1 النحل 43:16

2 النساء 59:4

3 گنگوہی، رشید احمد، **سبیل الرشاد**، ص 22-28

4 اسیر ادروی، مولانا، **مولانا رشید احمد گنگوہی حیات اور کارنامے**، (شیخ الہند اکیڈیمی دار العلوم: دیوبند) ص 25

مولانا قاسم نانوتوی(1833ء-1880ء)اور دارالعلوم دیوبند

مولانا قاسم نانوتوی انیسویں صدی کے علماء و مفکرین میں نمایاں شخصیت کے حامل انسان جو اپنے مثالی کردار اور علم و عمل کی وجہ سے بر صغیر میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔جنگ آزادی کے بعد مسلم معاشرہ کی از سر نو تعمیر کے زمانہ میں مولانا قاسم نانوتوی اور علمائے دیوبند کے ایک گروہ نے یہ طے کیا کہ دہلی کے قریب ایک قصبہ دیوبند میں ایک ایسا مدرسہ قائم کیا جائے جس میں دینی تعلیم اور شاہ ولی اللہ کے مقاصد تعلیم کو مد نظر رکھ کر تعلیم و تربیت کے آغاز کیا جائے چنانچہ علی گڑھ سے پہلے ہی 1867ء میں دیوبند کے مدرسہ میں تعلیم وتربیت کا آغاز ہو چکا تھا۔

مولاناعبید اللہ نے سندھی نے لکھا کہ سر سید کے مدارج تعلیم اور دیوبند کا مدرسہ دراصل ولی اللہی دینی ورثہ کے ہی دو پہلو ہیں۔[1]

مولانا قاسم نانوتوی اور ان کے رفیق و معاون مولانا رشید احمد گنگوہی نے دیوبند کے مقاصد میں اس بات کی وضاحت کہ اس مدرسہ کے قیام کا مقصد عالم اور ایک عام مسلمان کے درمیان از سر نو ایک تعلق وربط پیدا کرنا ہے۔ تا کہ از سر نو ملت اسلامیہ کی مذہبی و ثقافتی شناخت کو تعمیر کیا جائے۔

جدید علوم کی جگہ روایاتی نصاب تعلیم کو مرتب کرنے کا مقصد یہ تھا کہ جدید طبعیاتی علوم تو با آسانی سرکاری سکول اور کالجوں میں میسر ہیں جبکہ روایاتی علوم غیر محسوس طرح سے مفقود ہوتے جارہے ہیں مسلم قوم اور امت کی تشکیل کا انحصار و دارومدار اسی بات پر ہے کہ اپنے رواتی ورثہ کو محفوظ کیا جائے۔[2]

علمی و تعلیمی اصلاحات

قدیم اور روایاتی اسلامی نصاب تعلیم کو عام کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا تا کہ یہ نصاب اسلامی اور مغربی عقلیت پسندی کے درمیان ایک پل کا کام سر انجام دے سکے۔اور اگر مدرسہ سے فارغ التحصیل کوئی طالب علم چاہے تو وہ اپنی دینی تعلیم مکمل کرنے کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ لے سکے اور علوم جدیدہ اور روایات اسلامیہ کو مکمل طور پر سمجھنے کے قابل ہو۔مولانا قاسم نانوتوی کی تصانیف کی روشنی میں ایک جانب توجہ شخصیت اور علم و عمل میں ایک کامل اور دانشمند آدمی تھی۔ آپ نے بر صغیر میں بدلتے حالات کے پیش نظر معاشرتی اصطلاح کے لیے بہترین اقدامات اٹھائے۔

مولانا قاسم نانوتوی اور ان کے رفقاء کے ساتھ سے دارالعلوم روایتی دینی درس گاہ اور اعلیٰ درجہ کا امتیازی مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔اس نے مجموعی طور پر خیر آباد، دہلی اور لکھنو کی روایات اور اسلوب اپنے اندر

---

1 محبوب رضوی، **تاریخ دیوبند**(دارالاشاعت: کراچی،1952ء)،ص104

2 گیلانی، مناظر احسن، **سوانح قاسمی**(مکتبہ دارالعلوم،دیوبند،1955ء)،ص292

سموبا۔ دینی نصاب میں علم الکلام، یونانی فلسفہ، اقلیدس، علم فلکیات، طب، عربی و فارسی قواعد، اصول فقہ اور حدیث و تفاسیر شامل رہے۔ اول اس نصاب کی مدت تکمیل دس سال تھی جس کو بعد میں چھ تبدیل کر دیا گیا۔

"پورا تعلیمی نصاب ایک سوچھ کتابوں اور متون پر مشتمل تھا۔ عوام کے مسائل کے لیے 1893ء ایک شعبہ "افتاء" قائم کیا گیا جو معاشرتی و سیاسی نیز گھریلو مسائل کا فقہی حل، پنچائتوں اور سرکاری عدالتوں کے دیئے گئے فیصلوں پر نظر ثانی کے حق پر محیط تھا"۔[1]

مولانا نانوتوی ایک اور بہترین معلم ماہر تعلیم تھے۔ انہوں نے شاہ ولی اللہ کے رائج کردہ تفاسیر اور احادیث کی کتب کو نصاب کا حصہ بنایا اور دیگر چہ علوم کو مناسب انداز میں نصاب کا حصہ بنایا اس طرح یہ نصاب مولانا نانوتوی کا مرتب کردہ نصاب ایک منفرد انداز اختیار کر گیا۔ جو اس وقت کا رائج تمام نصابوں کا جامع تھا۔ اِس سے مولانا قاسم نانوتوی کے فکری اور اساسی نظریہ تعلیم کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی جن کو شارح اور ترجمان قاسمی بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے حضرت قاسم نانوتوی کے عصری علوم سے تعلق کو واضح کرتے ہوئے لکھا:

"ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس نصاب کو پڑھ کر فارغ ہونے والوں میں علوم جدیدہ حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے گویا علوم جدیدہ کی تعلیم مقدمہ بھی دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نصاب بن سکتا ہے اور چاہا جائے تو اس سے بھی کام لیا جاسکتا ہے۔"[2]

اس یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا نانوتوی عصری تعلیم کے مخالف نہ تھے بلکہ وہ اس بات کے قائل رہے کہ روایت کی پاسداری سے طلبا میں یہ شعور پیدا ہو گا صاف اور سیدھا کھرا کیا ہے۔ روایتی علوم کی تحصیل ایک مسلمان طالب علم کے اندر اچھائی اور برائی میں تمیز پیدا کر دے۔

"مولانا نانوتوی عصری علوم کی اہمیت سے بھی غافل نہ تھے وہ اس بات کے قائل رہے عصری اور روایتی تعلیمی مخلوط نصاب تعلیم کا نتیجہ گا کہ طلبا کسی علم و فن میں مہارت حاصل نہ کر سکے گا اور نہ اسے جدید علوم حاصل ہو سکیں گے اور نہ نہیں وہ رواتیی علوم میں فاضل ہو سکے گا۔"[3]

قدیم وجدید کا امتزاج

مولانا نانوتوی اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ مدارس کی قدیم تاریخ اٹھا کر دیکھی جائے تو قدیم و جدید کا امتزاج نظر آتا ہے۔ جب عصری اور رواتیی علوم الگ الگ نہ تھے۔ ادارے الگ الگ نہیں تھے امام غزالی ہوں یا ہوں یا بو علی سینا سب کا رہن سہن اور لباس ایک جیسا تھا مید ان الگ الگ تھے۔

---

1 محبوب رضوی، **تاریخ دیوبند**، ص120

2 گیلانی، مناظر احسن، مولانا، **سوانح قاسمی**، ص280

3 اسیر ادروی، مولانا، **مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے**، (شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند، 1987ء)، ص162

"انہیں مدارس سے فارغ التحصیل سرکاری ملازمتوں پر فائز ہوتے تھے۔اس ہے یہ ضروری ہے کہ یکسو ہو کر دینی تعلیم کو حاصل کیا جائے۔مولانا اسیر ادروی نے لکھا کہ مولانا نانوتوی نے سر سید احمد خان کی کوششوں کی جفاکشی کی تعریف کی اور سراہا۔"[1]

مولانا نے کبھی انگریزی سکولوں کے قیام کو ناپسند نہیں فرمایا۔ بلکہ ان کا یہ نظریہ رہا کہ جن لوگوں پڑھناہیں وہ مدرسہ کی تکمیل کے بعد دیگر علوم میں مہارت حاصل کریں۔اور آپ نے ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی کی۔مولانا مناظر احسن گیلانی نے بڑے احسن انداز میں مولانا نانوتوی کے فلسفہ تعلیم کو پیش کیا۔

"کہ مولانا اس بات کے قائل تھے کہ دانش مندی سے پہلے اسلامی علوم و نصاب کو ختم کر لیا جائے کیونکہ ان کے بغیر تفسیر، شرح احادیث فقہ کی کتب کو با آسانی سمجھنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی اور بڑے واضح انداز میں اپنی تجویز کو پیش کیا کہ دینی علوم کی تعلیم بعد مسلمان بچوں کو علوم جدیدہ کی تحصیل کے لیے سرکاری مدارس میں داخل کیا جائے۔"[2]

زبان و لسان کے حوالے سے آپ کا موقف بڑا واضح رہا کیونکہ اگر مولانا نانوتوی کی زندگی پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آپ کی زندگی کا بڑا حصہ حق و باطل میں فرق واضح کرنے میں گزرا۔ آپ کی زندگی اشاعت دین اور دعوت و تبلیغ میں صرف ہوئی دیوبند کی تاریخ آپ کو ایک متکلم کے طور پر متعارف کرواتی ہے۔

کیونکہ آپ نے عیسائی پادریوں پنڈتوں کے ساتھ خوب مناظرے کیے وہ مخالفین کے ادب سے کافی حد تک واقفیت رکھتے تھے۔مولانا ادروی نے جس واقعہ کو ذکر کیا اس سے اس بات کی اہمیت سمجھا جا سکتا ہے کہ مولانا جب آخری حج کے سفر پر روانہ ہوئے تو جہاز کے کپتان نے لوگوں کا رجحان مولانا کی طرف محسوس کیا کپتان جو خود اٹالوی تھا اُس نے جو لوگ انگریزی جانتے تھے ان سے مولانا کے متعلق سوال کیا تو معلوم ہوا کہ مولانا صاحت کی وجہ شہرت کیا ہے اسے شوق ہوا کہ مولانا سے مذہبی موضوعات پر بحث کرے اور ملنے کی خواہش کو ظاہر کیا مولانا صاحب نے ترجمان کی مدد سے اُس سے گفتگو کی۔اس واقعہ کا مولانا پر گہرا اثر ہوا انہوں نے اس خواہش اظہار کیا کہ واپسی پر انگریزی زبان سیکھیں گے۔کیونکہ جو بات آپ براہ راست سمجھا سکتے ہیں اور دلائل سے قائل کر سکتے ہیں وہ فوائد کسی ترجمان کے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتے۔اس کے بعد دیوبند میں مطالعہ ادیان کو خصوصی توجہ حاصل ہوئی اور تمام مذاہب کی بنیادی باتوں کو پڑھنا سیکھنا وقت کا اہم تقاضہ سمجھا گیا۔[3]

---

1 اسیر ادروی، مولانا، **حیات وکارنامے**، ص219

2 گیلانی، مناظر احسن، مولانا، **سوانح قاسمی**، ج2، ص285

3 اسیر ادروی، مولانا، **مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے**، ص284

دینی مستقبل کی تعمیر

مولانا قاسم نانوتوی کے علمی و عملی تعلیمی اہداف پر مطالعہ کے بعد یہ باتیں واضح ہوتی ہیں جنہیں تعلیمی تجاویز کے طور پر تصور کیا جاسکتا ہے۔کیونکہ 1857ء کی جنگ کے بعد تمام مدارس کو ختم کر دیا گیا تھا۔ آپ نے تعلیم وتربیت کا ایک نیا سلسلہ متعارف کروایا۔کیونکہ اس وقت کے جو فکری خطرات درپیش تھے اور اعتقادی فتنے ابھر رہے تھے عیساست کے ایسے ہی حملے تھے جسے ایک وقت میں اندلس کی فتح کے بعد ہوئے تھے۔

یہی تاریخ برصغیر میں بھی دہرائی جانے قصد کیا جارہا تھا۔"میلہ خداشناسی" کے نام سے ایک میلہ لگایا جاتا جس میں پنڈت یاپادری وغیرہ شرکت کرتے اور مذہب کے متعلق گفتگو کرتے۔اسی میلہ میں مولانا قاسم نانوتوی بھی شریک ہوئے اور ایک متکلم کی حیثیت سے شریک ہوئے اور اسلام کے بنیادی عقائد پر عقلی بنیادوں پر گفتگو کی۔اِس حوالے سے آپ کی تصانیف ایک سند کا درجہ رکھتی ہیں۔مولانا کی تصانیف اصولی نوعیت رکھتی ہیں آپ نے مغزیات کو اہمیت دی اور یہ کتب علمی حلقوں میں مصادر و مراجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حکیم برکات احمد لکھتے ہیں:

> "مولانا ایک بڑے متکلم تھے اور اُن کی گفتگو حکیمانہ تھی۔ جزوئی مسائل کا کلام بھی ایک کلیہ کی حیثیت کرلیتا مولانا کے شرعی واقعات بھی اصول وضوابط اور اصول عقلیہ سے باہر نہیں تھے آپ کی عقل و فراست کسی بھی واقعات کے عقلی لمیات میں اسی طرح کام کرتی رہتی جس طرح اوامر و نہی کی سچائی اور حقیقت بیانی میں کارفرما رہی۔"[1]

مولانا قاسم نانوتوی کی زندگی کا شاندار پہلو ہندوستان میں مدارس کے قیام کی تحریک کا آغاز ہے۔اس تحریک نے پورے برصغیر میں دینی علوم کے حوالے سے بیداری کی ایک شاندار لہرپیدا کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا پورے ہند میں سینکڑوں کی تعداد میں مدارس کا قیام عمل پذیر ہوا یہ کہنا درست ہو گا کے دینی علوم کی ایک طرح سے نشاۃ ثانیہ ہوئی۔ مدرسہ مراد آباد،رامپور اور دارالعلوم دیوبند کی ابتداء مسلمانوں کو علوم دینہ سے شریعیت اسلامیہ سے جوڑنے کے لیے ہوئی۔

مدارس کے قیام کی اس تحریک نے برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا شریعت سنت کی تابعداری، اصلاح وتربیت حکومتی اور سیاسی معاملات تذکیر و تصانیف علم الکلام علوم اسلامیہ کی خدمت، ارشاد و دعوت یعنی ملت اسلامیہ کی تاریخ میں خطہ برصغیر کے حوالہ سے عمومی زندگی اور شعوری زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس سے اس کثیر الجہت تحریک جس کا آغاز مولانا نانوتوی نے متاثر نہ کیا ہو۔[2]

---

1 گیلانی، مناظر احسن، سید، **حیات مولانا حکیم سید برکات احمد سید**، (برکات اکیڈیمی، کراچی، 2004ء)، ص 185

2 کاندھلوی، نور الحسن راشد، **حالات طیبب قاسم نانوتوی**، (کاندھلہ: انڈیا، 2009ء)، ص 65

اس دور میں خصوصاً ہندوؤں اور عیسائیوں کی ایک نئی جماعت آریہ سماج اسلام کے خلاف محاذ کھول رکھا تھا مولانا قاسم نانوتوی نے ہر ممکنہ طور پر ان کے الزامات کارد کیا۔ خواہ وہ میدان وعظ واصلاح کا ہو یا تعلیمات و تصانیف مولانا قاسم نانوتوی وقت کی ضرورت کے پیش نظر ویسا ہی جواب دیا اور شریعہ اسلامیہ پر ہونے والے اعتراضات کا مکمل دفاع کیا۔

دارلعلوم دیوبند کے کام کی نوعیت

دارالعلوم کی ابتداء ہنگامہ عذر یعنی 1857 کی جنگ آزادی کے دس سال بعد 30 مئی 1867ء کو ہوئی اور اس بانیان مولوی فضل الرحمن، ملا محمد محمود اور مولوی ذوالفقار تھے۔ جو پندرہ روپے کے مشاہرے پر مدرس مقرر ہوئے دیوبند کی مسجد میں تعلیم نے کا آغاز کیا۔

دار العلوم دیوبند کی ابتدا انہایت سادہ تھی لیکن بانیان کی نیت سے اللہ نے اسے دن دگنی اور رات چوگنی ترقی دی مولانا محمد قاسم نانوتوی نے آغاز سے ہی اسے اپنی سرپرستی میں رکھا۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی کا اس کی توسیع میں بڑا عمل خل رہا۔ وہ خود ایک دقیق النظر بزرگ تھے۔ ان کے والد مولانا مملوک علی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، سرسید احمد خان، رشید احمد گنگوہی، مولانا محمود الحسن اور کئی دیگر استاد تھے۔

شروع میں دارلعلوم ایک چھوٹا سا مدرسہ تھا۔ لیکن جیسے جیسے طلبہ کی تعداد بڑھنے لگی تو دارالعلوم کی اپنی عمارت کی بنیاد رکھی گئی اور اللہ کے فضل وکرم دارلعلوم ایک بین الاقوالی حیثیت اختیار کر گیا اس کے طلبہ میں جزائر مالدیپ، روسی، ترکستان، بلوچستان اور ایران کے کئی طلبہ شامل دور ہونے لگے۔ اور یہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے اپنے علاقوں میں نمایاں کام کیا۔ دیوبند کے اطراف میں کئی مدارس آباد ہوئے جن کے امتحانات کی ذمہ داری ٹھہری۔

دارلعلوم سے فارغ التحصیل طلبہ میں جن بزرگوں نے بے پناہ اہمیت حاصل کی ان میں مولانا محمود الحسن، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا انور شاہ کاشمیری، عبد الحق حقانی، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ثنا اللہ امر تسری اور مولانا مظہر الدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے اپنی شبانہ روز محنت کی وجہ سے معاشرہ میں بہترین مذہبی کردار ادا کیا۔ مولانا عبید اللہ سندھی اس کے ناظم مقرر ہوئے جس کا قیام 1910 میں عمل آیا۔ مولانا احسن مرہووی کی سرکردگی میں جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں مختلف مکاتب فکر کے علماء نے شرکت کی۔ واضح کیا گیا کہ جمیعۃ الانصار ہرگز کسی انجمن کی نقل نہیں اور نہ کسی کے ذاتی مقاصد سے زیادہ اس کا تعلق ہے بلکہ وہ ضروری مقاصد جن کی آج بہت کچھ ضرورت ہے۔، اس کی بنیاد ہیں۔

خوش قسمتی یہ کہ دارالعلوم دیوبند کو شروع سے ہی ایسے بزرگ میسر آئے۔ پہلے سرپرست مولانا قاسم نانوتوی، دوسرے مولانا رشید احمد گنگوہی، تیسرے مولانا یعقوب نانوتوی اور ان کے بعد مولانا اشرف علی تھانوی

صاحب دارالعلوم دیوبند کے سرپرست رہے۔ دارالعلوم دیوبند کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہر سال ہزاروں لوگ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے لگے۔ دارالعلوم دیوبند قدیم طرز کی اسلامی درسگاہوں میں سب سے اہم گنا جاتا ہے۔ اس کی ترقی کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کا بیج ایسے ہاتھوں نے بویا جو خود تقویٰ اور پرہیز گاری کی نمایاں مثالیں تھے۔

دار العلوم کے مقاصد میں اس بات کو مد نظر رکھا گیا کہ قدیم ورثہ کی آب یاری کی جائے اس میں منطق، صرف و نحو اور فقہ پر ہی نہیں بلکہ حدیث کا خاص اہتمام کیا گیا جو شاہ ولی اللہ کے جانشیوں کی خصوصیت تھی۔

- نصاب تعلیم میں مذہبی علوم کے علاوہ تاریخ، ہندسہ اور طب کا انتظام بھی شامل رہا۔
- ابتدائی درجوں میں، اردو اور فارسی کی تعلیم کو ضروری سمجھا گیا۔
- دیوبند نے اصلاح نصاب کے دعوئے تو نہیں کیے لیکن خاموشی سے کئی امور میں اصلاحیں کیں۔

دیوبند نے قوم کی بڑی مذہبی اور علمی خدمت کی ہے۔ دیوبند کا نصاب ضروریات زمانہ کے لحاظ سے ناکافی سہی اور علمائے دیوبند کو حالات زمانہ اور مغربی مستشرقین یا دور حاضر کے مصری علما سے اتنی واقفیت نہ سہی جتنی ندوہ العلماء کو ہے۔ لیکن دیوبند کا پیمانہ بہت وسیع ہے۔ یہاں سے فارغ ہونے والے طلبا جنھوں نے ملک کے کونے کونے میں علم کے چراغ روشن کئے مذہب کی اشاعت کی بدعتوں اور غیر اخلاقی برائیوں کی اصلاح کی۔ ان میں تقوی پرہیز گاری اور روحانیت دوسروں سے زیادہ ہے۔

اس کے منتظمین کی قابلیت اور نیک نیتی کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی زندگی سنوارنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ فرائض مذہبی کی ادائیگی اور علمی ورثہ سے محبت دار العلوم کی منفردیت کو نمایاں کرتی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ دیوبند کی کامیابی علمی فتوحات کی وجہ سے کم جب کہ روحانی پاکیزگی اور تقوی و پرہیز گاری کو اختیار کرنے کی وجہ سے زیادہ ہوئی۔

برصغیر مسلمان ہند کے لیے اور ان کی مذہبی و ثقافی حالت کی بحالی کے لیے برطانوی سامراج سے یہ اعلان جہاد کیا گیا لہذا اس سے انگریزوں کی بدنامی میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا لیکن امت کے مرد مجاہدان نے ہمت نہیں ہاری بلکہ اپنے مشن کو جاری رکھا۔ عبید اللہ سندھی نے اپنا کام دہلی منتقل کر لیا اور وہاں انھوں نے نظارہ المعارف الالقرآنیہ کی بنیاد رکھی۔

> " دیوبند نے قوم کی بڑی مذہبی اور علمی خدمت کی ہے۔ دیوبند کا نصاب ضروریات زمانہ کے لحاظ سے ناکافی سہی اور علمائے دیوبند کو حالات زمانہ اور مغربی مستشرقین یا دور حاضر کے مصری علما سے اتنی واقفیت نہ سہی جتنی ندوہ العلماء کو ہے۔ لیکن دیوبند کا پیمانہ بہت وسیع ہے۔ یہاں سے فارغ ہونے والے طلبا جنھوں نے ملک کے

کونے کونے میں علم کے چراغ روشن کئے مذہب کی اشاعت کی بدعتوں اور غیر اخلاقی برائیوں کی اصلاح کی۔
ان میں تقوی پرہیز گاری اور روحانیت دوسروں سے زیادہ ہے۔[1]"

مولانا محمود الحسن(1851ء-1920ء) اور ان کے اصلاحی کارنامے

مولانا محمود الحسن کا شمار بر صغیر کے ان راہنماؤں میں ہوتا ہے جنہوں نے بر صغیر کے مسلمانوں میں فکر و عمل، عزم و استقلال اور استقامت کو پروان چڑھایا۔ مولانا محمود الحسن نے مولانا قاسم نانوتوی، مولانا مملوک اور سید احمد دہلوی سے علوم شریعہ کی تعلیم دیوبند سے حاصل کی۔

"مولانا محمود الحسن نے 1874ء میں بطور معاون دار لعلوم دیوبند میں ملازمت اختیار کی اور کچھ وقت کے بعد آپ دار العلوم میں بطور صدر مدرس مقرر ہوئے۔"[2]

تعلیمی و تدریسی خدمات

مولانا محمود الحسن نے اپنی تدریسی زندگی کے آغاز سے ہی دار لعلوم کے ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ بر صغیر کے مسلمانوں میں مسلمانوں میں علمی اور فکری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ حاجی امداداللہ مہاجر مکی سے باطنی علم و فضل میں مہارت حاصل کی۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی علمی شخصیت کی وجہ سے دارالعلوم میں طلباء کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

"آپ کے تلامذہ میں مولانا انور شاہ کاشمیری، عبید اللہ سندھی، مولانا حسین مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور دیگر نمایاں شخصیات شامل ہیں۔ جنہوں نے علمی و فکری اور دین میں نامور جماعتیں تیار کیں۔"[3]

آپ کی تدریسی خدمات کو دیکھ کر ایک بار اکابر صالحین اور محدثین کرام کا حلقہ درس یاد آتا ہے۔ مولانا محمود الحسن کو آئمہ اربعہ، فقہائے مجتہدین کے اقوال لفظ بہ آتے تھے۔ قرآن وحدیث مولانا کی زبان پر عام تھے۔ آپ کے لہجہ میں بناوٹ اور تصنع کا شائبہ تک نہ تھا، مدرسہ کے دروازے تک آپ کی آواز بلا تکلف تھی، آپ کی بات دل پر اثر انگیز ہوتی تھی اور سننے والا خوب سمجھ جاتا تھا کہ آپ جو کچھ بیان کر رہے ہیں وہ بالکل سچ پر مبنی ہے۔

مولانا محمود الحسن اپنے علمی حلقہ میں ایک مشہور و معروف مدرس کی حیثیت رکھتے تھے۔ اپنے اسباق کو بڑی محنت اور توجہ سے پڑھاتے تھے اِسی نسبت مولانا بجنوریؒ لکھتے ہیں کہ آپ کے مدرسین میں انور شاہ کاشمیری اور شبیر احمد عثمانی وغیرہ موجود ہوتے، بخاری شریف کے درس میں آپ کو اصل متن پر مکمل عبوراور گرفت حاصل

---

1 محمد اکرام، شیخ، موج کوثر، (ادارہ ثقافت اسلامیہ: لاہور، 2003ء)، ص 211

2 محمد طیب، قاری، مولانا، **روداد دار العلوم دیوبند**، (رمز اہتمام دار العلوم دیوبند، 1988ء)، ص 10

3 محبوب رضوی، سید، **تاریخ دار العلوم دیوبند**، (ادارہ اہتمام دار العلوم، دیوبند، 1993ء)، ج 2، ص 33

تھی۔کتاب کی شروحات اور حواشی پر مولانا کو مکمل گرفت تھی۔بڑے استدلال اور مدلل انداز میں درس دیتے اوراس دوران شرح قسطلانی سے کام لیتے، تمام آئمہ اکرام کا احترم کرتے تھے۔

شاہ ولی اللہ کے طرز تقریر و تدریس کو آپ نے مکمل طور پر اپنایا اور شاہ صاحب کے اقوال بڑی ہی محبت اور عقیدت سے بیان کرتے۔ آپ کا درس محض شروح وحواشی پر مبنی نہ تھا گو کہ آپ کی ان پر گہری نظر تھی بلکہ آپ ان سے استفادہ ہوتے اوراستدلال کرتے کیونکہ اس سے ذہین کے در کھل جاتے ہیں۔ دوران تدریس فکری پہلوؤں کو اجاگر کرتے اور دلیل کے طور پر احادیث مبارکہ سے استدلال کرتے۔ اور کچھ سوال ذہن میں پیدا ہوتا تو اپنی رائے اور تحقیق سے اس کی وضاحت کرتے سند حدیث کا سلسلہ شاہ ولی اللہ پر ختم کرتے درس و تدریس میں قرات وحدیث دواسناد سے ذکر کرتے۔

1۔ عن مولانا قاسم عن شیخ شاہ عبد الغنی عن شاہ محمد اسحاق عن شاہ عبد العزیز عن شاہ ولی اللہ۔

2۔ عن شیخ احمد علی عن شاہ محمد اسحاق عن شاہ عبد العزیز عن شاہ ولی اللہ۔

آپ بڑے اہتمام اور تیاری کے ساتھ درس دیتے اور طلبا میں علمی اور فکری پہلوؤں کو اجاگر!کرنے کی سعی کرتے۔[1]

اصلاح وتزکیہ کی مساعی

خیر اور شر میں فرق اللہ نے انسان کے اندر فطری طور پر رکھا ہے اور اسے یہ صلاحیت بخشی ہے کہ وہ اس میں فرق کرنے کی استعدادرکھے سلوک وتصوف اسی آئینہ کا نام ہے جو اس دھند کو واضح کر دیتا ہے اور اچھائی برائی پر غالب آنے لگتی ہے ۔ مولانا کی شخصیت سلوک وتصوف کی آئینہ دار تھی۔آپ کے مسلمان کی حیثیت سے قلبی اطمینان کے لیے اسے ہر مسلمان کی ضرورت قرار دیا۔

> "مولانا عبد القادر رائے پوری نے تصوف کو سمجھنے کے لیے جس بات سے استدلال وہ قلب مطمعنہ اور اخلاص کی سعی ہے ۔ اور کہا کہ تصوف تو عشق خداوندی اور اخلاص پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور اللہ کے احکام کی پیروی ان دونوں باتوں کے بغیر ممکن نہیں۔"[2]

اس میں کوئی شک والی بات نہیں اخلاص کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ دل میں نیک نیتی ڈال دیتا ہے۔ جو انسان کو ایمان کے اعلیٰ درجہ تک لے جاتی ہے۔ زیر تخت شخصیت کی زندگی پر نگاہ ڈالی تو واضع ہوتا ہے مولانا محمود الحسن نے اخلاص و تصوف کو اپنی زندگی کا مرکز بنائے رکھا۔عابد وزاہد والدین کے زیر سایہ بڑھے ہونے کے بعد مولانا قاسم نانوتوی اور اشد احمد گنگوہی جیسی علمی شخصیات سے بطور تلمیذ اصلاح و تقویٰ کی تربہت پائی۔

---

1 بجنوری، عزیز الرحمن، مفتی، **تذکرہ شیخ الہند**،(ادارہ مدنی دار التالیف: بجنور)ص 65

2 ندوی، سید ابو الحسن، **سوانح مولانا عبد القادر رائے پوری**، ص 299

گو کہ تصوف کے روایتی طریقہ کار سے آپ نہ گزرے لیکن 1877ء میں حج کے سفر کے دوران حاجی امداداللہ مہاجر مکی سے بیعت ہوئے۔ اِس دوران مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی بھی ہمراہ تھے۔ وطن واپسی پر بھی اصلاح اور تزکیہ بالنفس کا سفر مولانا رشید احمد گنگوہی کے ہمراہ جاری رہا۔ مولانا نے ان باتوں کو اپنی زندگی کا محور و مسکن بنائے رکھا۔ اور حضرت گنگوہی کی محبت و شفقت سے مستفید ہوتے رہے۔

بدعات اور تصوف کے نام پر غلط رسوم ورواج جنہوں نے مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ مولانا اس بات سے استدلال کرتے ہیں تصوف اصلاح اور ہدایت و کامیابی کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ لیکن جن باتوں کا ذکر بالا سطور میں کیا گیاان سب باتوں کو تصوف کے نام پر ادا کیا گیااور ہر مجرم نے اپنے جرم کو ہلکا کرنے کے لئے تصوف میں پناہ لی۔ چنانچہ وہ تصوف جو اصلاح و تزکیہ کا نام ہے اس کے لبادہ میں فسق وفجور اور بداطواری نے فروغ پایا۔

مولانا اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ اس کمزور پہلو کے باوجود تصوف و سلوک کی اہمیت اور اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اگر اس کی اصل پر نگاہ دوڑائی جائے تو وہ اپنے اصل کے اعتبار سے صالح خمیر کا حاصل ہے۔ اس کمزور پہلو کی ایک وجہ قرآن وحدیث کے فلسفہ ھدایت کو سمجھنے میں کوتاہی ہے۔

مولانا محمود الحسن اکثر فرمایا کرتے تھے جیسے جیسے برصغیر کے رہنے والوں ان سے منہ موڑا یہاں بدعات نے گھر کر لیا۔ دار العلوم کی یہ ذمہ داری ہے کہ روایت سے اپنا رشتہ برقرار رکھے۔ کیونکہ اتباع قرآن و سنہ ہی وہ واحد راستہ ہے جو اصلاح و تزکیہ کے راستہ کی گرد کو صاف کر سکتا ہے۔ حضرت شیخ الہند بھی رسول سنت کی پیروی کا اہتمام کرتے وہ فرماتے کہ حقیقی منزل صرف اتباع رسول میں ہی مضمر ہے۔ [1]

علمی تصانیف کے ذریعے تجدید واصلاح

مولانا محمود الحسن کی علمی خدمات پر نظر ڈالی جائے تو ان کی مجموعی کاوشوں کو بالعموم ایک صالح معاشرہ کی تشکیل کا مظہر قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور ان کے علمی کارناموں کو بجا طور پر چار اہم نقاط کے تحت دیکھا جاسکتا ہے۔

1۔ کتب

2۔ فتاویٰ

3۔ تقاریر

4۔ شاعری

"حضرت شیخ الہند نے اپنی کتاب "الابواب والتراجم" میں متعلقات حدیث سے متعلق متقدمین اور متاخرین کی آراء کو ذکر کیا گیا ہے۔ الابواب التراجم کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ اسے اردو زبان میں ذکر کیا گیا جو فہم حدیث

---

1 بجنوری، عزیز الرحمن، **تذکرہ شیخ الہند**، ص 101

کے سلسلہ میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد کام ہے۔ اور مولانا محمود الحسن نے جس اسلوب کو اپنایا وہ اپنی جگہ اہم ہے۔ تفہیم حدیث کی اساس انہیں اصولوں پر رکھی جو انداز صحابہ اکرام کا تھا۔"[1]

بر صغیر کے انگریزی دور حکومت میں جو ایک بڑا مسئلہ تھا وہ تقلید اور عدم تقلید تھا بر صغیر کی اکثریت مسلمان فقہ حنفی سے متاثر رہے **"ادلہ کا مسئلہ"** رسالہ میں غیر مقلد جماعت کے اعتراضات کا جواب دیا گیا جو علمی طور پر اپنی طرز کا ایک منفرد رسالہ ہے۔

ادلہ کا مسئلہ "کا دوسرا نام اظہار الحق ہے۔ ایسی **"الجہد المقل"** فن مناظرہ کی ایک علمی کتاب ہے۔ "جو بدعات کے رد میں لکھی گئی۔ اس رسالہ میں کلامی مباحث کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ایک اسی کتاب جو وقتی پیدا ہونے والے مسئلہ کے لئے علمی انداز میں لکھی گئی۔ جو در حقیقت لکھنے والے کی علمیت اور دیانت داری کی عکاس ہے۔"[2]

اسی طرح مولانا کی ایک مشہور تصانیف جسے مقبولیت کا درجہ حاصل رہا اور جس نے آپ کے نظریات کی بھرپور عکاسی کی "الجہد المقل" آپ کی یہ تصنیف اصل میں بدعت اور اس کے حاملیں کی نفی میں لکھی گئی۔ جو سنت و شریعت حمایت کرتی ہے۔ یہ کتاب کلامی حیثیت سے ایک نمایاں کتاب ہے مولانا استدلال کرتے ہیں کہ اس کتاب کا مرکزی موضوع امکان کذب باری اور امکان نظر باری تعالیٰ ہے۔ اہم بات یہ کے اس میں دیگر اسلامی فکر کا جائزہ لے کر ان کے نظریات وافکار پر بحث کی گئی ہے۔[3]

اس کتاب کی منفرد بات یہ ہے کہ اِس میں ٹھوس کلامی مباحث کو عمومی طور پر زیر بحث لایا گیا ہے۔ جس سے اس کی اہمیت ہمیشہ بر قرار رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ جس سے مولانا کی علمیت اور تحریر حقیقی طور پر واضح ہوتی ہے۔

"افادات محمودیہ" مولانا کی دو اہم تقاریر کا مجموعہ ہے پہلی تقریر کا عنوان "وحی" ہے۔ جس میں وحی کے متعلق لغوی معنوں سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد عرفی اور اصطلاحی معنوں میں کلام کیا گیا ہے۔ رسول ﷺ اور اللہ تعالیٰ کے کلام میں فرق واضح کرتے ہوئے دونوں کو دلیل مانا گیا ہے۔ استدلال کے طور پر وحی محمد ﷺ پر بحث کرتے ہوئے پیش کیا:

﴿اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ عِيْسٰى وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ

1 خان، اقبال حسن، **شیخ الہند مولانا محمود الحسن حیات اور کارنامے**، (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 1973ء)، ص165

2 اصغر حسین، میاں، **حیات شیخ الہند**، ص116

3 محمود الحسن، مولانا، شیخ الہند، **الجہد المقل**، ص49

وَ سُلَیْمٰنَ ۚ وَ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا﴾[1]

(بیشک اے حبیب! ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی جیسے ہم نے نوح اور اس کے بعد پیغمبروں کی طرف بھیجی اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کے بیٹوں اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف وحی فرمائی اور ہم نے داوٗد کو زبور عطا فرمائی۔)

اس رسالہ کا دوسرا حصہ جس میں دوسری تقریر جس کا موضوع:(لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ)[2]**(جس شخص میں امانت نہیں اس کا ایمان ہی نہیں)۔ میں سورۃ الاحزاب کی آیت**﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا﴾[3]**(بیشک ہم نے آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر امانت پیش فرمائی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس امانت کو اٹھالیا بیشک وہ زیادتی کرنے والا، بڑا نادان ہے،)** سے بحث کی گئی ہے۔

اِس تقریر میں مولانا محمود الحسن نے امانت کے معنی و مفہوم کی وضاحت کی ہے اور انسان کے ظالم اور جاہل ہونے کے فلسفہ کو واضح کیا ہے۔ اور اس مسئلہ پر قرآن وحدیث کو مقصد قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں احادیث مبارکہ کی بنیاد قرآن حکیم کو قرار دیتے ہیں۔ اور فرمایا کہ قرآن وحدیث اپنے مصدر کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔ البتہ فنی فرق کی وجہ سے متلو اور غیر متلو کے اعتبار سے دنوں کی حیثیت اور نوعیت بدل جاتی ہے۔

اس کے علاوہ "الفلاح الادلہ" جو کہ ادلہ کا مسلہ کی تشریح و توضیح میں لکھی گئی۔ اس کے مرکزی موضوعات میں آئمہ مجتہدین کا فن حدیث میں مقام مرتبہ رفع یدین، حقیقت ایمان، تقلید کی ضرورت و اہمیت، ایمان میں زیادتی اور کمی، اسلامی حکومت اور اس کی ذمہ داریاں، بیع فاسد کی تحقیق محارم نکاح، قاضی کے نفاذ کی شرعی اور عقلی بحث وغیرہ جیسے موضوعات پر علمی اور کلامی بنیاد پر بحث کی گئی جو کہ مولانا کے علمی اسلوب کو واضح کرتی ہیں۔

اِس کے علاوہ آپ کی مشہور کتب میں "**حاشیہ مختصر المعانی**"، علامہ سعد تفتازانی کی کتاب " مختصر المعانی " فصاحت و بلاغت کے حساب ایک نایاب کتاب ہے اور دار لعلوم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہاں نصاب میں اِس کتاب کو شامل کیا گیا۔ علامہ محمود الحسن نے طلبہ کو پیش آنے والی لفظی دشواریوں کے سبب اِس کا حاشیہ لکھا جس میں الفاظ کو سادہ انداز میں بیان کیا اور ان کی وضاحت کی۔ تقریر ترمذی، تصحیح ابی داوٗد مقدمہ، ترجمہ قرآن شریف، احسن القری فی اوثق العری، آپ کی یہ کتب کلامی مباحث پر مشتمل ہیں جن میں مختلف موضوعات پر علمی گفتگو کی گئی ہے۔

مولانا محمود الحسن نے فتاویٰ نویسی کی خاصی خدمات سرانجام دی ہیں لیکن اس ذمہ داری کو قبول نہیں کیا۔ جو

---

1 النساء 163:4

2 مشکوۃ المصابیح، رقم الحدیث: 32

3 الاحزاب 72:33

فتاوی مولانا کی طرف منسوب ہیں یہ بھی حقیقت ہے کہ اِس میں غیروں کا حصہ بھی شامل رہا۔ لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ وہ بھی آپ ہی کی علمی دین ہیں۔ مفتی عزیز الرحمن استدلال کرتے ہیں گو کہ:

"آپ نے اِس سے اجتناب کیا لیکن یہ بات قابل قبول نہیں کہ آپ سے کوئی فتاوی ثابت نہیں۔ کیونکہ آپ کی بے شمار دستخطیں موجود ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ آپ نے اِس کام سے منہ نہیں موڑا ہے۔ ترک موالات کا فتوی اسلامیان ہند کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔"[1]

اسی طرح سید اصغر حسین لکھتے ہیں کہ:

"زمانہ طالب علمی میں مجھے فتوی نویسی کے شوق تھا تو مولانا صاحب مشکل مسائل دریافت کر کے لکھ دیتا تھا۔ مولانا محمود الحسن کا تواضع اور کسر نفسی ہمیشہ فتوی لکھنے کی راہ میں حائل رہا۔ لیکن مولانا صاحب جو فتوی لکھتے اسے خطوط کے انداز میں لکھتے اور اپنے شاگردوں کو مراجع بنادیتے تھے۔ اور تمام فتوی پر آپ کے دستخط موجود ہوتے۔"[2]

کسی بھی قوم کی مرکزی حیثیت کو پر کھاجائے تو فن خطابت نمایاں اہمیت کی حامل نظر آتی ہے۔ تاریخ کو دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اسی کی بنیاد پر افراد عالم نے میدان جیتے ہیں۔ ایسے بہت سے مقررین جنہوں نے قوم میں نئی روح پھونکی اور انہیں عمل کی قوت اور جرات کی توانائی کی مثال کے طور پر طارق بن زیادہ اور حجاج بن یوسف عربی دنیا کے مانے ہوئے خطیب جنہوں نے اپنی خطابت سے دنیا کا نقشہ بدل دیا۔

یہی نوعیت بر صغیر میں بھی عام رہی زعماء اصلاح نے لوگوں میں جوش جذبہ ابھارا جنگ آزادی کے آخری دور جن شخصیات نے بر صغیر کی تاریخ پر اپنی یادوں کے گہرے نقش چھوڑے ہیں جن کے فن خطابت سے قوم میں نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا۔ ان میں شیخ محمود الحسن کی شخصیت بہت ابھر کر نمایان ہوتی ہے۔ چونکہ خطابت مولانا صاحب کا پیشہ نہ تھا لیکن جب ممبر پر بولتے تو جوش و جذبہ واضح نظر آتا ایک ولولہ انگیز اور عہد ساز شخصیت نے قومی شعور بیدار کیا۔ عبد الغفار مدہولی لکھتے ہیں:

"مجھے وہ وقت یاد ہے جب مولانا صاحب جن کی آنکھیں طلباء کو دیکھ کر روشن ہو گئیں تھیں اور مخاطب تھیں کہ اگرچہ سب کچھ بگڑا اور بکھرا ہوا نظر آرہا ہے۔ لیکن مرد مؤمن کی طرح ہمت کی جائے تو اللہ کی مدد کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ان کا اشارہ قوم کی آنے والی نسلوں کی طرف تھا۔

---

1 عزیز الرحمن، مفتی، **تذکرہ شیخ الہند**، ص74

2 اصغر حسین، سید، **شیخ الہند حیات وکارنامے**، ص186

شیخ الہند نے مخاطب ہوئے خطاب کیا میرے نوجوانوں میں نے دیکھا ہے۔ میرے درد کے غم خور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ جبکہ خانقاہوں اور مدرسوں میں کم ہیں۔ تو میں نے اور میرے دوستوں نے ایک قدم علی گڑھ اور ایک قدم دارالعلوم کی طرف بڑھایا ہے۔ تاکہ دو تاریخی مقاموں کو آپس میں جوڑا جاسکے۔"[1]

شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"یہ جامع اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری ہے کہ میری قوم کے نوجوانوں کو اللہ نے یہ توفیق دی ہے۔ کہ وہ اپنے اچھے اور برے کا موازنہ کریں۔ کیونکہ علوم دینیہ کے دودھ میں جو زہر ملا ہوا ہے اسے کسی بھپکے کی ضرورت ہے۔ آج اسی کے لئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اور یہ بھپکا مسلم نیشنل یونیورسٹی ہے۔ ہماری اس قومیت جو کہ عظیم الشان ماضی رکھتی ہے۔ اس کا اب یہ فیصلہ ہونا چاہئے کہ اس کے کالج اور یونیورسٹیاں بغداد اور قرطبہ کی عظیم الشان مدارس کی طرح اپنا وجود قائم کریں جنہوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنا کر رکھا۔"[2]

مولانا کے خطبات عمومی طور پر سماجی اور سیاسی موضوعات کے حامل رہے۔ ان کی زندگی مدبرانہ اور مجتہدانہ رہی۔ ان کے خطبات کی روشنی میں برصغیر کے اس عہد کی مکمل تصویر نظر آتی ہے۔ جملوں میں وقار روحانیت، حوصلہ، ٹھہراؤ، الفاظ کا مناسب استعمال ان کی تقاریر نظری سے زیادہ عملی اور خالص تجزیاتی مثالیں پیش کرتی ہیں۔ کیونکہ اس دور میں انگریزوں کا تسلط اور ان کی ریشہ دانیاں خلافت کے وقار کے لیے ایک چیلنج سے کم نہیں تھیں۔ اور مسلمانوں نے اس چیلنج کو قبول کیا اور خلافت کے وقار کو قائم رکھنے کے لیے ہر طرح سے مدافعت اختیار کی۔ مولانا کے خطبات کا مقصد مسلمان روایت کو از سر نو زندہ کرنا تھا۔ اسی طرح انہوں نے اپنی شاعری میں بھی ملی اور قومی جذبات کی عکاسی کی اور نوجوانان ملت کے جوش وجذبہ کو ابھارا۔

مولانا احمد رضا بریلوی (1856ء-1921ء) اور ان کی فکری واصلاحی جدوجہد

مولانا احمد رضا بریلوی "فنافی حب الرسول" کی وجہ سے اعلی حضرت کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ کے آباء نے آپ کے دینی شعور اور تعلیم وتربیت میں اہم کردار ادا کیا اپنے والد محترم کے زیر سایہ عقلی اور نقلی علوم صالح حاصل کیے اور اپنے وقت کے معروف علما وفقہا سے تعلیم حاصل کی۔ اور اپنی تعلیمی، دینی ملی خدمات کی وجہ

---

1 مدہولی، عبدالغفار، **جامعہ کی کہانی**، (قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان: نئی دہلی، 1953ء)، ص27

2 محمود الحسن، شیخ الہند، مولانا، **خطبہ صدارت مع فتوی**، (از غنی المطابع، دہلی، 1339ھ)، ص6

سے ایک مجدد کی حیثیت سے سامنے آئے۔[1]

شاہ آل رسول مہاروی سے علوم شریعہ کی تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے اپنے بارے میں لکھا:

((اصدرت اول الفتیا وکتف الثالث عشر فی عمرة والحمد للہ علی ذلك في اليوم الرابع عشر،من شهر شعبان عام 1286 ھ وهو شا الله يمدحياتى الى اليوم العاشر من شهر شعبان عام 1336ھ يثبت خمس عاما فى لافتاء استطيع ان اثنى على اللہ وعلا حق الثناءعلىہ))[2]

(میں نے جب پہلا فتوی صادر کیااس وقت میری عمر تیرہ برس تھی اور شعبان کی چودہ تاریخ تھی۔ اس پر میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اگر 1336ھ تک شعبان میری عمر لمبی کر دی گئی۔ تو اس طرح میں فتوی میں پچاس سال گزارنے والا ہو جاؤں گا۔ اور اس پر میں اللہ کے شکر اور تعریف کا حق ادا نہیں اور کر سکتا)۔

اور اس طرح مسلسل علوم حاصل کرتے رہے یہاں تک کہ ان کے علوم کی تعداد بچپن تک چلی گئی تھی۔

مولانا احمد رضا بریلوی کی وجہ شہرت ان کی وہ تصنیفات ہیں جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ اور اللہ کی محبت کے عنوان سے تحت تحریر کیں۔ احمد رضا بریلوی نے بر صغیر ہند میں ایک نئی فکر کی بنیاد رکھی۔ اور اس کا اظہار اپنے خطابات میں کیا۔ مولانا احمد رضا بریلوی کی فکر کا بنیادی کے مقصد رسول اللہ کی محبت و عقدت اور عشق رسول کو عام کرنا اور مسلمانوں کو محبت رسول اور اطاعت رسول کی دعوت دیتا رہا۔ مولانا ظفر الدین اس بات سے استدلال کرتے ہیں۔

(کہ آپ کے نزدیک ایمان کی بنیاد اصل رسول اللہ کی تعظیم و تکریم ہے۔ اس کو ایمان کی جڑ قرار دیتے ہیں۔ اور تمام مخلوقات میں تعریف کی اصل مستحق ذات محمد رسول اللہ کی ہے)۔[3]

احمد رضا بریلوی کا فکری اور اصلاحی کارنامہ

مولانا احمد رضا بریلوی بر صغیر کی ایک نامور شخصیت رہے۔ جنہوں نے تقدیس الہی، رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام کی عظمت عظمت و تقدس، مقام اولیا اللہ، فلسفہ کے خلاف اسلامی افکار و نظریات، جھوٹے اور فریبی صوفیوں کی شرع کے خلاف حرکات و سکنات اور بدعات کارد اور غلام احمد قادیانی کے خلاف بھرپور مذمت کی۔

سرفراز خان صفدر لکھتے ہیں:

مولانا احمد رضا بریلوی نے اسلام کے بنیادی عقائد، توحید، رسالت ونبوت، حیات بعد الموت، فرشتوں، یوم القیامہ اور خیر و شر کی تقدیر ایمان، ادب واحترام اور تعلیم ان کی فکر کا بنیادی عنصر رہا۔ تمام صحابہ اکرام اور

---

1 نیازی، شیخ کوثر، **امام احمد رضا بریلوی و شخصیۃ الموسوعہ**، (رضا اکیڈمی: لاہور، 1995ء)، ص152

2 نوری، عبد الحکیم اختر شاہ جہان، **مولانا احمد رضا خان کے رسائل**، (مکتبہ حامدیہ: لاہور، 1988ء)، ص315

3 قادری، ظفر الدین، مولانا، حیات اعلی حضرت، (نعمانیہ بلڈنگ: لاہور، 1992ء)، ص60

ازواج مطہرات کی عظمت اور مصلحین امت کو اللہ کی بارگاہ سے ملنے والے اعزازات کو تسلیم کرنا اور علم کو اللہ کی رضا ماننا۔ بیسوی صدی میں انہوں نے جس فکر کو ابھارا اور برصغیر ہند میں بے حد مقبول رہے۔ اس کا زیادہ تر تعلق فروعی اور ثانوی مسائل سے ہے۔ جن میں سے تصور شیخ، قیام میلاد مصطفی، رسول اللہ کی موجودگی کا تصور، فاتحہ خوانی، چہلم برسی وغیرہ کے تصور۔[1]

انہوں نے اس بات سے استدلال کیا کہ رسول اللہ ﷺ پر جب درود پڑھا جاتا ہے تو وہ درود کا جواب دیتے ہیں۔ آپ مسلم امہ کے حالات اور اعمال سے واقف ہیں۔ ختم نبوت سے انکار کرنے والے دائرہ اسلام سے خارج ہیں اور اہل بیت اور صحابہ اکرام کی محبت کو ایمان کا جزو قرار دیتے ہیں۔

شیخ محمد اکرم لکھتے ہیں:

"مولانا احمد رضا بریلوی نے بے حد شدت سے حنفی طریقوں کی حمایت کی اور انہوں نے ہمیشہ امام ابو حنیفہ کے مقلد کی حیثیت سے ہی فتوی دیا۔ اور حنفی مذہب کی تائید میں ہی عرس، تصوف، گیارہویں، میلاد اور نماز میں ہاتھوں کا زیر ناف باندھنا جیسے اعمال کو اپنایا۔ اور اس فکر کی ترغیب دی۔ ان کے نزدیک کسی بھی کلمہ گو مسلمان کو مشرک یا بدعتی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کسی نئے اچھے کام کو بدعت حسنہ سمجھتے ہیں۔ جبکہ اگر کوئی کام دین کی تعلیمات کے خلاف یا اس کے متصادم ہوتا تو اسے بدعت سیئہ قرار دیتے ہیں"۔[2]

عقائد اور افکار میں احمد رضا بریلوی سلف صالحین اور متقدمین کے مقلد نظر آتے ہیں۔ انہوں نے سیاسی اور مذہبی امور میں احیائے فکر اور تجدید تطہیر کے فرائض سر انجام دیتے۔ مولانا بریلوی کلمہ گو کو مسلمان قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس قول و عمل میں روح اسلام کو جیتا جاگتا دیکھنے کے قائل ہیں۔ کسی بھی فعل میں خواہ وہ تاریخی ہو، تہذیبی ہو، یا تمدنی و سماجی اس حد تک چھوٹ کے قائل رہے کہ اس قول و عمل سے شریعت متصادم نہ ہوں۔ وہ اس شخص کو "بدعتی" قرار دیتے ہیں۔ جو دین میں نئی نئی باتوں کو داخل کرے۔ اور اس شخص کا تعاقب کرتے تھے جو تجدید کے بہانے جو بے راہ روی اختیار کرتا تھا۔ انہوں نے معاشرہ کے رسوم و رواج جو خلاف شرع تھے تنقید کی ہے۔[3]

احمد رضا خان اس بات سے استدلال کرتے ہیں۔ کہ اگر کوئی شخص فرایض و سنت کو چھوڑ کر مستحبات اور مباحات کے پیچھے لگا رہے۔ تو سید بریلوی کے ہاں ایسے لوگوں کی نیکیاں مردود ہیں۔ وہ اس تقسیم کو بھی ناپسند اور رد کرتے ہیں کہ شریعت اور طریقت کو الگ الگ قرار دیا جائے۔ کیونکہ عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ جس کا کوئی پیر و مرشد نہیں اس کا پیر ابلیس ہے۔ احمد رضا بریلوی اس کا رد کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:

---

1 سر فراز خان صفدر، محمد، **تفریح الخواطر رد تنویر الخواطر**، (ادارہ نشر و اشاعت نفرۃ العلوم، 1977ء)، ص 58

2 محمد اکرم، شیخ، **موج کوثر**، ص 16

3 بریلوی، احمد رضا خان، **اعلام الاعلام**، (مطبوعہ بریلی، 1304ھ)، ص 15

"انجام کار رستگاری کے لیے صرف نبی محمد کو مرشد جاننا کافی ہے لیکن وہ بیت اور مریدی کے خلاف نہیں اصلاح باطن کے لیے اسے مفید قرار دیتے ہیں۔ اس بات سے بھی استدلال کرتے ہوئے۔ اس کارد پیش کیا ہے۔ کہ مزارت پر سجدہ تعظیمی کفروشرک کے سوا کچھ نہیں"۔[1]

انہوں سجدہ تعظیمی کے خلاف ایک **مستقل** رسالہ لکھاہے اور لکھتے ہیں:

"سجدہ حضرت عزت عزجلالہ کے سواکسی کے لیے نہیں۔ اس کے غیر کو سجدہ عبادت تو یقینا اجماعا شرک و کفر مبین ہے۔ اور سجدہ تحیت حرام گناہ کبیرہ بالقین گناہ ہے"۔[2]

تبرکاً بھی مجسمے اور تصویریں گھروں میں لگانے کی ممانعت کرتے ہیں۔ البتہ نعلین مبارک اور قبہ شریف کے عکس جائز احسن قرار دیتے ہیں۔ مرنے کے بعد کی رسومات فاتحہ چہلم اور برسی وغیرہ کی روح کو جائز قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی غیر ضروری لوازمات بے اصل قرار دیتے ہیں اور غلط تصور کرتے ہیں۔ اسی طرح ثواب کی نیت سے اس رسم کی تائید نہیں کرتے کہ کھانا سامنے رکھا جائے البتہ اگر کوئی رکھ لے اور اسے بعد میں تقسیم کر دیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ میت کی فاتحہ اور ایصال ثواب کے لیے غرباء اور مساکین کو امراء اور رشتہ داروں پر فوقیت دیتے ہیں۔[3]

اسی طرح انہوں نے زیارت قبور کے مسئلہ پر عورتوں کے قبرستان جانے کی سختی سے ممانعت کی اور رسالہ لکھا۔ "**جمل النور فی نہی النساء عن زیارۃ القبور**" مگر رسول اللہ ﷺ کی قبر کی زیارت کو اس سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ اور ان کے قبر کی زیارت احادیث صحیحہ سے ثابت قرار دیتے ہیں۔ البتہ بزرگان کی قبور کی زیارت اور مزاروں پر جانے سے روکتے ہیں۔ اس بات سے استدلال کرتے ہیں۔ قبروں پر چراغ جلانا بدعت ہے اور مال کا ضیاع کرنا ہے۔ البتہ یہ دلیل دیتے ہیں۔ کہ اگر مزار نمازیوں کے راستہ میں ہو تو چراغ جلانے سے فائدہ ہو اس صورت میں مستحب ہے۔ ان کے نزدیک وہ کام جس سے دینی فائدہ اور دنیوی نفع حاصل نہ ہو وہ بے کار ہے۔ اور ایسے کاموں میں مال خرچ کرنا اسراف ہے اور اسراف اسلام میں حرام ہے۔[4]

چونکہ برصغیر میں خانقاہوں اور مقابر پر عرس اور قوالیوں کارواج تھا۔ اور اعراس کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا تھا۔ سید احمد رضا اس قوالیوں کا رد کرتے ہیں۔ حتی کہ ایسے اعراس وغیرہ میں شرکت کی ممانعت کرتے ہیں۔ جہاں مزار پر قوالی کا اہتمام ہو انہوں عرس کے جواز کا فتویٰ دیا لیکن اس کو شرعی قیود سے مقید کر دیا ہے۔ کہ

---

1 بریلوی، احمد رضا خان، **الزبدۃ الزکیہ لتحریم سجود التحیہ**، (مرکز اہل سنت، برکات رضا: 1998ء)، ص6

2 بریلوی، احمد رضا خان، **فتاوی افریقہ السنیۃ الانیقہ** (مکتبہ قصہ ملت، دہلی)، ص124

3 محمد حسین، مولوی، **الملفوظ**، (حسینی پریس بریلی، 1956ء)، ص45

4 بریلوی، احمد رضا خان، **البریق المنار بشموع المزار**، (مکتبہ اعلیٰ حضرت: بریلی)، ص97

اگر دور جدید میں ہونے والے اعراس کو دیکھا جائے تو ان میں کوئی نہ کوئی شرط معدوم نظر آتی ہے۔[1]

سید احمد رضا بریلوی نے ملت اسلامیہ کو ہر طرح کے اسراف سے پرہیز گاری کی تلقین کی۔ وہ بدعات کو مذہب اور معاشرت دنوں کے لیے خراب تصور کرتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس سے نیکی کی رغبت ختم ہو جاتی ہے کیونکہ جب تک دل صاف ہے خیر کی خبر دیتا ہے اور اسی کی دعوت بھی دیتا ہے۔ اور بدعات کی کثرت اسے اندھا کر دیتی ہے۔ اصلاح معاشرہ میں سید احمد رضا بریلوی نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اگر ان کے علوم فنون کی بات کی جائے تو انہوں نے 55 سے زائد علوم پر عبور حاصل کیا۔ جس میں قرآت، تجوید، علوم القرآن، علم حدیث، علم تفسیر، اصول حدیث، علم العقائد والکلام، علم مناظرہ، علم حساب، اصول فقہ، علم حیاۃ، علم ہندسہ، اسماء الرجال، سیر تاریخ، ادب، تصوف اور سلوک وغیرہ۔[2]

مولانا کے جن علوم کا تذکرہ کیا ہے ان پر انہیں تبحر حاصل تھا۔ جس کا اندازہ ان کی علوم فنون پر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتب سے لگایا جا سکتا ہے اردو زبان میں قرآن حکیم کا ترجمہ **"کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن"** ایک امتیازی، شان کا حامل ہے۔ جس پر مولانا نعیم الدین مراد آبادی نے "خزائن العرفان فی تفسیر القرآن" کے عنوان سے تفسیری حواشی کو لکھا ہے۔ جو متعدد بار ہند و پاک سے برابر شائع ہو رہا ہے۔ تراجم کے تقابلی مطالعہ سے دیکھا جائے۔ سید احمد رضا بریلوی نے جس عاقبت اندشیانہ احتیاط کو ملحوظ خاطر ہے اُسے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دیگر علمی مشاغل اور مصروفیات کے باعث وہ تفسیر قرآن کو مکمل نہ کر سکے۔ یہ کام ان کے تلامذہ اور پھر ان کے تلامذہ نے ادا کیا۔ جس کی نمائندہ مثالیں تفسیر نعیمی، ضیاء القرآن، تفسیر تنویر القرآن اور تفسیر حسنات اہم ہیں۔[3]

علم حدیث و فقہ کے ذریعے تجدیدی کام

سید احمد رضا بریلوی نے علم حدیث میں بھی کمال حاصل کیا۔ ان کے فتوی اور رسائل کے مطالعہ سے ان کے علم حدیث پر عبور کا اندازہ ہوتا ہے۔

* النھیٰ الاکید عن الصلوٰۃ وارء عبدی التقلید
* حاجز البحرین الواقي عن جمع الصلاتین
* مدارج: طبقات الحدیث
* الھاد الکاف في حکم الضعاف

---

1 بریلوی، احمد رضا خان، **مواہب ارواح القدس کشف حکم العرس**، (نوری کتب خانہ: لاہور، 1324ھ)، ص14

2 شاہجہان پوری، عبد الحکیم اختر، **الاجازۃ الرضویہ لمبجل مکۃ البھیۃ**، (مکتبہ اعلی حضرت: بریلی، 1327ھ)، ص24

3 بہاری، ظفر الدین، مولوی، **حیات اعلیٰ حضرت**، (رضا اکیڈیمی: بمبئی، 1399ھ)، ج1، ص97

وغیرہ علم الحدیث کے اوپر ان کی مشہور کتب ہیں۔[1]

علم فقہ پر عبور اور مہارت حاصل ہونے کا اندازہ سید ابوالحسن علی ندوی کے تاثرات سے لگایا جاسکتا ہے۔

"اگر جزئیات فقہ حنفی پر عبور کی بات کی جائے تو سید احمد بریلوی منفرد نظر آتے ہیں۔ان کا مجموعہ فتاوی اس بات کا شاہد ہے۔اور ان کی تصنیف "**کفل الفضه الفاهم فی احکام قرطاس الدراهم**"جو انہوں مکہ معظمہ میں لکھی اک نادر تصنیف ہے۔اسی طرح جزئیات فقہ پر عبور ان کے فتاوٰی رضویہ میں معلوم ہوتا ہے۔مثال کے طور پر جس پانی سے وضو جائز ہے۔سید بریلوی نے 160 سے زائد اقسام کا ذکر کیا ہے۔اور ناجائز کی 149 سے زائد کا اقسام کا تذکرہ کیا ہے"۔[2]

فتاوی رضویہ کے مطالعہ سے ان کی علمی بساط کا اندافرہ بخوبی ہوتا ہے۔کہ وہ کس قدر فقہیہ شخصیت تھے۔مولانا کے فتوے مختلف علوم وفنون پر ایک مستقل رسائل ہیں۔

"النهی النمير في الماء المستدير"**ریاضیات سے متعلق تحقیقی مقالہ**"رحب السباحة فی میاه لایستوی وجهها وجو فيها في المساحة "**اسی طرح ماء جاری اور جامد کی تعریف کا فتوی دیکھا جائے تو ایک مکمل تحقیقی مقالہ معلوم ہوتا ہے۔"الدقة والتبيان لعله الرقة والسلان** "مولانا احمد رضا کے دار الافتاء بریلی میں افغانستان، چین، افریقہ ،اور حجاز مقدس اور بلاد اسلامیہ سے باکثرت فتوے آتے۔ کبھی کبھار جن کی تعداد چار سو یا پانچ سو تک پہنچ جاتی تھی اور آپ یہ کام بغیر کسی معاوضہ کرتے۔[3]

اسی طرح ان کے فتوی عربی، اردو، انگریزی اور فارسی میں ہیں۔پہلی ذکر کی گئی تینوں زبانوں میں ان کے قلمی مجلات کئی بار چھپ چکے ہیں۔مولانا کے فتاوی کو تمام بلاد اسلامیہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔جس کا اندازہ اس بات .بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ندوہ میں تعلیمی نمائش کے موقع پر ایک شامی عالم شیخ عبد الفتاح نے "النیرہ الوضیہ" دیکھ کر بے اختیار کہا" این مجموعہ فتاوی الامام احمد رضا بریلوی" ان سے پوچھا گیا آپ کیسے متعارف ہوئے تو انہوں نے جوابا کہا۔

---

1 سید بریلوی پر مختلف فضلا نے مقالات لکھے "سید محمد مدنی، امام احمد رضا اور اردو تراجم قرآن کا تقابلی جائزہ (المیزان)۔ شیر محمد اعوان "امام احمد رضا اور محاسن کنز الایمان (المیزان ، مارچ 1396ھ) اسی طرح حکیم الرحمن رضوی ،امام احمد رضا اور ترجمہ القرآن کی خصوصیات وغیرہ تفصیلات کے لیے دیکھیں۔

2 ندوی، ابوالحسن، **نزھتہ الخواطر وبجة المسامع والنواظر**، (مقبول اکیڈمی: لاہور، 1976ء)، ج8، ص41

3 بہاری، مولوی ظفر الدین، مولوی، **حیات اعلیٰ حضرت**، ص94

"میں نے اپنے دوست کے پاس فتاوی رضویہ کی ایک جلد دیکھی۔ عربی عبارت کی روانی، سلف کے دلائل اور کتاب و سنت کے اقوال دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اور یہ رائے قائم کی یہ شخص کوئی بڑا عالم ہے اور اپنے وقت کا فقیہ ہے"۔[1]

آپ کی علمی قابلیت، قوت استدلال فقہی بصارت اور مطالعے کی گہرائی کی وجہ سے آپ کے بعد آنے والے اور آپ کے ہم عصر علماء نے آپ کی علمی، ملی، دینی اور مذہبی خدمات کو بھرپور سراہا۔ اور اس کا اعتراف بھی کیا۔ اور برصغیر ہند میں اپ کو صحیح فقہ الحنفی قرار دیا گیا۔

ابوالحسن ندوی نے اپ کی تعریف میں لکھا:

((لا يبلغه فى العلم فى عصره خاصة في الفقه الحنفي حيث كان مطلعا على جزئيات الفقه الحنفى واصلوه ، وفتاويه والرسالة التي كتب عن العملة على عنوان: كفل الفقه الفاهم فى احكام قرطاس الد را هم شاهدان على ذلك))[2]

(اپ کے ہم عصر علماء میں کوئی اپ کا ثانی نہیں خصوصاً فقہ حنفی میں کیوں کہ فقہ حنفی اور اس کے اصولوں کی تمام جزئیات پر ان کی گہری نظر ہوتی ہے۔ ان کے فتاوی اور ان کے رسالہ "كفل الفقه الفاهم فى احكام قرطاس الد را هم "دونوں اس پر کوی دلیل ہیں)۔

مولانا احمد رضا خان اپنے ہم عصر اور بعد میں آنے والوں میں دین ادب اور سیاست اور دینی معاملات کے میدان میں عالم اور مفکرین اسلام کے طور پر دائمی تسلیم کیا ہے۔ اور برصغیر میں کتب و تصانیف میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔[3] سید احمد رضا بریلوی کے علمی، فقہی مناہج و اُسلوب کی بات کی جائے تو برصغیر میں جن علماء نے فقہ و فتاوی کے ذریعہ لوگوں کی دینی راہنمائی کے سلسلہ کا آغا کیا ان میں سید احمد رضا بریلوی کا نام سر فہرست ہے۔ آپ موسس پر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ آپ کی کتاب فتاوی رضویہ ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں فقہ کے تمام ابواب شامل ہیں۔

فتاوی رضویہ کے منہج و اسلوب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سید احمد رضا بریلوی علماء نے ایک فقہی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ استدلال کے طور پر دیکھا جائے تو فتاوی میں مصادر و مراجع سوالات سے متعلق جزئیات کا استحضار استدلال میں کثرت سے حوالہ جات درج کرنا ان کے مطالعہ کی گہرائی اور فقہ حنفی پر عبور کا اظہار ہے۔ کسی بھی مسئلہ کی وضاحت کے لیے وہ فقہ حنفی کے مقررہ افتا کے اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے مسائل کو واضح کرتے ہیں۔ اور جہاں

---

1 مصباحی، محمد یسین اختر، **امام احمد رضا بریلوی ارباب علم ودانش کی نظر میں**، (المجمع الرضوی رضا اکیڈمی: اعظم گڑھ، 1977ء)، ص 193

2 ندوی، ابوالحسن، **تکملہ نزہۃ الخواطر وبهجة المسامع والنواظر، لعبد الحی الحسینی** (دار ابن حزم، بیروت، 1991ء)، ج 8، ص 118

3 لطیفی، اعجاز انجم، ڈاکٹر، **ڈاکٹر مسعود احمد کی ادبی اور علمی خدمات**، (ضیاء الاسلام: کراچی، 2002ء)، ص 155

مطلقہ جزئیات کا بیان ضروری ہو وہاں جزئیات کا مکمل احاطہ کرتے ہیں۔ تاکہ تمام پہلوؤں سے مکمل رہنمائی حاصل ہو سکے۔ تجدید فکر اور احیائے فکر میں سید احمد رضا بریلوی ایک منفرد شخصیت کے طور پر سامنے اتے ہیں جنہوں نے احیائے مذہب میں بخوبی کردار ادا کیا 65 سال عمر پائی اور 1921ء میں خالق حقیقی سے جاملے۔

مولانا سید حسین احمد مدنی (1879ء-1957ء) اور ان کا اجتہادی کام

برصغیر کے علم و عمل کی دنیا میں جن شخصیات کے خصائص و کمالات کا تصور دماغ میں واضح ہوتا ہے۔ ان میں ایک نمایاں شخصیت مولانا سید حسین احمد مدنی نظر آتی ہے۔ آپ مولانا محمود الحسن کے شاگردوں میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی ایک کامل درجہ کی اسلامی زندگی اور اخلاق و سیرت کا مرقع رہے۔ ابو سلمان شاہ جہان پوری کہتے ہیں کہ: اگر مجھ سے کوئی اسلامی زندگی کے بارے میں پوچھے تو یہ بات بلا تکلف لکھ سکتا ہوں کہ مولانا مدنی کی زندگی کو دیکھ لیں جو ایک کامل درجہ مسلمان کی حیثیت سے کھڑے نظر آتے ہیں۔[1]

مولانا حسین احمد مدنی ایک معزز عالم دین تھے اور برصغیر کی بیسویں صدی ایک مثالی محدث جنہوں نے حدیث مبارکہ درس و تدریس اور تحقیق حدیث میں اپنی زندگی کا بڑا حصہ صرف کیا۔ انہیں فقہ کے مسائل پر عبور تھا ۔ اور فقہ السنہ میں وہ ایک محقق اور مجتہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآنی مسائل احکام مسائل شرعیہ پر دل کھول کر بات کرتے وہ مفسر قرآن ہونے کی حیثیت سے معانی و مفہوم کی گہرائی میں اتر کر احکام قرآنی کی تشریح کرتے۔

اپنے فقہی نظریات کی بدولت انہوں نے افکار کی دنیا میں ایسی ہل مچائی کہ اپنے دور کے خطباء کے انداز فکر کو بدل کر رکھ دیا۔ مولانا حسین احمد مدنی ذوق فکر سے بھرپور شخصیت رکھتے تھے۔ بلند نگاہی اور صاحب عزیمت ہونا ان کی پہچان رہا۔ قوت اخلاص سے اللہ تعالی نے انھیں بھرپور نوازا۔ ملک و قوم کی خدمت کو انھوں نے اپنا شعار بنایا۔ تحریک آزادی میں اپنی نمائندگی کو اپنے قلب و ذہن کو ہر طرح کے خوف سے آزاد کر لیا۔ آپ نے برصغیر ہند کے مسلمانوں کو ذہنی و فکری غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی ترغیب دی اور ہمیشہ اللہ کی رغبت اختیار کرنے کا درس دیا۔

مولانا حسین کی سب سے نمایاں خوبی استقامت پسندی رہا۔ خالات جیسے بھی ہوئے جرات اور بہادری سے مقابلہ کرتے رہے۔ آپ دین و سیاست، واجبات دنیا فکر آخرت قومی اور ملی تقاضوں کی تکمیل میں کمال جامعیت رکھتے تھے زندگی کے میدان میں بھی آپ کی شخصیت سراپا عمل نظر آتی ہے۔ دارالعلوم میں مدرس کی حیثیت سے ہمیشہ رضائے الٰہی اور اتباع سنت کی تلقین کی۔ اور اسلام کے لیے جان و مال اور ایثار و قربانی کا جذبہ کرنے کے

---

1 شاہجہان پوری، ابو سلمان، مولانا، **شیخ الاسلام حسین احمد مدنی سیاسی مطالعہ**، (مجلس یادگار شیخ الاسلام، پاکستان، 1993ء)، ص19

لیے مبلغ اور داعی بنے رہے۔[1]

مولانا حسن احمد مدنی کی سیاسی زندگی پر نظر دوڑائی جائے تو نظر آتا ہے کہ آپ نے دو قومی نظریہ کا رد کیا اور ہندو مسلم اتحاد کی بات کی۔ مولانا اس بات سے استدلال کرتے ہیں:

﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَاتُنْفِقُوْامِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ﴾[2]

(اور ان کے لیے جتنی قوت ہو سکے تیار رکھو اور جتنے گھوڑے باندھ سکو تا کہ اس تیاری کے ذریعے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور جو اُن کے علاوہ ہیں انہیں ڈراؤ، تم انہیں نہیں جانتے اور اللہ انہیں جانتا ہے اور تم جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تمہیں اس کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور تم پر کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی)۔

یہ آیت بالکل واضح طور پر وضاحت کرتی ہے مسلمان ہند کے لیے یکجہتی اور اتحاد ضروری ہے۔ کیونکہ وہ جس فوج ہم کو ٹکر دے سکتے ہیں، وہ پتھریلے دماغ توڑ سکتے ہیں۔ ظاہری حیثیت کے اعتبار سے وہ اتحاد سے ہی ممکن ہے۔ اس لئے یہ اتحاد قوم وملت صرف مذہبی حیثیت سے ہی جائز نہیں بلکہ وقت کی بھی بڑی ضرورت ہے۔ ہندوستان کبھی بھی ملی و قومی معاملات میں ہندو مسلمان تفریق کا قائل نہیں رہا ہے:

"اس کی ریاستیں ہمیشہ سے ہی مسلمان حکمرانوں کے زیر سرپرستی رہی ہیں اور افتراق و تفریق کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ وطن کی تباہی اور بربادی کے اسباب کبھی بھی کسی خاص علاقے، مذہب یا کسی ایک شخص تک محدود نہیں رہتے ہیں۔ اگر گاؤں میں آگ لگے گی تو اس میں تمام گھر جلیں گے۔ اس اسی طرح غلامی اور محکومیت ملت کو موت کی گھاٹ اتار دیتی ہے۔ اور اس کا نقصان فقط ہندو یا فقط مسلمان نہیں اٹھارہے بلکہ دونوں کی تباہی و بربادی یکساں طور پر ہو رہی ہے۔"[3]

آپ کی پر جمہوری فکر برصغیر میں ایک قومیت کی خواہش مندی ظاہر کرتی ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی برصغیر کی تحریک آزادی میں جمعیت علمائے ہند، تحریک خلافت اور ریشمی رومال کی تحریک میں قائدانہ کردار نبھایا مولانا محمود الحسن کی وفات کے آپ نے یہ فریضہ خوب نبھایا۔ اس مشن میں کامیابی کے لئے آپ نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ اور تحریک آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ تمام مذاہب کے پیروکاروں کو جمہوریت اور اتحاد و یکجہتی کا درس دیا۔

---

1 حقانی، عبد القیوم، مولانا، **شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی**۔ (مکتبہ شیخ الاسلام: عزیز آباد) ص78

2 الانفال 60:8

3 محمد میاں، مولانا، **حیات شیخ الاسلام**، (اسلامی کتب گھر، سہارن پور) ص117

تحریکوں کی قیادت اور مجاہدانہ کارنامے

بر صغیر کے مسلمانوں نے تحریک خلافت میں جرات مندی حمیت دینی، مصائب پر صبر واستقلال اور استقامت کی ایک شان دار نمو کو کر پیدا کر دیا تھا۔ اور اگر حمیت و عزیمت کی بات کیا جائے تو مولانا مدنی کا کردار اس میں سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔ جن کی دینی فکر اور حمیت و عزیمت فکری اور اعتقادی حد سے تجاوز کر کے احساسات و جذبات پر حاوی ہو گئی تھی۔ اس سے ان کی حب الوطنی اور دینی لگاؤ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے "نقش حیات" میں لکھا ہے:

> "یہ بات درست ہے کہ تمام غیر مذاہب اور اس کے ماننے والے سب اسلام اور مسلمانوں کے مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ جب سے اسلام معرض وجود میں آیا ہے۔ انگریزوں زیادہ کسی قوم نے اسلام کو نقصان نہیں پہنچایا۔ دو سو سالوں سے انہوں نے بر صغیر میں اسلامی طاقت کو نیست و نابود کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اقتدار کے ذریعے امراء کا قتل عام کیا، ہندوستانی تجارت کو ناقابل تلافی نقصان پہچایا ہے۔ بر صغیر کے خزانوں کو لوٹا، صنت و حرفت کو تباہ کیا، اسلامی تہذیب و ثقافت کو برباد کیا مسلمانوں کو انتہائی ناواز بے روز گار بنایا اور دیگر مذاہب کے ساتھ ان کے تعلقات خراب میں پیش ثابت ہوئے۔ بر صغیر جو کبھی جنت کی نظیر تھا۔ جہنم کا نشان بن گیا۔ جو دولت و ثروت کا مرکز تھا۔ فاقہ تنگ دستی، بھوک اور افلاس کی جگہ بن کر رہ گیا۔ یہ وہ مظالم ہیں جن سے مسلمانوں کی ساکھ کو نقصان پہنچا۔"[1]

مولانا کی سیاسی شخصیت بر صغیر کی کی تحریک آزادی میں پورے قد سے کھڑی نظر آتی ہے۔ اگر نجی زندگی پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ وصف انسان تھے۔ مولانا صوم و صلاۃ کے پابند اور اخلاص کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے والے تھے۔ تجارت، مزدوی، کتابوں کا لکھنا اور شائع کرنا کسی بھی شخص کے لئے ایک آسان بات نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مولانا صاحب کی شخصیت کو امتیاز عطا کیا تھا۔ ان کی شخصیت کا ایک راز یہ بھی تھا کہ وہ کوئی بڑے شعلہ بیاں واعظ فظ یا مقرر نہیں تھے لیکن جب بولتے تھے تو لوگ جھک کر ان کی بات سنتے تھے کیونکہ ان جیسا کوئی اور موجود نہ تھا۔[2]

مولانا نے مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت تیار کی۔ جس کو اس اہمیت کا احساس دلایا کہ ہندوستان میں، مسلمانوں کی بنا اور قیام اسی صورت ممکن ہے کہ وہ جرات مندی سے حالات کا مقابلہ کریں اور اپنے دینی وقار کو زندہ رکھیں۔

مولانا احمد مدنی کا ایک بڑا کارنامہ جیسے تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ وہ جرات و شجاعت سے

---

1 مدنی، حسین احمد، **نقش حیات**، ج2، ص156

2 ندوی، محمود حسن، سید، **تذکرہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی**، (سید احمد شہید اکیڈمی: بریلی، 1986ء)، ص123

ہندوستان میں مسلمانوں کی بقاء کے لیے کھڑے رہنا اور حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہے۔ کیونکہ سب یہی خیال کر رہے تھے کہ برصغیر میں اب مسلمانوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں مسلمانوں کی تاریخ میں مشکل ہے یہی کوئی دور ایسا گزرا جس میں اسلام اور اہل اسلام کی بقاء کا مسئلہ درپیش آیا ہو۔

اگر سہارن پور کے مسلمان اپنی جگہ چھوڑدیتے تو یو۔پی کے مسلمان بھی گھبرا جاتے کیونکہ سہارن پور کے مسلمانوں کا سارادارومدار نہیں دو ہستیوں پر تھا۔ مولانا عبدالقادر رائے پوری اور مولانا حسین احمد مدنی۔ اللہ کے یہ بندے پورے عزم و استقلال سے ڈٹے رہے اور مسلمانوں کو اس بات کا یقین دلایا کہ اسلام ہمیشہ ہندوستان کی سر زمین پر اپنے قدم جمائے رکھے گا۔

"اگر آپ ہم سے مشورہ چاہتے ہیں تو ہم آپ آپ کو مشورہ دینے کے لئے تیار ہیں۔ اور اگر آپ ہم سے فتوی چاہتے ہیں تو ہم فتوی دینے کے لیے تیار ہیں یہاں سے مسلمانوں کا نکلنا درست نہیں ہے۔"[1]

سید احمد شہید کی تحریک جس طرح فکر اسلامی کے احیاء کی روح کو بیدار کیا اور قوم کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کی تلقین کی اور ملی و قومی جذبات کو یہ کہہ کر پکارا تھا۔ کہ "تاجرانِ متاع فروش" اور "بے گا لگانے بعید الوطن" آزاد کیا جائے۔ مولانا احمد مدنی کے اندر بھی اسی تحریک کی روح سماگئی۔

سید احمد شہید کی تحریک نے دیوبند کے قلب و روح کو جگایا اور گرمایا تھا۔ حاجی مہاجر مکی، رشید احمد گنگوہی مولانا قاسم نانوتوی، مولانا محمود الحسن نے عملی طور پر جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ مولانا حسین احمد مدنی علمائے دیوبند کی جماعت میں ایک روشن چراغ کی حیثیت رکھتے ہیں جنہوں ہندوستان کے چپہ چپہ کو اپنے علم کی روشنی سے چمکایا۔ جیسے مولانا محمود الحسن برصغیر کے مسلمانوں کے غم میں گھل رہے تھے۔ اسی طرح آپ اُن کے مسائل کو سمجھنے اور مناسب حل دینے میں اپنی زندگی ایک لمبا عرصہ صرف کیا۔ ان کے کردار کی عظمت اور وسعت نے انہیں ایک شمع کی مانند بنا دیا جس کے ارد گرد پروانوں کی ایک لمبی قطار کا ہجوم لگا رہتا۔ وہ غلبہ دین اور علوم اسلامیہ کی بحالی کے لیے تہہ دل سے خواہش مند تھے۔

مولانا محمود الحسن نے دار لعلوم دیوبند ایک بین الاقوامی مرکز دین کی حیثیت عطا کی۔ اور زندگی آخری ایام تک آپ نے یہی خواب سجائے رکھا۔ انہوں نے پورے ایشیا کی آزادی کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا اور اسے کامیاب بنانے کے لئے خاموشی سے سفارت کی اور سلسلہ خط کتابت کے ذریعہ مشن کو جاری رکھا۔ اِس کی تفصیل تحریک ریشمی رومال میں موجود ہے جیسے دیکھ کر عقل دانگ رہ جاتی ہے انگریزی سامراج اپنے تمام تر وسائل کے باوجود چال کو نہ سمجھ سکے آخر کار یہ تحریک ناکام رہی اور مولانا اپنے ساتھوں کے ساتھ مالٹا میں گرفتاری کے بعد بھیج دیئے گے۔ مولانا

1 محمد طیب، قاری، مولانا، **روداد رالعلوم دیوبند**، ص67

کی سیاسی زندگی کا نقطہ اول یہی ہے۔

مولانا نے اپنے اندر دارالعلوم کی روایات کو انقلاب حرارت کے طور پر لیا۔اس کے بعد دس سال تک انہوں نے مدینہ منورہ میں درس دیا۔اوررسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اپنے شاگردوں میں عام کی۔ جن کا تعلق روم، شام، مصر ہند اور عرب سے تھا۔ اور اس طرح ان کی انقلاب کی خواہش کو پذیرائی حاصل ہوتی رہی۔اسی طرح غیر مسلموں کی بھی کافی تعداد آپ کی عقیدت مند تھی۔ مولانا مدنی نے برصغیر کی غیر مسلم اکثریت سے تعاون کا اصول اپنے استاد مولانا محمود الحسن سے سیکھا تھا۔ جنہوں نے غیر مسلموں کے لئے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کچھ اصول متعین کیے تھے۔

انہوں نے جامع میلہ کی سنگ بنیاد کے خطاب میں فرمایا تھا کہ اگر ہندو مسلم اتحاد کا ساتھ سکھ اتحاد بھی شامل ہو گیا تو چوتھی طاقت خواہ کتنی ہی طاقت ور کیوں نہ ہو گی ہمارے نصب العین کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اقوام کی باہمی مصالحت سے جذبہ حب الوطنی فروغ پاتا ہے۔ صلح و آشتی اور امن و امان سے ہی بیرونی دشمن سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔[1]

مولانا حسین احمد مدنی نے تقریباً چالیس سال تک دینی، سیاسی اور سماجی خدمات انجام دی اِس دوران آپ نے سینکڑوں مضامین تحریر کئے جو مختلف مجلات اور جرائد ورسائل میں چھپے۔ آپ کی تصانیف میں **"نقش حیات"** جس میں آپ نے اپنی سوانح عمری کے بارے میں مفصل لکھا **"سفر نامہ شیخ الہند"** **"متحدہ قومیت"** **"اسیر مالٹا"** **"نصاب مدنی"** اور **مکتوبات شیخ الاسلام** مشہور کتب شامل ہیں۔

تلخیص مطالعہ:

سید احمد کی جماعت نے دین الہیہ کے نفاذ کی بھرپور کوشش کی۔ جماعت ہمیشہ مسلمانوں کو ہر طرح کے جبر اور ظلم و ستم سے بچانے کے لیے کوشاں رہی۔ سید احمد شہید فکر اسلامی کی تشکیل نو اور اس کے مؤیدین میں انیسویں صدی کے اوائل کے مفکرین میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

اسی طرح مولانا نانوتوی کی زندگی پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آپ کی زندگی کا بڑا حصہ حق و باطل میں فرق واضح کرنے میں گزرا۔ آپ کی زندگی اشاعت دین اور دعوت و تبلیغ میں صرف ہوئی دیوبند کی تاریخ آپ کو ایک متکلم کے طور پر متعارف کرواتی ہے۔ اور جن شخصیات نے برصغیر کی تاریخ پر اپنی یادوں کے گہرے نقش چھوڑے ہیں جن کے فن خطابت سے قوم میں نیا جوش اور ولولہ پیدا ہوا۔ ان میں شیخ محمود الحسن کی شخصیت بہت ابھر کر نمایاں ہوتی ہے۔

---

1 منگلوری، طفیل احمد، **مسلمانوں کا روشن مستقبل**، ص،256

مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے رفقاء نے برصغیر ہند کے فکری، سیاسی اور سماجی مسائل کے حل کے لیے نمایاں خدمات سر انجام دیں۔ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی جہت روایت پسندی نے علوم دینیہ اور علوم شریعہ کو زندہ رکھنے میں بااحسن اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا۔ دیگر اشخاص جنہوں نے اس مشن کو نمایاں رکھاان میں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا،یعقوب ناتوتوی، زکریاکاندھلوی، مولاناشبیر احمد عثمانی جیسے نام قابل ذکر ہیں۔ جنہوں دیوبند کی روایت کو زندہ رکھنے میں نمایاں کارنامے سر انجام دیے۔ انہوں نے شاہ ولی اللہ کے اساسی نظریات کو قائم رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ جس کے واضح اثرات برصغیر ہند پر مرتب ہوئے۔

فصل دوم

تجدد پسند مفکرین کے فکری رجحانات

تعارف و پس منظر

تجدد اور تجدید کے دو الفاظ، جو کہ جدت پر مبنی ہیں، اپنے معانی کے لحاظ سے آپس میں مماثلت رکھتے ہیں۔ لیکن فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو بطور اصطلاح کے استعمال میں دونوں جداگانہ معنیٰ و مفہوم کو شامل ہو جاتے ہیں۔ اردو لغات میں ان کے معانی کو یوں لکھا گیا ہے؛

تجدد: نیاپن، نیا ہونا، نئی بات، جدت پسندی۔

تجدید: نیا کرنے کا عمل، نئے سرے سے کوئی کام کرنے کی حالت[1]۔

عربی زبان کے لحاظ سے دیکھا جائے تو "تجدید" باب تفعیل سے ہے اور اس سے مراد مسلسل عمل ہے جو نیا پن لیئے ہوئے ہو جبکہ "تجدد" کا لفظ، جو کہ باب تفعل سے ہے، کے معنیٰ ہیں ماضی سے ہٹ کر یا منقطع ہو کر مکمل طور پر نیا ہو جانا۔ لسان العرب میں درج ہے:

"جَدَّد، و أَصل ذَلِكَ كُلِّهِ الْقَطْعُ؛... فجدَّ جَدُّه كأَنه صَارَ جَدِيدًا[2]

(جدد کی اصل قطع ہے،(یعنی پہلے سے منقطع ہو کر مکمل نیا ہو گیا۔).

ابن منظور مزید لکھتے ہیں کہ عربوں کے ہاں 'مجدودہ' سے مراد ہے مقطوعہ ہوتا ہے۔[3]

مذکورہ بالا مفہوم میں دیکھا جائے تو "تجدید فی الدین"، دین پر زمانے کی معاشرتی گرد اور آلودگی کے پردوں کو ہٹا کر دین کے صحیح تصورات کی وضاحت (مصادر اصلیہ کی روشنی میں) کرنا ہے۔ گویا تجدید سے مراد دین کے بنیادی اصولوں میں کوئی اضافہ کرنا یا تبدیلی کرنا مقصود نہیں بلکہ حجابات کو دور کرنا تجدید ہے۔

دوسری طرف "تجدد فی الدین" سے مراد ایسی تجدید ہو گی جس میں دین اسلام کو اپنے بنیادی مصادر کی روشنی سے دور رکھ کر محض زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر نئے اضافہ و ترمیم کے ساتھ پیش کیا جائے جس سے وہ (ارادتاً یا غیر ارادی طور پر) روایت تراث سے منقطع ہو جائے۔ ایسی کوشش بالعموم امت کا مجموعی مزاج قبول نہیں

---

1 فرہنگ آصفیہ: 1/593

2 الافریقی، لسان العرب، ص114

3 ایضاً

کرتا اور روایت کے ساتھ جڑا رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔

سید مودودی لکھتے ہیں کہ 'تجدید' کے معنی نیا کرنا ہے دین کے اوپر جب گردش ایام کی گرد وغبار پڑ جائے تو اسے چھانٹ کرکے دوبارہ دین کا اصلی رنگ پیش کیا جائے۔ اور یہ گرد وغبار کی وجوہات میں بڑی وجہ ایک ہی رہی ہے اور وہ یہ ہے۔ قرآنی متن میں انسانی اضافہ۔ عام طور پر یہ اضافہ وقتی ہوتا ہے لیکن وقت کے ساتھ اس میں پختگی آتی چلی جاتی ہے میں اور لوگ ایسے لوگوں کے افکا و نظریات کو بھی اسی طرح اہمیت دینے لگتے ہیں جسے اللہ کے حکم کو ماننا ضروری ہوتا ہے۔[1]

اس اضافہ کے دو محرکات ہوتے ہیں عام طور پر یا تو یہ اضافہ خارجی طور پر مذہب کی حقیقت کو متعین کرنے کے لیے کوشش کا نام ہے یا پھر عقلی اصطلاح میں مذہب کی تعلیمات کو بیان کرنا ہے۔ انیسویں صدی کے برصغیر میں فکر اسلامی کی تشکیلِ جدید کی تحریک میں تجدد کے رجحانات کی حامل نمایاں شخصیات کے افکار کا تجزیہ ذیل میں کیا جائے گا۔

سرسید احمد خان(1817-1898)اور ان کی تعلیمی اور فکری تحریک

انیسویں صدی میں برصغیر کی ملت اسلامیہ کے ایک انتہائی اہم مفکر و مصلح سید احمد تقوی، دہلی کے معروف گھرانے میں سید محمد متقی کے گھر 1817ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اجداد سلطنت مغلیہ کے دربار میں اہم عہدوں پر فائض رہے تھے، لہٰذا ان کا گھرانہ ایک معروف سیاسی اور سماجی گھرانہ تھا۔

سرسید کی تعلیم روایتی انداز میں ہوئی پہلے قرآن مجید پڑھا پھر فارسی، گلستان، بوستان، شرح ملا، مختصر معانی اور معطول وغیرہ کا کچھ حصہ پڑھا۔ جب وہ دہلی منتقل ہوئے تو تحصیل علم کا سلسلہ زیادہ مظبوط ہوا۔ اس زمانہ میں سر سید احمد خان نے جن بزرگوں سے فیض حاصل کیا ان میں امام الہند شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ مخصوص اللہ، محمد اسحاق اور مولانا قاسم نانوتوی کے استاد اور محسن جناب مولانا مملوک علی نانوتوی کے نام سرفہرست ہیں۔

سرسید احمد خان اپنی فطرت میں خالصتا ایک اسلامی شخصیت کے حامل انسان تھے۔ ان کے آباء کی خوبیاں ان کے اندر وراثتی طور پر موجود تھیں۔ اور معاشرتی ماحول نے ان کی مذہبی فطری وابستگی کو اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔ تعلیم و تربیت نے ان کی زندگی میں مزید نکھار پیدا کیا، تفکر و تعقل، احساس و شعور اور مذہبی افکار کو عقلی بنیادوں پر پرکھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ اس اسلامی اور مذہبی شعور نے سید احمد خان کو ایک صحیح العمل مسلمان بنایا۔ اسی بنا پر اسلام سے فکری وابستگی کے اظہار کے لیے انہوں نے علوم اسلامیہ پر متعدد کتابیں لکھیں۔[2]

---

1 مودودی، سید ابو اعلیٰ، مولانا، **تجدید احیائے دین**، ص، 17

2 حالی، الطاف حسین، **حیات جاوید** (اکادمی پنجاب ٹرسٹ: لاہور، 1957ء)، ص 43

سر سید احمد خان نے علوم اسلامیہ پر مختلف عنوانات اور موضوعات کے تحت کتب لکھیں جو قرآنیات، اصول حدیث، سیرت نبوی، سابقہ آسمانی کتابیں، تصوف، فلسفہ و تاریخ اور متعدد موضوعات پر بحث کرتی ہیں۔ ان تمام مباحث اور تحاریر کی تعیین میں سید احمد خان کے معاشرتی، مذہبی اور سماجی مقاصد تھے جن کا تعلق اصلاح امت، محبتِ اسلام اور ضروریاتِ زمانہ سے تھا۔[1]

جدت فکر کے داعی

سر سید کی جدوجہد کا بے لاگ تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی معاشرتی ابتری اور معاشی بدحالی کا علاج سوچ کر اصلاح فکر کا علم بلند کیا۔ آپ نے ہندوستان کو دار الحرب نہیں بلکہ دارلامان قرار دیا۔ انہوں نے مسلمانوں مزاحمت کا رویہ ترک کرنے طاقتور حکمران قوم کے ساتھ مفاہمت کی ضرورت پر زور دیا۔ مسلمانوں کو یقین دلایا ہندوستان ان کے لیے دارلامان ہے۔ ان کی سماجی تحریک کا بنیادی مقصد یہ رہا کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں سیاسی، ثقافتی، تعلیمی اور مذہبی شعبوں میں مفاہمت اور تعاون کو اختیار کیا جائے۔

مولانا حسین احمد مدنی، سر سید کے دور تک کی جانے والی اسلامی احیائی کی کوششوں کے بارے لکھتے ہیں:

> "اب تک مذہب میں صرف احیاء کی بات کی جاتی تھیں اور اسلامی روایات کو تمیز اسلامی سے پاک کرنے پر زور دیا جاتا تھا۔ اور اس مثالی معاشرہ کو قائم کرنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ جو ابتدائی اسلامی دور میں ہوا تھا۔ لیکن اس کے برعکس اب جب کہ اِس کا سامنا مغرب سے ہوا تو یورپ کی سیاسی، ثقافتی اور سائنسی ترقی دیکھ کر اپنا معاشرہ بڑا پس ماندہ نظر آتا ہے۔"[2]

سر سید احمد خان اور ان کے ساتھیوں نے اس بات کی بھی ترویج نہیں کی کے احیاء کے ذریعے خالص اسلام کو برصغیر کے مسلمان معاشرہ میں نافذ کیا جائے یا اس میں غیر اسلامی روایات کو نکال دیا جائے۔ بلکہ انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ اسلام ایک وسعت اور جامعیت والا مذہب ہے۔ اور اس کے اندر سیاسی ثقافتی اور سائنسی تبدیلیوں کو ضم کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اسلام جدیدیت کا مخالف نہیں بلکہ اس کا حامی ہے۔ جدید نظریات سے اسلام کو کوئی اختلاف نہیں بلکہ یہ عین اسلام ہے۔

سر سید کا سیاسی و سماجی نظریہ

مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سر سید احمد خان ایک ایسے مسلمان کی حیثیت سامنے

---

1 ثریا حسین، **سر سید احمد خان اور ان کا عہد**، (ایجوکیشنل بک ہاؤس: علی گڑھ، 1993ء)، ص 47

2 مدنی، حسین احمد، **نقش حیات**، ص 94

آئے جو دین اسلام کے آفاقی اور برحق ہونے پر یقین کامل رکھتا تھا بلکہ وہ اسلام کو دور جدید آمدہ مسائل سے نپٹنے کا واحد ذریعہ خیال کرتا تھا۔ مفکرین کا ایک حلقے اس بات کا گواہ سر سید احمد خان کی اسلامی فکر بنیادی طور پر عیسائی مبلغین کے خیالات کے خلاف تھی وہ اسلام کے بارے میں دفاعی نقطہ نظر کے حامل تھے۔

اہل مغرب اپنی سیاسی، ثقافتی اور ترقی پسند تہذیب کی ترویج و اشاعت میں مصروف عمل تھے۔ سر سید احمد خان اس بات کا جواب دینا چاہتے تھے کہ اسلام پہلے سے ہی ان تمام صفات اور خصوصیات کا حامل مذہب ہے۔ سر سید احمد خان نے مسلمان امراء، شرفا اور جاگیر دار طبقہ کو پس ماندگی سے نکالنے کی تدابیر بتاتے ہوئے انھیں جدید تعلیم سے روشناس کرایا۔ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک قائد کی شکل میں سامنے آئے۔ ایک طرف وہ سیاسی رہنما اور دوسری طرف وہ اسلامی مفکر کا روپ دھار لیتے ہیں۔

"سر سید نے انگریز حکومت مفاہمت کی غرض سے اس بات کی کوشش کی کہ ہندوستان کے مسلمان صرف اپنے مفادات کے بارے میں سوچیں اور ہندوستان سے باہر عالم اسلام اس طرح وابستگی نہ رکھیں اس لئے انھوں نے خلافت کے ادارے پر مضمون لکھا اور یہ ثابت کہ خلافت وقت کے ساتھ ختم ہو چکی ہے۔ اور خلیفہ دینا کے تمام مسلمانوں کا سر براہ نہیں ہے، اس لئے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے یہ قطعی ضروری نہیں ہے کہ وہ خلیفہ کو سربراہ مانیں۔ بلکہ ہندوستان میں رہتے ہوئے اپنے مفادات کے لئے برطانوی حکومت سے تعاون کریں۔"[1]

سیر سید احمد خان ہندوستان کے مسلمان قوم کا مسیحا تھے۔ 1857ء کی جنگ اور ان ہنگاموں کے بعد آپ نے ایک مکمل تحریک چلائی جس کے نتیجہ میں مسلمانوں میں عزت نفس پیدا ہوئی۔ آپ ہندوستان کی نئی نسل کے لئے ایک نمونہ کا کام کرتے ہیں۔ جنہوں نے اسلامی مفکر کی حیثیت سے اسلامی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہوئے مسلمان معاشرہ کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ آپ وہ ہندوستانی مسلمان تھے جنہوں نے نہ صرف اسلام کی جدید تعیین سمت کو محسوس کیا بلکہ اس موضوع پر کام بھی کیا ان سے اختلافی پہلو ایک طرف لیکن یہ بات واضح ہے کہ سر سید احمد خان نے وقت کی ضرورت کے تحت عہد جدید کے اثرات کے بہت دقیق نظری سے محسوس کیا۔

سر سید احمد خان مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کے حل کی کوششوں میں لگے رہے جس کی بدولت وہ انگریزوں اور ہندوؤں کے واروں کے محفوظ رہے۔ سر سید احمد خان کا یہ نقطہ نظر رہا کہ مسلمانوں کو سیاسی سرگرمیوں

---

1 مبارک علی، ڈاکٹر، **برصغیر میں مسلمان معاشرہ کا المیہ**، ص94

کا حصہ نہیں بننا چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ انگریز دشمنی کا شکار ہونا پڑے۔[1]

تاہم سر سید احمد خان کی اپنی سیاسی سرگرمیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے میں مسلمانوں میں "قومیت" کے تصور کو ابھارا اور ہندوستان کو ایک ملک نہیں بلکہ ایک براعظم قرار دیا جس کا اظہار انہوں نے اپنی تقاریر اور تحاریر میں بجا طور پر کیا۔ کہ ہندوستان میں مختلف الجنس قومیں آباد ہیں اس لیے ان کے مذہبی، قومی، ملی، سیاسی اور سماجی وقار کو بحال رکھا جائے۔[2]

مسلم سماج کے فکری احیاء کی مساعی

سر سید احمد خان کی قومی زندگی کے آغاز پر نظر ڈالی جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب آپ نے عملی زندگی میں قدم رکھا اس وقت مسلمانوں کی حالت معاشرتی اور تعلیمی حالت تنزلی کا شکار تھی۔ ان کے پاس نہ کوئی مرکز تھا اور نہ ہی کوئی تدبیر نتیجہ دن بدن ان کی سماجی حالت بد سے بدتر ہو رہی تھی۔ اس حالات میں سر سید احمد خان نے اسلامی اصلاح پسندی کا آغاز کیا چونکہ اس کے کچھ بنیادی اسباب تھے۔

ان اسباب کی نشو و نما شاہ ولی اللہ کے افکار و نظریات سے ہوئی جہاں انہوں نے ابتدائی طور پر مذہبی و اخلاقی تربیت حاصل کی۔ کیونکہ شاہ ولی کی اساسی تحریک نے اسلامی فقہ کی سختی کے اثرات کو ذرا تخفیف کر دیا تھا۔ کہ سائل کسی مسئلہ کے حل کے لیے فقہ کے چاروں مذاہب فکر میں سے کسی ایک کی طرف یا کسی ایک مذہب فکر کے فتوی کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔[3]

اس سے ان بدعات کا رد ہوا جن کو اسلامی رسومات اور روایات نے اجنبی ثقافت اور بیرونی تعلقات سے اخذ کیا تھا۔ اور سر سید احمد خان کے نزدیک ہر مسلمان کو اس کے رد اور کا حق حاصل ہے۔ انہوں نے روایت پسندی کے خلاف امام ابن تیمیہ کے نظریہ کو اپنایا کہ انفرادی تفکر اور فہم کا دروازہ آج بھی کھلا ہے۔ اور اسے بند تصور نہیں کیا جا سکتا۔[4]

سر سید احمد خان کی پہلی کتاب جو مسلمانوں کی مذہبی حالت سنوارنے کے لیے اور اصلاحی پہلوؤں کو اجاگر

---

1 پانی پتی، شیخ محمد اسماعیل، **مسافران لندن** (مجلس ترقی ادب: لاہور) ص، 100

2 پانی پتی، محمد اسماعیل، **مقالات سرسید**، ص، 56

3 شاہ ولی اللہ، **حجتہ اللہ البالغہ**، ص، 113

4 پانی پتی، شاہ اسماعیل، **مقالاتِ سید**، ص، 55

کرنے کے لیے منظر عام پر آئی وہ اسی طرز پر لکھی گئی۔ سر سید احمد خان نے اسے اپنی انقلابی جدیدیت کے دائرہ میں داخل کرنے اور اس سے متعلق توضیح اور جدید نقطہ نظر کے اختیار و استعمال کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ اس ایک خاص فقرہ کے اوپر انحصار کرتے ہیں کہ "اب وقت آگیا ہے اسلامی دینیات کو پوری طرح منطقی بحثوں اور دلیلوں سے مسلح کر کے میدان میں لایا جائے" حقیقت میں اس بات کا اشارہ مباحث اور کلاسیکی مناجات کی از سر نو توضیح اور واضح سمت متعین کرنے کی ضرورت تھا۔ لیکن سر سید احمد خان اسے لا محدود عقلیت پسندانہ تفکر کے نقطہ آغاز کے طور پر استعمال کیا۔[1]

سر سید احمد خان مذہب کو ایک ایسا نظام حیات سمجھتے تھے جس کا بنیادی مقصد معیار اخلاق کو کو بلند کرنا ہے۔ اور اس کے قیام کی کوششوں کو اختیار کرنا ہے۔ وہ اکثر اسلام کے دائرہ کے اندر غیر روایتی ذرائع اور انداز فکر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام کا بنیادی مقصد عقیدہ کی بجائے تلاش حق ہے جس سے ایک سچے اور جھوٹے مسلک کے درمیان بنیادی امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ وہ عقیدہ اور صداقت کو ایک جوہر کے جزو ترکیبی کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اور صداقت کا تعلق انسانی فہم سے ہے۔ جو فطرت اور اس کے قوانین سے مماثلت رکھتی ہے۔ کیونکہ قانون فطرت اخلاقی معیارات کو وضع کرتے ہیں جن پر نو انسانی کی سماجی اور معاشرتی اخلاقیات کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

غیر روایتی تفسیری منہج

اصلاح عقائد کے سلسلہ میں سر سید نے علم الکلام کی جانچ کا آغاز کیا تو خود قرآن کریم کی تفسیر لکھنا شروع کی جو تقریباً نصف قرآن تک مکمل کر پائے۔ روایتی تفسیری ادب کے ضمن میں انہوں نے جو موقف اختیار کیا وہ یہ کہ وہ پورا کا پورا ادب ثانوی مسائل سے بھرا ہوا ہے۔ عقلیت پسندی کے معیار کو اپناتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی کہ قدیم تفسیری ادب معجزانہ انداز بیان اور قدیم تفاسیر کے دقیق اور باریک اختلافات و موضوعات سے پُر نظر آتا ہے۔

ان کے خیال میں مشکل سے اِس میں کوئی ایسا مواد موجود تھا جس سے آیات کی اور درجہ بندی اور قرآن حکیم کا تاریخی تسلسل بر قرار رکھنے کی کوشش ہو۔ یا ہدایت کے ایسے اصولوں نشاندہی کی گئی ہو جو آنے والے وقت میں وسیع و عریض ماحول میں مستفید یا کار آمد ثابت ہو سکے۔ روایتی تفسیری ادب میں قرآن حکیم کی اس حیثیت کے

---

1 حالی، الطاف حسین مولانا، **حیات جاوید**، (انجمن ترقی اردو ہند: دہلی، 1939ء)، ص39

بارے میں کوئی مواد موجود نہیں ہے جس سے امت مسلمہ اپنے ایسے مسائل کے حل کے لیے کوئی اقدام کر سکے۔ جو ان مسائل سے قطعاً مختلف ہیں جو ساتویں صدی کے عربوں کو درپیش تھے۔[1]

اسی بنیاد پر سر سید احمد خان نے قرآن کریم کی تفسیر لکھنے کے لیے اپنے اصول وضع کیے۔ اور اپنے دوست نواب محسن الملک کی اس بات سے بھی اتفاق کیا کہ قرآن مجید کی درست اور صحیح تفہیم اسی وقت ممکن ہے جب رسول اللہ ﷺ کے دور کے عربی محاوروں اور روزمرہ زندگی میں استعمال ہونے والی زبان پر مکمل عبور حاصل ہو۔

نیز وہ اس بات کے بھی قائل رہے کہ ہر مسلمان کے لیے یہ حق محفوظ ہے کہ وہ قرآن حکیم کا لفظی ترجمہ بھی کر سکتا ہے۔ اور اس کی توضیح و تشریح بھی اس اصول پر کر سکتا ہے۔ اس توجیہ کی بنیاد ان اخذ شدہ فروعات پر نہ ہو جو خاص تاریخی مواقع پر نازل ہوئی ہوں۔ انہوں نے اسلام کو جس کی طویل تاریخ روایاتی بروزات سے بھری پڑی تھی ان سے پاک کر کے اپنے عقلیت پسندانہ معیار کے اوپر قرآن حکیم کی توضیح و تشریح کی۔[2]

عقلی تفہیم قرآن اور اصولِ تفسیر

سر سید احمد خان نے اپنی کتاب "تفسیر القرآن"[3] کے مقدمے میں قرآنی آیات کی تشریح کے لیے درج ذیل سات اصول بیان کیے ہیں:

(۱) لفظ کے اصل معنی کا تعین، جس لفظ کے جو معنی قرار دیے گئے ہیں، اس کی نسبت جاننا چاہیے کہ وہ لفظ انھیں معنوں میں وضع کیا گیا ہے۔

(۲) معنوی استعمال کا جائزہ، کہ جن معنوں میں وہ لفظ وضع کیا گیا تھا ان معنوں سے کسی دوسرے معنوں میں مستعمل نہیں ہے۔

(۳) مشترک المعنی الفاظ کا تعین، یعنی یہ قرار دینا لازم ہے کہ وہ ان مشترک معنوں میں سے کس معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ ضمائر جن کا مرجع مختلف ہو سکتا ہو وہ بھی الفاظ مشترک المعنی میں داخل ہیں۔

(۴) حقیقی یا مجازی استعمال کا تعین: اس بات کو قرار دینا ضروری ہے کہ وہ ان اصلی معنوں میں بولا گیا ہے جو

---

1 سر سید احمد خان، **خطبات احمدیہ**، (ملی پبلیکیشنز: نئی دہلی، 1967ء)، ص24

2 حالی، الطاف حسین، مولانا، **حیات جاوید**، ص16

3 سر سید احمد خان، **تفسیر القرآن**، مقدمہ، ص۱۵

اس سے متبادر ہوتے ہیں یا مجازی معنوں میں۔

(۵) مضمر معانی کا جائزہ؛ اس بات کو قرار دینا کہ اس کلام میں کوئی شئے مضمر ہے یا نہیں۔

(۶) معانی میں تخصیص کا تعین؛ اس بات کو قرار دینا ضرور ہے کہ جن معنوں پر وہ لفظ دلالت کرتا ہے اس میں کوئی تخصیص بھی ہے یا نہیں۔

(۷) عقلی معارضہ سے پاک ہونے کا تعین؛ یہ بات دیکھنی لازم ہے کہ جو معنی اس لفظ کے قرار دیے گئے ہیں اس پر کوئی عقلی معارضہ بھی ہے یا نہیں۔ اگر ہے وہ معنی اس کے صحیح نہ ہوں گے۔

سر سید نے قرآن کی تفسیر کے لیے جو اصول قائم کیے تھے ان کا مقصود قرآن کو اپنے عہد کے لوگوں کے لیے بامعنی بنانا تھا۔ تشکیل معنی کے لیے روایتی طریقوں کے برعکس اصول اختیار کرکے جدید ذہنوں کا وہ قرآن سے رابطہ استوار کرنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک وحی اور قانون فطرت ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔

ان کے نظریہ کے مطابق وحی الٰہی انسانی زندگی کی ادنی ہستوں اور دیگر صورتوں میں ایک فطری بعینہ حس کے طور پر کام کرتی ہے۔ کیونکہ انسان کا اور وحی کا آپسی تعلق بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ انسانی معاشرتی نظام کے ذریعے سے ہی اپنے گردوپیش کی مخالف اور غیر ارادی قوتوں پر قابو پا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ دیگر حیوانات کے برعکس معاشرتی زندگی گزارنے پر منحصر ہے۔ اور انسانی معاشرتی زندگی کی فطری ضرورت ضابطہ اخلاق ہے جس کے بغیر انسانی معاشرہ میں وحدت کا کوئی نظام نہ قائم ہو سکتا ہے اور نہ اس کا وجود رہ سکتا ہے۔

سر سید کے خیال میں فرد واحد اور معاشرہ کے لیے وحی اور شعور و ادراک یکساں اہمیت کے حامل ہیں۔ کیونکہ نظام معاشرت کے لیے الہامی قانون اور انسانی عقلیت پسندی میں آہنگی بے حد ضروری ہے۔ ادراک و شعور ہی وہ واحد راستہ ہے جو انسان کے سائنسی تجسس فطری اور الہامی حس کا کام دیتا ہے اور اس کے ساتھ اللہ کی وحدانیت کا تصور اچھائی اور برائی کے درمیان فرق، یوم سزا و جزا پر ایمان رکھنے میں سہولت کار ہوتا ہے۔ جو الہامی جبلتوں کی وضاحت کے لئے انسانی ذہین پر منقش ہو جاتی ہے۔[1]

اِسی طرح وہ اس بات کے قائل رہے کہ عقلیت پسند حقیقت کے فہم کی صلاحیت تمام انسانوں میں ایک جیسی نہیں ہوتی۔ انسان اپنی اس صلاحیت کی نیاد پر ایک دوسرے پر سبقت رکھ سکتے ہیں۔ انسانوں کے راہنماؤں میں

---

1 سر سید احمد خان، **تفسیر القرن وھوالھدی والفرقان**، (سر سید اکیڈمی: علی گڑھ، 1989ء)، ص، 21

فقہی مکاتب کے مابین، ممتاز صوفی فلاسفی، سیاست دان اور پیغمبر شامل رہے ہیں. لیکن نبی میں فطری الہام کی حس اپنی ارتقائی لحاظ سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ صورت میں رونما ہوتی ہے۔ اور بعض اوقات اس کا کوئی ظاہری سبب نہیں ہوتا۔ کسی بھی مذہب میں اس کشف کو مختلف ناموں سے موسوم و متعارف کروایا جاتا ہے۔ کسی پیغمبر کے یہ جبلی مکاشفات جتنے زیادہ قوی اور ترقی پسندانہ ہوں گے اتنا ہی وہ کائنات کے نظام قانون الہیٰ سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں گے۔

سرسید کی تفسیر قرآن

سرسید احمد خان کی تفسیر "تفسیر القرآن وھوالھدی والفرقان" اپنی نوعیت کی اینسویں صدی کی ایک منفرد تفسیر ہے۔ سرسید احمد خان کی مصلحانہ کوششوں اور ان کی علمی خدمات سے انکار نہی کیا جاسکتا انہوں نے اپنے علمی ورثہ میں قرآن حکیم کی ایک نامکمل تفسیر چھوڑی جو اپنے دور کے علماء میں مرکزِ بحث رہی۔ اس تفسیر کا اختتام سورہ طہ پر ہوتا ہے۔ سرسید احمد خان نے اس تفسیر کا آغاز 1877 میں کیا اور 1895 تک یہ سلسلہ تقریبا جاری رہا دو جلدوں پر مشتمل یہ تفسیر نادر مباحث کا مجموعہ ہے۔

اس وقت کا سب سے بڑا اور اہم ترین مسئلہ مذہب اور سائنس کے درمیان تصادم اور اختلاف تھا جو امتِ مسلمہ کے لیے ایک چیلنج تھا۔ تفسیر القرآن میں سرسید نے سائنس اور مذہب کے درمیان مطابقت پیدا کی آپ نے اس طرز فکر و عمل کو توسیع دی اور ایک اصول بنایا کہ اسلام فطرت ہے اور فطرت ہی اسلام ہے کیونکہ کلامِ الٰہی اور فعل الٰہی ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں۔[1]

عقلیت پسندی اور فطرتیت پر مبنی قرآن حکیم کی تفسیر سے کچھ مسائل پیدا کئے جس میں حکایاتوں کی تشریح ویسی ہی تھی جیسی دوسری مذہبی کتب میں پائی جاتی ہے۔ سرسید احمد خان نے قرآن حکیم کی آیات کی مشہور اقسام متشابہات اور بینات کی تشریح نئے انداز میں کی گئی۔ پہلی قسم میں قرآن کریم کی دو یا دو سے زیادہ آیات کی تشریح و تفہیم کی کھلی اجازت تھی جبکہ دوسری قسم میں مسلک اور اسلامی عقیدہ کی چھوٹی سے چھوٹی تقلیل بھی نہیں رکھی گئی۔

آیات متشابہات میں سرسید کے نزدیک اتنی گنجائش رکھی گئی تھی کہ ساتویں صدی کے عرب کے جو حالات تھے اس سے مختلف زمانوں میں ماحول اور معاشرتی آداب کے مطابق استنباط کرنے کی عام اجازت ہے مسئلہ تنسیخ "تفسیر القرآن" میں جس دوسرے مسئلہ کو بنیادی طور پر اٹھایا گیا وہ تاریخی اور ثانوی اہمیت کا حامل ہے وہ قرآنی آیات کے نسخ کا مسئلہ ہے۔ جس حکم کی قرآن حکیم خود توثیق کرتا ہے۔

---

1 صدیقی، یسین مظہر، **سرسید کے تفسیری اصول** (خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، 1999ء)، ص36

سر سید احمد کے نزدیک قرآن حکیم ایک ابدی اور الہامی صحیفہ ہے جس کی حقیقت ابدی اور لایعنی ہے۔ اس لیے نص قطعی کی تنسیخ ممکن نہیں۔ تنسیخ کا اسلوب تقابل مذاہب کے لیے درست ہو سکتا ہے۔ نسخ کا اصول صرف تقابلی مذاہب اور تقابل ادیان میں درست مانا جاسکتا ہے۔ جہاں بعد میں آنے والا رسول پہلے سے موجود مذہب کی تنسیخ کر دے۔ یہ واضح ہے کی مذہب عیسائیت یہودیت کی تنسیخ کرتا ہے اور اسلام عیسائیت کی تنسیخ کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں عہد نامہ عتیق و جدید قطعیت کے ساتھ تنسیخ کرنا ہے۔ لیکن ہر اصول قرآن حکیم کے حوالے سے بالکل غیر متعلق ہے۔[1]

آیات کی مختلف فیہ تعبیرات

جدید اسلام میں سر سید احمد خان وہ پہلے انسان ہیں۔ جنہوں نے ایسا نسخہ تلاش کرنے کی کوشش کی جو ڈارونی نقطہ نظر سے ہم آہنگ ہو۔ جس سے ڈارون نظریہ ارتقاء اور اسلامی عقائد تخلیق میں مطابقت پیدا کی جاسکے۔ کیونکہ "منی یا تخم" جسے حیات کے ابتدا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے داخلی مادہ تصور کیا جاتا ہے وہ عین قرآنی اسلوب سے متعلق ہے۔ سر سید احمد خان روح کے بارے میں ایک غیر استدالی نقطہ نظر کے قائل ہیں۔ وہ روح کو ایک ایسی حقیقت سے تعبیر کرتے ہیں جو حیوانات اور انسان دونوں میں ایک اہمیت جیسی ہی رکھتی ہے۔ سر سید احمد خان کے نزدیک روح کا ادراک انسانی فہم و عقل کی گرفت سے باہر ہے۔[2]

حیوانی روح بنیادی طور پر جبلی اہمیت کی حامل ہے۔ جبکہ انسانی روح لا حدود صلاحیتوں کی اہلیت رکھتی ہے۔ وہ زوال پذیر بھی ہو سکتی ہے اور ترقی پسند بھی ہو سکتی ہے۔ جو سائنسی تحقیق سے لے کر غیر انسانی افعال کا ارتکاب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

> "انسانی روح خود بخود خیر اور شر کے انتخاب کی صلاحیت نہیں رکھتی بلکہ اس کا وجود جوہر کی شکل میں ہے وہ فانی ہے اپنی لا فنانیت میں وہ خیر یا شر جذب کرتی ہے۔ اور وہ اس کی جواب دہ ہے۔ اور قیامت کے دن اس کا حساب چکانا پڑے گا جس روز تمام انسانیت کو نئی زندگی بخشی جائے گی جو ایک آخری اور اجتماعی یوم حساب ہو گا۔ جس میں روح مختلف طبقاتی انداز میں ہو گی جو اس زندگی کے انسانی جسم سے نہایت مختلف ہو گی۔"[3]

معجزات اور تصور معجزات کو لے کر سر سید احمد خان جدا گانہ نقطہ نظر کے حامل نظر آتے ہیں۔ ان کے

---

1 سر سید احمد خان، **تبیین الکلام**، (سر سید اکیڈمی: علی گڑھ: 1966ء)، ص 265

2 نظامی، اسماعیل، **مقالاتِ سید**، ص، 201

3 سر سید احمد خان، **تفسیر القرآن**، ص 90

نزدیک آسمانی کتب میں جن معجزات کا تذکرہ ملتا ہے انہیں استعاراتی سمجھنا چاہیے کیونکہ فطرت کے قوانین غیر تغیر پذیر ہیں ان میں کسی قسم کی تبدیلی ناممکن ہے۔[1]

وہ اللہ کے اپنی مخلوق سے کئے گئے وعدے ہیں جو توڑے نہیں جاسکتے ہیں۔ ان قوانین کی منسوخی پر یقین کرنا اس وعدے کی تردید کے مترادف ہے جو ہم اللہ پر رکھتے ہیں۔

سر سید احمد خان کے نزدیک یہ بات واضح معلوم ہوتی ہے کہ تمام قوانین کا علم انسانی دماغ نہیں رکھتا۔ لیکن روزانہ کی بنیاد پر جو قوانین انسان پر منکشف ہوتے ہیں وہ قوانین خواہ انسان کو معلوم ہوں یا نہ ہوں اپنی جگہ وہ ہمیشہ سے موجود ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جس معجزہ کی تنصیب کی جاتی ہے وہ ان کا عظیم پیغمبرانہ فریضہ منصبی ہے۔ جو کہ فطرتاً الہیاتی اور الہامی ہے۔

محمد ﷺ کے ساتھ جس معجزہ کو منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ "اسرای" یعنی ان کا آسمان پر جانا اور ایک عظمت والی رات میں اللہ تعالیٰ کا دیدار کرنا جو کہ نا تو روحانی تھا اور نہ ہی جسمانی بلکہ وہ ایک خواب تھا کیونکہ یہ تجربہ جسمانی تو نہیں بلکہ روحانی اور باطنی ہو سکتا ہے۔[2]

سر سید احمد خان فرشتوں کے بارے میں عقلیت پسندانہ زاویہ نگاہ رکھتے ہیں۔ اور وہ ملائکہ کو انسانی خصائص قرار دیتے ہیں۔ انسانی کیفیات اور وجدانی معرفتِ حقیقت وغیرہ ان کے نزدیک ملائکہ خدائی اخلاقی سہارا ہیں۔ جو اچھے اور برے حالات میں نبرد آزما ہونے کے لیے انسانوں کو مدد فراہم کرتے ہیں۔ شیطان کو استعارا قرآن حکیم میں آگ کی مخلوق قرار دیا گیا ہے بلکہ یہ انسانی برے اعمال کی جانب اشارہ ہے۔

قرآن حکیم میں جن شیاطین کا ذکر ملتا ہے وہ درحقیقت خراب انسانوں کے تذکرے ہیں جو اللہ کے احکامات کو ایسے معنی پہناتے ہیں اور علم نجوم کے حساب سے ارادہ واختیار کو غلط رنگ دیتے ہیں اور اس میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔

قرآن اور انجیل میں برے لوگوں پر اللہ کے عذاب کی شکل میں قدرتی مصائب نازل ہوتے ہیں۔ اور ان کی بنیادیں عام طور پر توہمات پر مبنی ہیں۔ اور اُن مصائب کا تذکرہ کتب سماویہ میں بطور تاریخی واقعات کے نہیں کیا گیا بلکہ ان کا ایک اخلاقی محرک ہے جسے افسانوی ڈھانچہ کے بطور مستعار لیا گیا ہے۔[3] معجزات کی توجیہات کے معاملہ میں

---

1 نظامی، اسماعیل، **خطباتِ سید**، ص118

2 سر سید احمد خان، **تفسیر القرآن**، ص102

3 سر سید احمد خان، **تہذیب الاخلاق**، (ناز پبلیشنگ ہاوس: دلی) س۔ن، ص191

سر سید احمد خان کی تائید نہیں کی جاسکتی لیکن ان تمام تفرداتِ سید کو قدیم مفسرین اکرام کی تفاسیر میں عجوبہ پسندی کا ایک ردِ عمل قرار دیا جاسکتا ہے۔

سر سید کا یہ نقطہ نظر علماء کے ہاں قبولیت اختیار تو نہیں کر سکا لیکن اس کا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ عجوبہ پسندی کی شدت میں کافی کمی واقع ہوئی اور بعد میں قرآنی واقعات پر اس طور غور و فکر کیا جانے کا آغاز ہوا کہ انہیں عقلی طور پر غیر معجزانہ حیثیت سے جانچا جاسکے۔ اسے سر سید احمد خان کی تفسیر کا ایک قابلِ ذکر اثر قرار دیا جاسکتا ہے کہ بعد کے مفسرین اکرام نے اس قبول کیا اور یہ اسلوب ترجمان القرآن اور تدبر القرآن جیسی تفاسیر میں نظر آتا ہے۔[1]

سید احمد خان کی مذہبی تصانیف کا متعدد حصہ تفسیری اور تاویلی ہے جبکہ ! احادیث نبویہ کے بارے میں وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ابتداء کی صدیوں کی غیر مستند روایات کو بغیر رسول کی جانب منسوب کر دیا گیا ہے ان کے مطابق احادیث کا انحصار راویوں کے احادیث کے اسناد کے سلسہ میں زیادہ رجحان افراد کے ذاتی اعمال اور قابل اعتماد ہونے پر تھا۔ بجائے اس کے کہ احادیث کی سند اور متن عاقلانہ اور تنقیدی نگاہ ہوتی۔

نقد حدیث میں سر سید کا نظریہ

وہ احادیث جو ایک عظیم کلاسکی مجموعہ احادیث میں شامل ہیں ان کی بنیاد بھی مسلمانوں کی چند ابتدائی نسلوں حالات، خیالات اور رجحانات کا ایک تاریخی عکس ہے۔ "نقد حدیث" میں سر سید احمد خان کا نظریہ یہ ہے کہ ایسی احادیث چاہئے جو انسانی عقل کے لیے قابل قبول نہ ہوں ایسی احادیث جو پیغمبرانہ شان کے منافی ہوں انہیں یک قلم مسترد کر دینا چاہئے۔ مستند احادیث تین اقسام پر مشتمل ہو سکتی ہیں۔

1۔ وہ احادیث مبارکہ جو قرآن کے احکامات کا تکرار کرتی ہوں۔

2۔ وہ احادیث مبارکہ جو قرآن حکیم کے احکامات کی تشریح یا وضاحت کرتی ہوں۔

3۔ ایسی احادیث مبارکہ جو بنیادی قوانین اور ضابطوں سے تعلق رکھتی ہوں۔ اور ان کے لیے قرآن حکیم نے خاموشی اختیار کی ہو۔

وہ احادیث جو کسی قرآنی حکم کی تنقیص کرتی ہوں یقینی طور پر موضوع گردانی جائیں گی۔ جبکہ وہ احادیث رسول ﷺ کی واضح اور صحیح ارشادات کے طور پر مسلم ہیں ان میں بھی فرق کرنا پڑے گا۔ ان میں سے کون سی

---

1 صدیقی، یسین مظہر، **سر سید احمد خان اور علوم اسلامیہ** (ادارہ علوم اسلامیہ: علی گڑھ، 2002ء)، ص 71

احادیث ایسی ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے بحیثیت رسول ارشاد فرمائیں ہوں یا بطور انسان ان کے اپنے ذاتی خیال یا پسند وناپسند کا اظہار ہوں۔[1]

اگر نظریہ غلامی کی بات کی جائے تو سرسید احمد خان کے اس نظریہ کے استدلال کی بنیاد اس اصول پر تھی کہ آزادی اور غلامی ایک دوسرے کے باہم متضاد ہیں۔ یہ دونوں نہ تو ایک ساتھ نشوونما پا سکتی ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو اپنا وجود قائم رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ انسان کو فطری طور پر آزاد پیدا کیا گیا ہے۔ اس کو جسمانی اعضاء، ذہنی و شخصی آزادی کا شعور اور ضمیر عطاء کیا گیا ہے۔ جس پر وہ پوری قدرت اور اختیار رکھتا ہے اگر انسان اپنا مالک آپ ہے تو پھر وہ کسی کا غلام نہیں ہو سکتا ہے۔ اِس کی روح کو آزاد پیدا کیا گیا ہے۔ اور وہ کسی حال میں مقید نہیں ہو سکتی ہے۔

اکثر معاشرے جو مذہب فلاسفی، عیسائی، رومن اور یہودی بنیادوں پر قائم ہوئے ان میں غلامی کی اجازت دی گئی۔ لیکن اسلام نے اسے محدود اور مسترد کر دیا اور اس کی ملامت و ممانعت اخلاقی بنیادوں پر کی۔ تاریخی اسلام نے دیگر معاشروں کی طرح غلامی کے ادارے کی سرپرستی کی۔ جو حکم الی اللہ کی خلاف ورزی ہے کچھ مسلم ریاستیں اسے ترک کرنے میں ناکام رہیں۔ جب کہ اہل مغرب نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا- اس رسم ورواج جڑیں تاریخی واقعات میں پائی جاتی ہیں۔ جبکہ مثالی اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ اسلام میں بردہ فروشی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔[2]

سرسید احمد خان اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ اسلام چونکہ اسرائیلی اور عیسائی تہذیبوں کے بعد آیا تو ان دونوں تہذیبوں میں غلام کی خرید و فروخت ایک جائز عمل سمجھا جاتا تھا۔ جبکہ اسلام نے بردہ فروشی کے مسئلہ کا حل اس میں رفتہ رفتہ تخفیف کی صورت میں کیا۔ اور غلاموں کو آزاد کرنے کے فعل کو سب سے بڑا ثواب اور عمل قرار دیا گیا۔ غلاموں کو آزادی دلانے کے لئے ریاست کے خزانہ کے استعمال کا حکم دیا گیا۔ یہ اس بات کی نشاندہی تھی کہ آئندہ آنے والے وقت میں غلاموں کی خرید و فروخت کو بلکل ممنوع قرار دیا جائے۔ سرسید احمد خان فدیہ دے کر غلام آزاد کرنے کے حکم کو حریت آزادی سے تعبیر کرتے ہیں۔

---

1 سرسید احمد خان، **خطبات احمدیہ**، ص353

2 سرسید احمد خان، **ابطال غلامی**، (طبع شدہ محمد قادر علی خان: آگرہ، 1966ء)، ص26

ولیم میور کے الزامات کا جواب

اسلام کے خلاف (سر ولیم میور) کے الزمات کا جواب سر سید احمد خان نے بھرپور دیا ان الزامات میں خاص الزام (ازدواج) کا تھا۔ سر سید احمد خان نے اس پر تین پہلوؤں سے بحث کی:

1۔ قانون فطرت کے لحاظ سے

2۔ معاشرتی سطح پر اس کے صحیح اور غلط ہونے کے لحاظ سے

3۔ اس کی مذہبی حیثیت کے لحاظ سے

وہ اس بات سے استدلال کرتے ہیں۔ تعدد ازواج سے فطرت کے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ اگر معاشرتی مسئلہ کی حیثیت سے دیکھا جائے تو عقد ثانی معاشی تحفظ کی فراہمی کے طور پر کیا جاتا ہے۔ یہ کوئی نفسیاتی یا جزباتی مفاد کی خاطر نہیں۔ اور تیسری شق میں قرآنی آیت بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ کہ اگر انصاف کر سکو تو جو عورتیں تمہیں پسند ہیں ان سے نکاح کر لو۔

جیسا کہ سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا﴾[1]

(اور یتیموں کو ان کے مال دیدو اور پاکیزہ مال کے بدلے گند امال نہ لو اور ان کے مالوں کو اپنے مالوں میں ملا کر نہ کھا جاؤ بیشک یہ بڑا گناہ ہے۔ اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں میں انصاف نہ کر سکو گے تو ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہیں پسند ہوں، دو دو اور تین تین اور چار چار پھر اگر تمہیں اس بات کا ڈر ہو کہ تم انصاف نہیں کر سکو گے تو صرف ایک (سے نکاح کرو) یا لونڈیوں (پر گزارا کرو) جن کے تم مالک ہو۔ یہ اس سے زیادہ قریب ہے کہ تم سے ظلم نہ ہو۔)

انیسویں صدی کے وسط میں جب برطانوی استعمار نے ہندوستان پر اپنی گرفت مضبوط کی، تو اس کے ساتھ ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فکری حملوں کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ مستشرقین نے اسلامی عقائد، تاریخ اور

---

1 النساء 4:2-3

پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات پر بے بنیاد اعتراضات اٹھائے۔ ولیم میور کی تصنیف ***Life of Muhammad (1861)*** انہی کوششوں کا ایک نمایاں نمونہ تھی، جس میں پیغمبر اکرم ﷺ پر الزام تراشی کرتے ہوئے انہیں مبینہ طور پر سیاسی مقاصد کے لیے مذہب بنانے والا قرار دیا گیا، ان حالات میں سر سید احمد خان نے مسلمانوں کا علمی دفاع کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ ان کی تصنیف "خطباتِ احمدیہ" دراصل ایک سنجیدہ، مدلل اور سائنسی انداز میں لکھا گیا جواب تھا جس کا مقصد نہ صرف اسلام کا دفاع تھا بلکہ مسلمانوں کو جدید علمی رویے اپنانے کی دعوت دینا بھی تھا۔[1]

"خطبات احمدیہ" نے برصغیر میں مسلم فکری خود اعتمادی کو نئی زندگی دی۔[2] سر سید نے وحی، نبوت اور معجزات جیسے موضوعات پر مغربی عقلیات کے مطابق بحث کی تاکہ یورپی تعلیم یافتہ طبقے کو اسلام کی صداقت کا قائل کیا جا سکے۔ ان کے نزدیک اسلام ایک فطری، معقول اور آفاقی مذہب تھا جو سائنس اور عقل سے ہم آہنگ ہے، اس لیے "خطبات احمدیہ" صرف ایک جواب نہیں بلکہ ایک علمی تحریک کا آغاز تھا۔[3]

اور سر سید احمد خان نے اپنی مشہور تصنیف "خطبات احمدیہ" کے ذریعے ولیم میور کے اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ پر کیے گئے اعتراضات کا جس انداز میں جواب دیا، وہ برصغیر میں اسلامی فکر کے دفاع کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سر سید نے روایتی مذہبی جوش و خروش کی بجائے ایک علمی، منطقی اور استدلالی انداز اپنایا، جو ان کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لیے اپنائے گئے اصلاحی پروگرام سے ہم آہنگ تھا، سر سید کا جواب محض ردِ عمل نہیں تھا بلکہ ایک متحرک اور معقول دفاع تھا جس میں مغربی علمی معیارات کو پیشِ نظر رکھا گیا تھا۔ ان کا یہ انداز خاص طور پر اس وقت کی استشراقی تنقید کے مقابلے کے لیے مؤثر ثابت ہوا۔

سر سید نے اپنے جوابی بیانیے میں خاص طور پر اس بات کا اہتمام کیا کہ وہ نہ صرف ولیم میور کے الزامات کو مسترد کریں بلکہ اسلام کی تعلیمات کی داخلی خوبصورتی اور ہم آہنگی کو بھی اجاگر کریں۔ انہوں نے نبوتِ محمدی ﷺ کو انسانی عقل کے اعلیٰ ترین مقام کا مظہر قرار دیا، جس میں اخلاقی کمالات اور الہامی بصیرت کا کامل امتزاج پایا جاتا ہے۔[4] سر سید نے یہ واضح کیا کہ نبی کریم ﷺ کی سیرت کو تاریخی تناظر میں دیکھنا ضروری ہے، نہ کہ مغربی تعصبات کی عینک سے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ اگر نبی کریم ﷺ کا مقصد محض دنیاوی اقتدار ہوتا تو وہ ابتدائی مکی دور میں ملنے

---

[1] Troll, Christian W. "Sayyid Ahmad Khan: a reinterpretation of Muslim theology." (1978).
[2] Muir, William. *The life of Mahomet: With introd. chapters on the original sources for the biography of Mahomet, and on the pre-Islamic history of Arabia. [Mohammad, Prophet]*. Vol. 1. Smith, Elder, 1861.
[3] Ahmad, Aziz. *Studies in Islamic culture in the Indian environment*. Oxford: Clarendon Press, 1964.
[4] Troll, Christian W. "Sayyid Ahmad Khan: a reinterpretation of Muslim theology." (1978).

والی پیشکشوں کو قبول کر لیتے۔ اس طرح سر سید نے ولیم میور کے الزامات کو سادہ مگر معقول انداز میں رد کیا۔

"خطبات احمدیہ" میں قرآن کی صداقت پر جو بحث کی گئی ہے وہ نہایت اہم ہے۔ سر سید نے قرآن کو ایک ایسا معجزہ قرار دیا جس کی فصاحت، بلاغت، اور معنوی گہرائی انسانی قوتِ تخلیق سے ماورا ہے۔ انہوں نے قرآن کی داخلی یکسانیت اور معنوی تسلسل کو وحی الٰہی کا زندہ ثبوت قرار دیا۔ اس کے علاوہ، سر سید نے قرآن میں سائنسی اشاروں کو بھی بطور دلیل پیش کیا، یہ بتاتے ہوئے کہ ساتویں صدی کے ایک امی کے لیے ایسے علمی نکات پیش کرنا انسانی بساط سے باہر تھا(Khan 2006, 52) ۔ان دلائل کے ذریعے انہوں نے نہایت منظم انداز میں ولیم میور کے اس اعتراض کو زائل کیا کہ قرآن محمد ﷺ کی خود ساختہ تصنیف ہے۔

اسلام کی اشاعت بذریعہ تلوار کے اعتراض پر سر سید نے ایک انتہائی بصیرت افروز اور تاریخی انداز میں جواب دیا۔ انہوں نے واضح کیا کہ اسلام کی بنیادی دعوت ہمیشہ نظریاتی اور اخلاقی اصولوں پر مبنی رہی ہے، نہ کہ جبری فتوحات پر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی صلح حدیبیہ اور مکہ کی فتح کے بعد عمومی معافی جیسے واقعات کو پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ اسلام کی توسیع تلوار سے نہیں بلکہ دلوں کو جیتنے سے ہوئی۔[1] مزید بر آں، سر سید نے دنیا کے ان علاقوں کا حوالہ دیا جہاں اسلام بغیر کسی عسکری مداخلت کے پھیلا، جیسے کہ انڈونیشیا اور مشرقی افریقہ اور یہ دلائل ظاہر کرتے ہیں کہ سر سید کا دفاع نہ صرف نظریاتی تھا بلکہ تاریخی شواہد پر بھی مبنی تھا۔[2]

"خطبات احمدیہ" کا سب سے نمایاں پہلو سر سید کا علمی معیار ہے۔ ان کی زبان سادہ مگر بلیغ ہے، استدلال منطقی ہے، اور طرزِ استدلال مغربی فلسفیانہ اسلوب سے ہم آہنگ ہے۔[3] انہوں نے اپنی گفتگو میں حوالہ جات کا معقول استعمال کیا، قرآن، تاریخ اور عقلِ سلیم کو بیک وقت بنیاد بنایا۔ یہ بات "خطبات احمدیہ" کو محض ایک دفاعی کتاب کے بجائے ایک فکری اور تعمیری بیانیہ بناتی ہے۔ سر سید کی یہ کوشش برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک نیا فکری دروازہ کھولنے کے مترادف تھی، جس میں وہ مغربی علمی دنیا سے بات کرنے کے قابل ہو سکے۔

عصرِ حاضر میں جب اسلاموفوبیا نئے انداز میں ابھرا ہے، سر سید کی "خطبات احمدیہ" آج بھی ایک نمونہ فراہم کرتی ہے۔ اس میں مسلمانوں کے لیے یہ سبق پوشیدہ ہے کہ اسلام کا دفاع صرف جذباتیت سے نہیں بلکہ علمی بصیرت، تاریخی آگاہی اور عقلی استدلال سے کیا جانا چاہیے۔[4] سر سید کی کاوش نے یہ بھی ثابت کیا کہ اسلام صرف

---

[1] Robinson, Francis. *The ʻulama of Farangi Mahall and Islamic Culture in South Asia*. Orient Blackswan, 2001.

[2] Lelyveld, David. "Aligarh's first generation: Muslim solidarity in British India." (1978).

[3] Metcalf, Barbara D. *Islamic Revival in British India: Deoband, 1860-1900*. Princeton University Press, 2014.

[4] Malik, Hafeez. *Sir Sayyid Ahmad Khan and Muslim Modernization in India*

ایک مذہب ہی نہیں بلکہ ایک زندہ تہذیبی اور فکری قوت ہے جو جدید دور کے چیلنجز کا سامنا کر سکتی ہے۔ اس تناظر میں "خطباتِ احمدیہ" محض ایک تاریخی دستاویز نہیں بلکہ ایک زندہ فکری تحریک ہے۔

آخر میں کہا جاسکتا ہے کہ سر سید احمد خان نے "خطباتِ احمدیہ" کے ذریعے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے دفاع میں جو حکمت عملی اختیار کی وہ نہایت کامیاب اور دور اندیش تھی۔ انہوں نے علمی دنیا میں اسلام کا دفاع ایک نیا معیار قائم کیا، جس کی آج بھی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ "*خطباتِ احمدیہ*" نہ صرف **ولیم میور** جیسے مستشرقین کے اعتراضات کا بھرپور علمی جواب ہے بلکہ مسلمانوں کے لیے ایک فکری اثاثہ بھی ہے جو انہیں علمی اور تہذیبی خود اعتمادی عطا کرتا ہے۔

ان کا عمل تعمیری اور نامیاتی نوعیت کا حامل ہے۔ جس نے اسلامیانِ ہند پر زبردست نقوش ثبت کئے ہیں۔ اس میں عصری ضرورت کے حوالہ سے فقہی تبدیلی کی ایک لہر موجود ہے۔ جو تاریخی حوالہ جات کے برعکس عصری ضرورتوں کے مطابق قانون کی تطبیق کا پیغام دیتی ہے۔

سر سید احمد خان نے قرآن حکیم کی توضیح و تشریح کی ایک عقل پسندانہ کوشش کی ہے۔ اور کلاسیکی مجموعہ یا احادیث کا نقد اور اُس کی جانچ پڑتال تاریخی تشکک کے ذریعے سے کی ہے۔ اور اجتہاد کے ضمن میں انہوں نے ہر مسلمان فرد کو اس کا اہل قرار دیا ہے۔

مولوی چراغ علی (1844–1895ء) کا فکری رجحان

مولوی چراغ علی میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ اور یہاں تعلیم و تربیت کے بعد ضلع بستی کا رخ کیا۔ جہاں انہوں نے محکمہ خزانہ میں ماہانہ تنخواہ پر نوکری حاصل کی۔ علمی شوق فطری ہونے کی وجہ سے انہیں کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ 1877ء میں سر سید احمد خان کی کوشش سے حیدر آباد دکن تشریف لائے۔ اور یہی ملازمت اختیار کی۔ چراغ علی سر سید احمد خان کے خاص رفیق کار اور ساتھی تھے۔ انہوں نے اپنے نظریات کو عالمانہ پختگی کے ساتھ تکمیل تک پہنچایا۔

جدیدیت پسندی اور متجددانہ رجحانات ان کی تحریروں میں واضح طور پر نظر آتے ہیں مولوی چراغ علی عبرانی زبان اور عہد نامہ قدیم سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ سر سید احمد خان اور چراغ علی اسی تشریحی نقطہ نظر کے حامل تھے انجیل مطابق کہ رسول ﷺ کے مبعوث ہونے کی پیش گوئی موجود ہے۔ مزید یہ کہ سر سید احمد خان نے جنوں کو ایک قدیم قبیلہ قرار دینے میں چراغ علی کے نظریہ کی پیروی کی ہے۔ جدیدیت پسندی کے رجحانات دار السلام کے دیگر حصوں سے بھی چراغ علی کی تحاریر کی جانب مبذول نظر آتے ہیں۔

---

and Pakistan. Columbia Univ. Press, 1980.

> "1880ء میں ایک مضمون میں انہوں نے مصری سیاح مقرب اور ماہر تعلیم خاکم الرفیع التحتوی، تیونس کے جدید پسند مدبر راہنما، خیر الدین پاشا، بیروت کے سیف آفندی اور ایک شامی صحافی احمد فارس السدیاق کی کتاب کا حوالہ دیا۔"[1]

ان کا جدیدیت پسندانہ نقطہ نظر اس بنیادی نقطہ کو پروان چڑھاتا ہے کہ قوانین فطرت اور فطرت کے متعلق قرآن حکیم کے حوالہ جات سے بھرا پڑا ہے۔ کیونکہ قرآن ایک فطری اور بنیادی مسلم دین کی طرف راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اور دوسری دیگر ثقافتوں سے اسلامی ثقافت اس لیے ممتاز و برتر نظر آتی ہے۔ کیونکہ اس نے دفاعی تربیت تحقیق تدوین کا ایک نظام مرتب کیا اور مذہبی روایات کے مطالعہ کے لیے تنقیدی اصول وضع کیے۔ جس نے یونانی سائنس نئی تشریح و تعبیر پیش کی۔ جس پر موجودہ یورپی تہذیب کا دارومدار ہے۔

اسلامی قانون کے منابع سے متعلق نقطہ نظر

سرسید احمد خان کی طرح مولوی چراغ علی بھی اسلامی قانون کے چاروں منابع قرآن، حدیث رسول، اجماع اور اجتہاد کے حق حقوق اور طور طریقوں کی جانچ پڑتال کی طرف راغب ہوئے۔ تاکہ جمود پذیری اور ذہنی حجریت پر قابو پایا جاسکے۔ ان کے خیال کے مطابق موجودہ اسلام پر ابھی بھی روایتی دین دار مسلط ہیں۔ مولوی چراغ علی کو بارہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی تک کہ یورپ میں قرآن کا جو مطالعہ ہوتا رہا۔ اس سے انہوں نے یورپی زبانوں میں قرآن حکیم کے تراجم کے اندر جہاں کہیں بھی مصنوعی انتشار کے تاثر کو پایا۔ اس کی شدید تنقید کی۔ وہ قرآن حکیم کی مکی اور مدنی سورتوں کے قائل تھے۔

ان سورتوں کی تقسیم جدیدیت پسندی کے تقاضوں سے ہم آہنگ تھی۔ انہوں نے تاریخی تسلسل سے ہم آہنگی کے لیے زمخشری اور امام بیضاوی کی تفسیر کو مد نظر رکھا۔[2]

ان کی قرآن حکیم کے ناسخ و منسوخ آیات کے بارے میں تاویل سرسید احمد خان سے مختلف تھی۔ وہ آیات کے نسخ کے قائل تھے۔ لیکن ان کا مقصد آیات مبارکہ کی ناسخ اور منسوخ ترتیب کو مطلق اور مقید ترتیب کے تحت لا کر ایک قانونی فیصلہ تک پہنچانا تھا۔

> "ناسخ اور مسوخ آیات کو بالترتیب مطلق اور مقید کے تحت جمع کر کے ایک قانونی فیصلہ تک پہنچانا ہے۔ تاکہ اس سے جو اصول تشکیل پائے اس کا تقاضا یہ ہو کہ مطلق آیات مبارکہ کی توضیح و تشریح مقید آیات کی روشنی میں کی جائے خصوصاً جب حکم شرعی اور موقع و مناسبت دونوں ایک دوسرے متوازی ہوں۔ اس ترتیب سے

---

1 چراغ علی، مولوی، **تہذیب الاخلاق**، (منشر فضل الدین کتب خانہ: 1953ء)، ص 137

2 عبد اللہ، سید، **سرسید کے ہم خیال علماء کے دینی نظریے**، (اورینٹل پبلشرز: لاہور: 1992ء)، ص 43

جہاد کی دفاعی حیثیت کو واضح کرنا آسان ہو گا"[1]

ان کی تاویلی و توضیح عذر خوبیوں کی بنیاد ٹھوس نہ سہی مگر مضبوطی سے قرآن حکیم اور عہد نامہ قدیم کے تقابلی مطالعہ پر نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر سر سید احمد خان اس نفسیاتی حالت سے مطمئن تھے۔ کہ جنات طاغوتی قوتوں کا مرقع و منبع ہوتے ہیں۔ جبکہ اس میں معاملہ میں مولوی چراغ نے باقاعدہ طور پر ظاہراًاور عملاً اس کی تشریح و توضیح بیان کی کے جن کوئی سامی النسل قبیلہ تھا۔ جو اردون پہاڑوں اور جنگلوں میں رہتے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے انہیں اپنی عبادت گاہ کی تعمیر میں لگایا تھا۔ تعدد ازواج کے سلسلہ میں ان کا موقف رہا تھا کہ قرآن میں یہ بات واضح طور پر لکھی گئی ہے۔ کوئی بھی شخص ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ انصاف والی زندگی نہیں گزار سکتا ہے۔ اسلامی قانون کے دوسرے اور بنیادی ماخذ یعنی حدیث رسول کی جدید پسندی کے کے تحت ایک مکرر جانچ پڑتال میں انہوں حد درجہ تنقیدی رویہ اپنایا۔ اور انتہائی زرق نگاری سے کام لیا ہے۔

وہ اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ ایک حدیث جو روایت کردہ ہوتی ہے وہ کسی بھی بات کا مفہوم تو پیش کرتی ہے۔ لیکن رسول کے الفاظ و اقوال بجنسہ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس لیے اس میں مفہوم کی ترمیم اور تبدیلی کی گنجائش کا امکان ہے۔ اس نقطہ نظر کو اپنا کر مولوی چراغ علی نے نہ صرف امکانی بلکہ اصل حقیقت قرار دے کر کل مجموعہ احادیث کو اسی لپیٹ میں لیا ہے۔ اور طوعاً کرھاً ہی کسی حدیث کے متعلق مسلمہ اسناد ہونے کے باوجود اس کی صحت کو قبول کرتے ہیں۔ مولوی چراغ علی اگر کسی حدیث کی روایت کو مسترد کرنے کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں تو بلا تامل مستند طریقہ تنقید کو اپنا لیتے ہیں۔[2]

وہ نبی ﷺ کو اولاً ایک مصلح قرار دیتے ہیں۔ وہ مصلح جس نے عربوں کو توہمات سے نکالا اور ایک وحدانیت کی طرف راغب کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ عرب اور دیگر اقوام عالم کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اور تعدد ازواج کو محدود کر کے عورتوں کے معیار زندگی کو بلند کیا اور ان کے مقدر کو سنوارا۔

> "نبی محترم ایک عظیم مصلح اور رہبر ہیں۔ جنہوں نے عربوں کی زندگیاں سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اور دیگر اقوام کی زندگی کے معیار کو بلند کیا۔ جس نے لوگوں کو ایک واحد لاشریک کی دعوت دی۔ غلامی کی حوصلہ شکنی کی اور بچوں کے قتل کا انسداد کیا۔ لوگوں کے اخلاقی معیار کو بلند کرنے کے لیے کتب اللہ کے اسلوب کو عملی جامہ پہنایا۔"[3]

---

1 چراغ علی، مولوی، **تحقیق الجہاد**، (مکتبہ اخوت اردو بازار: لاہور)، ص212

2 چراغ علی، مولوی، **رسائل چراغ**، (دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ)

3 چراغ علی، مولوی، **تہذیب الاخلاق**، ص45

اجماع اور اجتہاد سے متعلق عقلیت پسندانہ نقطہ نظر

اسلامی کی قانون کے باقی دو منابع اجماع اور اجتہاد کو لے کر وہ ایک الگ نظریہ پیش کرتے ہیں۔ وہ اسلام کو کلاسیکی نہیں بلکہ غیر کلاسیکی بنیاد پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کوشش میں انہوں نے دونوں قانون آخذ اجماع اور قیاس کو رد کر دینا آسان سمجھا۔ ان کے نزدیک اجماع علما کو ماخذ قانون نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور اجتہاد بذات خود کوئی آزاد منبع قانون نہیں ہے۔ اس لیے کیونکہ یہ باقی تینوں آخذ سے منسوب و منسلک ہے۔ اِس لیے مولوی چراغ علی نے اس کے فیصلے کو نہ صرف مانتے ہیں اور نہ ہی قابل تغیر سمجھتے ہیں۔ اور اس بات سے استدلال کرتے ہیں:

> "The unanimous consent of all the learned men of the whole Muhammadan certain time at a world a certain religious precept or practice for which their is no provision in the Quran Sunnah is called Ijma if any the constituent doctors dissents trom the others' the Ijma is not considered conclusive or authoritative. Sheikh Mohyyudeen Ibn Arbi Abu Soleiman Alzahiri a learned docotor of Isthan. Aboo Hatim Muhammad bin habban al Tamimi AL Basti generally known an Ibn Habban and Ibn Hazm and acconding to one report Imam Ahamad bin Hanbel denounce the authority of any Ijma other than, that of companions of the Prophet Imam Malik admitted the authority of the Ijma of the medinites only and not of anyone elese."[1]

اور اس بات کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ امام مالک کے نزدیک اجماع صرف مدینہ والوں کے لیے خاص اصحاب رسول کے بعد اب کسی کو اجماع کا حق نہیں ہے۔ کیونکہ امام مالک، امام احمد بن حنبل، امام ابن حبان، ابن حزم اور ابن العربی جیسے لوگوں نے اس کا ابطال کیا۔

مولوی چراغ علی قرآن حکیم کے علاوہ دیگر ماخذ کے لیے یہ موقف اپناتے ہیں دیگر ماخذ کی از سر نو توضیح و تشریح کی ضرورت ہے۔ وہ ان تینوں منابع کو رد کر کے مسلم قانون کے لئے کسی نئی اساس و بنیاد کے امکان کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ بنیاد انسان پرستانہ ہونی چاہیئے۔ کیونکہ انسان کو آزاد اور خود مختار پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن اپنے اردگرد کے ماحول کی وجہ سے آلود معصیت ہو جاتا ہے۔ اسلام معاشرتی تبدیلیوں کے سبب اپنے اندر ان کے مطابق خود کو ڈھالنے کی کافی لچک اور صلاحیت رکھتا ہے۔[2]

اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ علم و فکر کے مطابق سفر کرنے والا اسلام نہیں بلکہ وہ اسلام جس کی تعلیمات قرآن حکیم خود دیتا ہے۔ اور یہ تعلیمات معاشرتی حالات کی تبدیلی کے ساتھ ترقی اور بہتری کی اہلیت رکھتی ہیں۔ قرآن حکیم وہ واحد کتاب ہے جو اپنے ماننے والوں کے لیے تیزی سے آگے بڑھنے، نئے حالات سے ہم آہنگ

---

1 Chiragh Ali, perposed political, legal and social reform undere Moslem Rule (Bambag, Education Society Press BY CULLE), 1883 Page Xxii

2 چراغ علی، مولوی، **رسائل چراغ**، ص28

ہونے اور عقلیت پسندی کے اہم اصول ودیعت کرتا ہے۔

وہ استدلال کے طور پر کہتے ہیں کہ محمد ﷺ نے نہ کوئی ضابطہ قانون دینی یا سماجی مرتب کیا۔ اور نہ مسلمانوں کو ایسا کوئی کام کرنے کا حکم دیا۔

انہوں نے کوئی بھی معاشرتی یا شریعت کا بھی ضابطہ قانون بنانے یا اس کو مرتب کرنے کا عمل لوگوں پر چھوڑ دیا تھا۔ اور معاشرتی تبدیلیوں اور وقت کے تقاضوں سے کے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے معاشرتی، سیاسی اور گردوپیش میں ہونے والی تبدیلیوں کے باعث ایسا نظام قائم کرنے کی اجازت دی جو ان تمام حالات میں انسانی زندگی کے موافق ہو۔[1]

کیونکہ کلاسیکل بنیادی اسلامی قانون بنیادی طور پر قرآن شریعت اسلامیہ کے مطابق نہیں۔ بلکہ عربوں کے جاہلی رسوم ورواجوں کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اور اپنی کتاب پولیٹکل ریفارمز میں اس سے استدلال کرتے ہیں۔

> "The Lex Non- Scripta or the common law of Islam is an unwriten law, that is not written by Muhammad the Prophet by nor directed in his time, nor compiled even in the first century. Comprising those principles, usages and rules of conduct applicable to the gontment and security. The person and property do not depend for th authority and are not upon based. Upon any existing, express and positive, declration of the koran, or the revealed law. It comprises, and mainly consists of old established Arab civil institutions, customs and the traditionary sayings of the prophet most of not genzuine and of his companions."[2]

اسلام ایک سماجی اور معاشرتی نظام سے مختلف تہذیب کے طور پر ایسا وجود رکھتا ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں معاشرتی نظام کے انفرادی اور اجتماعی تجربات کو مسلمان قرآن حکیم سے خلط ملط کر چکے ہیں۔ اس قرآن کے چاروں ماخذ قانوناً ناقابل تعبیر گردانے جا سکتے ہیں۔ اسلامی معاشرتی و سماجی قانونی اجزاء کو دوبارہ ترتیب و تدوین کی ضرورت ہے۔ تاکہ معاشرتی بدلاؤ کے مطابق مسائل کا حل ڈھونڈنے میں آسانی کارفرما ہو سکے۔

اسلامی فقہ کی تدوین نو کی ضرورت

مولوی چراغ علی اس بات کی وضاحت میں لکھتے ہیں کہ اسلامی فقہ کی تدوین رسول اللہ ﷺ کے زمانہ یا صحابہ کرام رضوان علیہم اجمعین کے زمانے میں نہیں ہوئی بلکہ نویں اور دسویں صدی عیسوی میں تاریخی مقام کی عکاس ہے۔

---

1 چراغ علی، مولوی، **اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام**، ج اول (سرسید اکیڈمی: علی گڑھ، 1953ء)، ص 51

2 chiragh Ali, Perposed Political, Legal and Social reforms undere Moslem Rule (etc) Page, 11

عین ممکن ہے کہ روایتی اسلامی شریعت اسے علاقوں میں قابل عمل ہو جو موجودہ حالات کی تبدیلی سے نا موافق ہوں۔ یا کسی بھی قسم کی تبدیلی لانے سے گریزاں ہوں۔ لیکن اس کی متعدد شقیں ان میں جو مغربی ممالک کی پالیسیوں اور قوانین کے زیر اثر آ چکے ہیں۔ دقیانوسی ہو چکے ہیں مثلاً ہندوستان، ترکی اور الجزائر وغیرہ۔

ایک نیا شرعی نظام اور ان ممالک میں خاص طور پر، قانونی اصلاحات کو وجود میں لانے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ روایتی قانون اور شرعی نظام موجودہ معیارات زندگی کے لیے ناکامی اور غیر ترقی پذیر ہے۔

تصور جہاد کی تشریح کرتے ہوئے اسے صرف مدافعتی بنیادوں پر جائز قرار دیا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جس مغازی میں حصہ لیا وہ سب دفاعی نوعیت کے تھے۔

"تاریخی تسلسل کی زبان میں حملہ کا آغاز مکہ کے مخالف قبائل کی جانب سے ہوا جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کو مسلسل تکلیف پہنچاتے رہے اور ان کی توہین و تذلیل کرتے رہے۔ فوجی حکمت عملی کا تقاضا یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ہجرت کرنے کے بعد دشمن اور ان کے معاونین کے خلاف منصوبہ بندی کی جائے لیکن مدینہ کے یہودیوں کے خلاف اور اندرون مدینہ جاسوسانہ سرگرمیوں کے سبب، تعدیری اقدامات کئے گئے بہر کیف رسول اللہ ﷺ کے غزوات کو تاریخی حوادث سے منسوب کرنا چاہیئے جو خاص حالات سے متعلق اور جائز تھے۔ انہیں بعد میں کسی شرعی نقطہ کی بنیاد قرار نہیں دیا جاسکتا۔"[1]

تاہم جہاد کے متعلق انہوں نے بہت سارے عیسائی مبلغین جن میں ولیم میور جارج سیل اور اسپرنگر جیسے بڑے عیسائیت کے مبلغین کے نظریات کا ابطال کیا ہے۔ کیونکہ وہ ان کے نظریات کو گمراہ کن تصور کرتے ہیں۔ اور ان کے دلائل کا رد پیش کرتے ہیں۔

اسلام اور غلامی کا تصور: مولوی چراغ علی نے اسلام میں غلامی کے تصور کو جس طرح پیش کیا اور اس کے بارے میں جو موقف اختیار کیا وہ برصغیر کے روایتی علمائے مذاہب کے خلاف ہے۔ برصغیر کے علمائے کرام نے سخت اعتراضات کا اظہار کیا۔ لیکن مولوی چراغ علی نے غلامی سے متعلق سرسید احمد خان کے خیالات پر اتفاق کیا اور اس پر اضافہ کیا ہے اور اس کی تصدیق بھی کی ہے۔

انہوں نے اس بات سے بات سے استدلال کیا کہ قرآن حکیم اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ غلامی کا تصور عربوں میں رائج تھا۔ قرآن حکیم نے غلاموں کو آزاد کرنے کے عمل کو قابل ستائش قرار دیا ہے۔ بلکہ اسے مسلمانوں کے لیے ایک پسندیدہ فعل قرار دیا ہے۔

اگر اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو جہاں غلامی کو برقرار رکھا گیا وہاں فقہائے کرام نے سیاسی ضرورت کے تحت اسے جائز قرار دیا ہے۔ قرآن حکیم اس کے متعلق کوئی حکم نہیں نہیں لگاتا۔ اسلام وہ واحد دین ہے جس نے

---

1 چراغ علی، مولوی، **تحقیق الجہاد**، ص12

غلاموں کے ساتھ ہمدردانہ اور فیاضی والا معاملہ اختیار کیا۔ جو کسی اور مذہب اور ثقافت میں موجود نہیں ہے۔[1]

نجی اسلامی قانون: مولوی چراغ علی اس موقف کو اپناتے ہیں کہ نجی اسلامی قانون کو عربوں کے رسم و رواج اور قوانین کی روشنی میں پرکھنے کی ضرورت ہے۔ جس میں عورتوں سے جائز اور ناجائز طریقہ سے فائدہ حاصل کرنا عام تھا۔ جہاں غیر محدود تعدد ازدواج اور بچوں کا قتل ایک عام فعل سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے ان قوانین کا خاتمہ کیا اور عورت کو عزت اور بلند مقام و مرتبہ دیا۔

تعدد ازواج کو اسلام نے چار تک محدود کیا۔ اور اس میں بھی احسان کے پہلو کو غالب رکھتے ہوئے عدل کا پابند بنایا اور محبت کے اسلوب کو نمایاں کیا۔ اس سے غیر محسوس طریقہ سے قرآن حکیم کو انسداد تعدد ازواج کا نسخہ سمجھنا چاہیئے۔ علماء و فقہاء نے شریعت کے عمل میں قرآنی حکم کو دبا دیا ہے۔ اسی طرح قانون طلاق کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ جو قدیم عربی رسم و رواج کے پابند ہے عربوں کے دور جاہلیت میں عیسائیت اور یہودیت کے مقابلہ میں عورتوں کے ساتھ اسلام بڑا ہمدردانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ اور ماں، بیٹی، بیوی کے وقار کو بحال کیا۔

مغرب میں عورتوں کی آزادی کا پورا مکالمہ رومی تہذیب کا ورثہ ہے کیونکہ شریعت موسوی ان کا اخلاقی اور سماجی وقار بلند کرنے میں ناکام رہی ہے۔ عیسائیت کا بنیادی طور پر گنہگار کا نظریہ عورت کی پامالی اور اہانت کی وضاحت کرتا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس اسلام نے خواتین کو مردوں کے مساوی مقام و مرتبہ عطا کیا ہے۔

الغرض: مولوی چراغ علی عقلیت پسندانہ افکار کی حامل شخصیت رہے۔ اور سر سید احمد خان کی قریبی رفقاء میں شمار میں ہوتے ہیں۔ انہوں نے بڑے جرآت مندانہ انداز میں عیسائی مبلغین کے نظریات کا رد پیش کیا۔ تمام کو افراد کو آزاد ہونے کے نظریہ کا استدلال کیا اور مسیحی حکمرانوں کو ان کے ماتحت باشندوں سے سیاسی سماجی مساوات کے پہلو کو اجاگر کیا۔ ان نظریات کا ابطال کیا۔ جو نسلی لسانی امتیازات بے حد حوصلہ شکن اور توہین آمیز تھے۔

سید امیر علی(1849ء-1928ء) کے فکری رجحانات

سید امیر علی ایک اعلیٰ اور بہترین صلاحیتوں کے مالک انسان تھے۔ جو 6 اپریل 1849ء کو پیدا ہوئے۔ (متوفی 1928ء) سید کرامت علی کے شاگرد اور راسخ العقیدہ شیعہ تھے۔ کلکتہ جو کے برطانوی حکومت کا دار السلطنت تھا۔ ایک ایسا طبقہ ابھر کر سامنے آیا جس نے اسلامی جدیدیت کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ جس میں نمایاں نام سید کرامت علی جونپوری، عبد اللطیف خان اور سید امیر علی ہیں۔ سید امیر علی قانون کی تعلیم انگلستان سے حاصل کر کے واپس آئے تو بنگال کے نظام عدل میں عدالت کے جج مقرر ہوئے۔

وہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے رکن کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ لیکن

---

1 چراغ علی، مولوی، اعظم الکلام فی ارتقاء الإسلام، ص، 61

انیسویں صدی کے آخری عشروں اور بیسویں صدی کے آغاز میں وہ دین اسلام کے بہترین مناظرین میں سے تھے۔

آپ مغربی اہل الرائے سے اسلام کی عذر خوبیوں اسلامی معاشرتی نظام اور مذہبی خیالات کی توضیحات کے ڈھانچہ کی از سر نو تعمیر اور جدیدیت پسندانہ خیالات کی ترویج کے خواہاں تھے۔[1] وہ علی گڑھ تحریک کے انقلابی جوش و جذبہ سے عاری نظر آتے ہیں مرکزی نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن اور انڈین میٹریاٹک ایسوسی ایشن اس مقصد کے تحت قائم کی گئی کہ ایک مشترک نظام کا حصہ بن سکیں لیکن دونوں ایک کا حصہ نہ بن سکیں سید امیر علی نہ مسلمانوں کے جدا گانہ انتخابات کی منظوری کے لیے آغا خان کا ہاتھ بٹایا۔ انہوں نے اس میں ایک فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ سید امیر علی نے اسلامی تاریخ کو از سر نو مرتب کیا۔

مذہبی فکر کا زاویہ

سید امیر علی اپنی مذہبی افکار و تفکر کے حوالے سے علی گڑھ کے مفکرین سے بالکل الگ زاویہ نگاہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے تاریخ اسلام کی عظمت کو اجاگر کرنے میں بلا تفریق جامعیت اور وسیع القلبی سے کام لیا۔ ان کا اصل اور نمایاں کام اسلامی تاریخ کو مغرب کے لئے از سر نو مرتب کرنا ہے۔ وہ قابل لحاظ حد تک اثر انداز ہوا۔ اور اہل مغرب اس سے بھرپور مستفید ہوا۔

ان کی تصنیف (Spirit of Islam) سپرٹ آف اسلام جو انگلینڈ سے متعدد مرتبہ شائع ہوئی۔ اور دوسری کتاب (The Short History of Saracens) ان دونوں کتب نے مغربی تعلیم یافتہ برصغیر مسلمانوں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اول الذکر کتاب دی سپرٹ آف اسلام میں آل بویہ اور فاطمیوں نے معاشرتی اور ثقافتی خدمات سرانجام کسی حد تک ان پر بات کی گئی۔

دوسری کتاب میں بلا تعصب خلافت کے کارناموں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ وہ حضرت عمر فاروق اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما کے بہت بڑے مداح رہے۔ وہ اس بات سے استدلال کرتے ہیں۔ کہ اسلام نے خلوت پسندی اور تنگ نظری کا ابطال کیا ہے۔ اِس لیے دیگر مذاہب کے لوگوں کو اپنی مذہبی رسومات کی ادائیگی کی مکمل اجازت حاصل ہے۔

سید امیر علی نے مغربی جانبازی پر عربوں کے معاشرتی، سماجی اور ثقافتی و ادبی اثرات کی تلاش میں محفوظ اساس پر اپنے نقش ثبت کیے ہیں۔ سید امیر علی نے اسلام میں شجاعت اور جانبازی کے موضوع کو بار بار دوہرایا ہے۔ بنو عباس اور بنو امیہ کے ابتدائی ادور کے کلاسیکی اسلام کی خوبیوں کو ابھار کر سامنے لائے ہیں۔

سید امیر علی نے رسول اللہ ﷺ کے اخلاق و کردار کو بے حد خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ اس بات

---

1 حالی، الطاف حسین، مولانا، **حیات جاوید**، ص149

سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بہترین معلم تھے۔[1] اگر اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کی بات کی جائے تو عیسیٰ علیہ السلام نے مذہب کی تبلیغ کی اسی مناسبت سے اس مذہب کا نام مسیحیت کہلایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس مذہب کے ساتھ آئے انہیں کے ناموں سے ان کا مذہب موسوم ہوا۔ لیکن رسول خدا ﷺ جس مذہب کے معلم ہوئے اِس کا نام سے اس سے متعلق نہیں بلکہ "اسلام" ہے۔ وہ واضح طور پر لکھتے ہیں:

"The religion of Jesus bears the rame christianity, derived from. His designation of christ. That of moses and known names buddah are the respective their teach the redigion of Muhammad alone has a distinctive appellation. It is Islam in order to form a just appreciation of the religion of Muhammad it is recessary to understand gright the true significance of the word of Islam. Sdam (Salama) in his primary sense to be tranquil of rest, to have done one's duty to have paid up to be at perfact peace"[2].

اسلامی فکر کا دفاع

سید امیر علی نے تاریخ اسلام کے خلاف کو مغربی یا عیسائی مبلغین کی آراء کا بھرپور جواب دیا۔ اور تاریخ مسیحیت سے سخت الفاظ استعمال کیے۔ کیونکہ وہ یہ موقف اپناتے ہیں کہ عیسائیت ایک نامکمل مذہب تھا۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے بہت جلد منقطع ہونے سے نامکمل رہ گیا۔ جب کہ اسلام کی تکمیل رسول اللہ ﷺ نے فرمائی۔ لہذا یہ بات بالکل واضح ہے عیسائیت کی تکمیل اس کا تسلسل اور قبولیت اسلام کی مرہون منت ہے۔

انہوں نے وضاحت کی کہ اسلام نے عیسائیت کے عقیدہ رہبانیت کا رد کیا اور اسے متوازن سمت بخشی یہ ایک یقینی بات ہے۔ کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو زیادہ حیات ملتی تو اپنی تعلیمات کو اپنے پیروکاروں تک زیادہ مؤثر انداز میں اور منظم بنیادوں پر استوار کرتے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ اس کی تکمیل کی اور ان کی تعلیمات کو اصول قوانین اور اصول اخلاق متعین کیے۔ عیسائیت نے ابتداء سے ہی قتل وغارتگری بوڑھے بچے اور عورتوں کا بے دریغ قتل، لوٹ مار ان کا طریقہ کار رہاہے۔ اور اس زمین پر ان کا پوپ، نائک، پادری، اور بزرگان کلیسیا ان جرموں کی منظوری دیتے رہے۔ اور ان بڑے گناہوں اور جرائم کی مکمل معافی اور کی ضمانت بھی فراہم کرتے رہے۔ ہیں۔[3]

بین الاقوامی اخلاقیات سے مکمل بے اعتنائی ان کا والہ رہا۔ جس کو تاریخی مسیحیت نہ تبدیل کر سکی نہ ہی اس

---

1 پانی پتی، اسماعیل، مکاتیب (دارالمصنفین: اعظم گڑھ، 1978ء)، ص، 52

2Ameer Ali Syed, The Spirt of Islam (Published by forgotten Boblesk Ergod 1902, Page 117

3 محمد امین، امیر علی کی حیات و کردار (ساھتیہ پبلشر: دہلی، 1998ء)، ص 167

کی تطہیر ممکن ہوئی۔ اسلام نے اس تنگ نظری کا خاتمہ کیا اپنے اور دیگر مذاہب کے درمیان رواداری کا رابطہ بحال کیا۔

سید امیر علی یہ اسلوب اپناتے ہیں کوئی بھی مذہب اپنے دور افعال میں کسی نہ کسی مقام پر اپنے ماننے والوں کی وجہ سے متشدد ہو جاتا ہے۔ عیسائیت میں عقیدہ صرف ایک جرم تصور کیا گیا اور اسی مد میں مارٹن لوتھر اور اس کے پیروکاروں کو سزا دی گئی۔ اسلام کے ساتھ یہ صورت حال نظر آتی ہے لیکن اس کی نوعیت ایک حادثہ کی ہے۔ کسی بھی نوع کے اختلافات شرعی مسائل کے تصورات مفاد پرست اور سازش کرنے والے آقاؤں اور سرداروں کے منصوبوں کے آئینہ دار ہیں۔ اور یہی تصورات عیسائیت میں بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں:

> "Christianity as system and a creed raised no protest against slavery enforced no rule in collated no principal for the mitigation of the evil. Excepting a few remakes on the disobedience of slaves, and a gender advice to masters to give servents their due. Teaching of Jesus as in portrayed the chiristian tradition. Contained nothing expressive of disapproval of bondage. On the contrary, christianity enjoined on th slave abolure submission to the will of his or her proprietors[1]".

مسئلہ غلامی اور تعدد ازواج

سید امیر علی نے واضح کیا کہ عیسائیت نے کبھی بھی غلاموں کے حق میں آواز نہیں اٹھائی نہ ہی معاشرتی سطح پر اور نہ مذہبی ضابطے کے تحت کبھی اقدام اٹھائے۔ عیسائیت نے کوئی لائحہ عمل تیار نہیں کیا نہ ہی کوئی اصول وضوابط متعارف کرائے۔ عیسائیت کی تعلیمات میں نافرمان غلاموں کے بارے میں آقاؤں کو نصیحتوں کے علاوہ ایسا کوئی بھی حکم موجود نہیں ہے۔

غلامی کی مذمت کے لئے عیسائیت کی تعلیمات میں ایک لفظ بھی نہیں پایا جاتا۔ اور اس کے برعکس غلاموں کو آقاؤں اور فرمارواں کی مکمل تابع داری اور اطاعت کی تلقین کی گئی ہے۔ رومیوں کے ہاں بھی غلامی اولین ایام سے پائی گئی اور عیسائیت کے اقتدار میں بھی غلاموں کی حیثیت یہی رہی۔ غلاموں کے بارے میں تاریخ ایک بھیانک چہرہ رکھتی ہے۔

اگر تاریخ کے اوراق پلٹے جائیں تو معلوم ہو گا عیسائیت کے دور اقتدار میں صرف یہ تبدیلی آئی کہ اگر کوئی شخص رہبانیت اختیار کرے گا تو وہ تین سال کے بعد آزاد تصور ہو گا۔ اس شرط پر کہ کوئی اس عرصہ میں اس کا

1Ameer At syed, The Spirt of Islam (Abid) Page 18

دعویدار نہ ہو۔ یہ وہ صورت حال تھی جو دنیا کے سب سے ترقی یافتہ نظام نے پیش کی۔

اللہ تعالیٰ نے انسانی مساوات کا جو نظام پیش کیا عیسائیت اسے سمجھنے میں ناکام رہی اس کے بر عکس اسلام نے رنگ و نسل کے امتیاز کا خاتمہ کیا۔ اسلام کی تعلمات نے غلامی کے نظام کو کاری ضرب لگائی اور ہر میدان میں اعلیٰ و ادنی کے فرق کو ختم کر دیا۔ سید امیر علی نے جم کر اسلام کا دفاعی ڈھانچہ پیش کیا۔ اور یہ وضاحت کی کہ اسلام نے غلاموں کی آزادی کو کس قدر حسن والا کام قرار دیا۔

اسلام میں عورت کا مقام

اسلام میں عورت کے مقام و مرتبہ اور تعدد ازواج کے الجھے ہوئے مسئلہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے امیر علی نے عورت کے حق و حقوق سے عیسائیت کے راہبانہ نقطہ نظر سے اپنے نقطہ نظر کا آغاز کیا ہے۔ عیسائیت کی تاریخ میں طبقہ نسواں پر جس قدر مظالم ڈھائے گئے اور جن ذلتوں کا اسے سامنا کرنا پڑا راہبانیت اس کی آئینہ دار ہے۔ عیسائیت کا ہر طبقہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی توضیح و تعریف تک محدود رہا۔

عیسائیت میں عورت کو شجر ممنوعہ اور شیطان کی گزر گاہ اور انسان کو تباہ برباد کرنے والی پکارا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے آئینی قوانین کے نظام میں خواتین کو وہ حقوق عطا کئے جو اس سے پہلے عورتوں کے حصے میں کبھی نہیں آئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے تمام قانونی اختیارات میں عورتوں کو مردوں کے مقابل مقام بخشا انہوں نے بیویوں کی شرعی حد بندی کر کے مساویانہ حقوق اور تعدد ازواج پر پابندیاں عائد کیئں۔ جو دیگر کسی مذہب میں نہیں پائی گئیں۔

عیسائی مبلغین کا رد پیش کرتے ہوئے سید امیر علی نے اپنی کتاب "**Spirit of Islam**" میں عیسائیت اور رومی ورثہ کی پوری تاریخ بیان کی ہے کہ آغاز سے کس طرح عیسائیت میں عورتوں کے ساتھ بہیمانہ سلوک اختیار کیا جاتا رہا۔ پیدائشی گنہگار کے نظریہ نے اس بات کو تقویت بخشی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس نظریہ کی تردید کی۔ اور عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق عطا کئے۔

سید امیر علی نے تعدد ازواج کے سلسلہ میں ایک مدافعتی تاریخی تناظر اختیار کیا۔ اور تعدد ازواج کو محدود کرتے ہوئے اِس کا تعلق محبت کے ساتھ محدود کیا حالات کے پیش نظر اگر تعدد ازواج کا رواج تھا تو اب اسے محدود سمجھا جائے۔ وہ قرآن حکیم کے حکم کے سے استدلال کرتے ہیں کہ قرآن نے دو، تین اور چار کے حکم کے ساتھ اسے ایک طرف موڑا ہے۔

> "The passage runs thus, you my marry two, three the foug wilkes, but not more subsequent lines declare, but if you can not deal equitably and justly with all, you mamy only one. The shall extreme importance of this proviso,

bearing espacially. In mind the meaning which is afleched to the word equity lead!) koranic teaching has not been lost. Sight of by the great thinks of the moslem world. Addi signifies not equility of treatment rely in the matter of lodgment. Clothing and other domestic requisities but also. Complete equity in love affection and esteem[1] ".

اسلام نے چار شادیوں کی اجازت کو عدل کے ساتھ خاص کر دیا ہے۔ کیونکہ اگر عدل نہ ہونے خطرہ ہو تو زیادہ مناسب بات یہ ہے کہ ایک ہی عورت سے شادی کی جائے۔ قرآن نے عدل کے لئے صرف معاشرتی زندگی، مکان، لباس اور دیگر ضروریات کے ساتھ ہی مساوات کا حکم نہیں دیا بلکہ عزت رحم دلی، محبت اور شفقت کے معاملہ میں عدل وانصاف اور مساوات کا حکم صادر فرمایا ہے۔

سید امیر علی ایک تو طرف تو مولوی چراغ علی کا موقف اختیار کرتے ہیں تو ساتھ ہی روایتی طرز استدلال کے طور پر مختلف حالات اور تاریخی واقعات کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ اسلامی ضابطہ خواہ کتنا ہی قدیم کیوں نہ ہو اس میں اتنی لچک ضرور موجود ہے کہ از سر نو اس پر نظر ڈالی جاسکے۔ کیوں کہ اسلام وہ واحد مذہب ہے جو دستور انسانی اور حقوق وفرائض کے معاملہ میں اپنے اپنے اندر لچک رکھتا ہے۔

سید امیر علی علی گڑھ کے برعکس اجماع کی غیر جانب راغب نظر آتے ہیں اور اسے اسلامی فقہ کی اساس قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان کے نزدیک اجماع کے لیے علماء کا ہونا خاص نہیں بلکہ عوام اور اشرافیہ کا کسی فیصلے پر اتفاق کرلینا اجماع ہے وہ خلافت راشدہ کو اسلامی ریاست کی اساس قرار دیتے ہیں وہ اساسی بنیاد کے طور پر خلافت راشدہ کے تصور کو جدید ترقی پذیر مملکت کے قیام کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔

غلام احمد پرویز(1903ء-1984ء) کے فکری رجحانات

غلام احمد پرویز (9 جولائی 1903ء) کو ضلع گورداسپور کے ایک قصبہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اسی ماحول میں پرورش پائی لیکن وقت کے ساتھ آپ عقائد و نظریات میں واضح تبدیلی آئی۔ اور غلام احمد پرویز نے اپنی تحریروں میں تصوف اور اسلام کو ایک دوسرے کی ضد قرار دیا۔ ان کے نزدیک قرآن حکیم کے نزول کا مقصد کائنات کی قوموں کو مسخر کرنا ہے اور ایک ایسا اجتماعی نظام قائم کرنا ہے جس میں قرآنی حدود کے اندر رہ کر انسانی زندگی میں کامرانیاں لائی جائیں۔ اور انسان کو آخروی زندگی کے لئے تیار کیا جائے۔

> "قرآن کا مقصد کائنات اور فطری قوتوں کو مسخر کرنا ہے۔ جبکہ تصوف اس کی ضد ہے تصوف سرے سے کائنات کو باطل قرار دیتا ہے۔ میں قرآن حکیم کی روشنی اور اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں

1Ameer Ali Syed, Spirit of Islam, (abid) page, 190

جس کو اقوام کے سامنے پیش کر دہ کہ جب تک ہم مسالک اور عقائد کو قرآن کے اجتماعی نظام کی طرف راغب نہیں ہو جاتے ہم زندگی کی طرف قدم نہیں بڑھا سکتے۔"[1]

غلام احمد پرویز نے بہت جلد تصوف سے علیحدگی اختیار کر لی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ تصوف اور دین دو الگ الگ نوعیت کے رستے ہیں۔ چنانچہ ان کو قرآن حکیم میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ اور غلام احمد پرویز قرآن حکیم کے تفسیری اشارات میں کھو کر رہ گئے۔ اور بالکل نئی اور عجیب و غریب توضیح و تعبیر اپنائی اور قرآن حکیم کی تفسیر کے لئے جدید اصطلاحات کو متعارف کروایا۔

پرویز کا طرز فکر

غلام احمد پرویز کا مذہبی تفکر اس وقت کے مسلم ممالک کی حالت زار دیکھ کر مختلف سوالات کے جوابات کی نشاندہی کرتا ہے۔ مسلم ممالک کے آزادی حاصل کرنے کے باوجود غلامی، تباہ حالی اور پسماندگی دیکھ کر ان کے اقتصادی اور سیاسی مسائل کا حل ڈھونڈنے کے لیے تفسیر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ آزادی حاصل کرنے کے باوجود مسلم قوتیں اپنے موجود کو بر قرار رکھنے کے لیے غیر مسلم طاقتوں کے رحم و کرم پر کیوں ہیں یہ وہ سوالات تھے جن کی وجہ سے انہوں نے روایتی اسلام کی جگہ قرآن حکیم کی نئی تعبیر و تشریح کی طرف توجہ کی۔

ان کے نزدیک تمام مسلم ممالک میں جو چیزیں مشترک ہیں۔ ان کا تعلق سیاسی اور معاشی پسماندگی سے ہے۔ اگرچہ ان کی تقسیم مختلف ہی کیوں نہیں لیکن مسائل ایک جیسے ہیں۔ انسانیت پسند علمائے مفکرین اسے روایتی اسلام سے دوری کا نتیجہ قرار دیتے جبکہ صوفی اس دنیا کو اور اس کی آسائشات کو اپنے لیے ممنوع قرار دیتے ہیں۔ غلام احمد پرویز نے ان دونوں نظریات کا رد پیش کیا ہے:

"کائنات چند مادی اور طبعائی قوانین کے تحت ہمیشہ کار بند رہتی ہے۔ اور یہ تقسیم دونوں مسلمان اور غیر مسلمان کے لئے یکساں ہے۔ یہ قوانین دونوں پر یکساں اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور پوری کے انسانی حالت اور زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ خواہ ان کا روحانی تعلق کسی بھی درجہ کا ہو۔"[2]

تمام جدیدیت پسند علماء مفکرین میں غلام احمد پرویز وہ واحد شخص نظر آتے ہیں جن کا نقطہ نظر مغرب سے بے حد قریب تر ہے۔ ان کی تعلیمات پر زور انداز میں دنیا پرستی کے مدار میں گھومتی نظر آتی ہے۔ اگر اقتصادی اور معاشرتی معیار کی بات کی جائے تو کسی بھی قوم کا معیار زندگی اور اس کی بلندی اس قوم کی آزادی پر منحصر ہوتی ہے۔ اور آزادی کا دار و مدار قوت تسخیر اور دنیا کی قوتوں پر انسانی دسترس سے ہے۔ غلام احمد پرویز دنیا اور آخرت کی تاویل کرتے ہوئے بالکل ایک الگ سمت میں نکلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے دنیا اور آخرت کے بالکل الگ معنی بیان

---

1 پرویز، غلام احمد، **تصوف کی حقیقت** (طلوع اسلام ٹرسٹ: لاہور، 1981ء)، ص 53

2 پرویز، غلام احمد، **اسباب زوال امت** (طلوع اسلام ٹرسٹ: لاہور، 1983ء)، ص 57

کئے ہیں۔

آخرت اس زمین پر آنے والی نسلوں کا مستقبل مراد ہے۔ جبکہ دنیا سے مراد حال حالات و واقعات ہیں وہ عالم برزخ پر یقین رکھتے ہیں اور اسے اسلام کا ایک اصول سمجھتے ہیں۔ لیکن آخرت کے لیے وہ اس لفظ کی تشریح و تعبیر کو اسے جوڑتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے، انسان کو فائدہ پہنچانے اور اس کی تخلیقی کوششوں کو اجاگر کرنے کے لئے اور انہیں کام میں لانے کے لیے انسان کو تیار کرنے کا ایک راستہ بتایا ہے۔ غلام احمد پرویز تقوی کا حصول کے لئے انسانی کوششوں کو اجاگر کرنے پر ضرور دیتے ہیں۔

"تقوی صرف اللہ کا خوف محسوس کرنا یا اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا معنی و مراد یہ ہے کہ اللہ نے جو ماری اشیاء کے اندر جو فطری قوتیں رکھی ہیں۔ انہیں اقتصادی مسائل سے ٹمٹنے کے لیے استعمال میں لایا جائے۔ دوسری دنیا کے روحانی درجات حاصل کرنے اور اس دنیا کے مادی اکتساب کو حاصل کرنا کوئی الگ باتیں نہیں بلکہ ایک دوسرے سے متفق ہیں۔ جو لوگ ان میں فرق واضح کرتے ہیں وہ "المقتسمون" ہیں۔"[1]

غلام احمد پرویز اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ قرآن حکیم نے مذہب کو دین کی ایک واحد بنیاد قرار دیا ہے۔ یعنی مخلوقات، انسانی قانون اور انسانی زندگی کی وحدت و یگانگت کا تصور اور یہ تصور اللہ تعالیٰ کی واحدنیت سے ماخوذ ہے۔ لیکن تصور آخرت اور اس کے معروف معنی نے ایک اساسی مستحکم معاشرہ کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ مقدر اور قسمت کے نظریات کو علمائے اکرام نے معاشرہ میں پھیلایا اور اسی طرز پر احادیث وضع کی گئی جس سے کلاسیکی علم تفسیر پر اثر پڑا۔

قرآنی موضوعات کو قیاس کے تکملہ کے اوپر توڑ موڑ کر پیش کیا گیا۔ اور ملفوظنہ نظریات کو نقطہ عروج پر پہنچایا۔ انتثال نبوی جو زندگی کو حسین اور خوبصورت بناتی ہیں۔ انہیں غیر اخلاقی بنا کر پیش کیا گیا۔ فن موسیقی یا ادب اچھی زندگی کے طور طریقے وغیرہ ان سب کو بے ہودگی سے متماثل قرار دیا گیا۔ لیکن اگر قرآنی اسلوب دیکھا جائے تو محض چند اشیاء پر احتساب کی بات کرتا ہے دیگر اشیاء کو انسان کے صوابدید پر چھوڑتا ہے۔ صرف یہ فقہی مذاہب و مسالک ہیں جنہوں نے کائنات کی جمالیات پر پابندی عائد کی:

"موسیقی پر پابندی عائد کرتے ہوئے اسے برا تصور کیا گیا لیکن یہی موسیقی صوفیانہ رنگ میں رنگی ہو تو اسے جائز قرار دیا جاتا ہے۔ مصوری ممنوع لیکن علمائے کرام تصویر بنائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ نسائی جن سے پیدا شدہ محبت عذاب جہنم جبکہ محبت کا یہی جذبہ محبت الہی سے پاکیزہ جاتا ہے"[2]

جمالیات کے ضمن آپ کے یہ خیالات ابو الکلام آزاد سے کافی حد تک مماثلت رکھتے ہیں۔ غلام احمد پرویز

---

1 پرویز، غلام احمد، **اسباب زوال امت**، ص، 117

2 پرویز، غلام احمد، **اسباب زوال امت**، ص 169

اسلامی معاشرتی اصول اخلاق کے بارے میں استدلال کرتے ہیں کہ اسلامی انحطاط کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جو دین اور ضابطہ حیات اللہ کی طرف سادہ اور الہامی تھا۔ اسے فقہی اور تقلیدی مذاہب نے دبا کر رکھ دیا ہے۔ اسلامی ریاستوں کی جو حالت اور زبوں حالی ہے اس کی اصل وجہ ذہنی اور روحانی جمود ہے جو کسی بھی معاشرہ کی اقتصادی اور سیاسی زندگی پر اثرانداز ہوتا ہے۔

بعض اوقات غلام احمد پرویز جدیدیت کے غیر مقید پہلوؤں کی طرف سفر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قدرت کی طاقتوں، رازوں اور تخلیق کائنات پر زور دینے کے لیے سائنسی مطالعہ پر اکساتے ہیں۔[1] اور اس بات کو دلیل بناتے ہیں کہ اگر اسلامی ریاستیں اپنا موازنہ دیگر ریاستوں کی خوشحالی اور ترقی سے کرنا چاہتے ہیں تو انہیں فقہی اور روایاتی طرز استدلال کو بدلنا ہوگا جو الہامی نہیں سراسر خود کا بنایا ہوا ہے۔ ان کے لیے دو ہی راستے ہیں یا تو لادینیت کا راستہ جو کے سسک کر مر جانے سے بہتر ہے۔ قرآن حکیم کے بناتے ہوئے اصول وضوابط جو ہر زندہ قوم کے لیے اصلاحی قابلیت کے حامل ہیں۔

اسلامی معاشرہ کی تشکیل وتجدید کے لیے قرآنی لائحہ عمل

غلام احمد پرویز کی تصانیف برصغیر کے اسلام میں ایک الگ سمت میں سفر کرتی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے جدید دور کے تصورات کو قرآن اصطلاحات ولغات کا متبادل قرار دے کر تعبیر وتشریح پر مبنی لغات القرآن تحریر کی۔ اسلامی معاشرہ کی معاشی اور سیاسی حالت کو بہتر بنانے کیلئے قرآنی آیات کو نہایت دقیق معنی پہنا کر پیش کیا۔ انہوں نے انسانی معاشرہ کے لیے ایک مثالی صورت اور خیالی جنت کا تصور پیش کیا۔

انسانی معاشرہ فقط طبعی اور معاشی نہیں ہوتا نظام ربوبیت میں انسان کی اخلاقی ترقی بھی ہے۔ جو اس دنیا میں بہتر زندگی گزارنے کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اور سب چیزیں اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ اور انسان میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا پایا جانا ضرور کسی خاص مقصد کے تحت ہے۔ اور وہ ہمیشہ رہنے والی اقدار کی تخلیق اور صلاحیتیں ہیں۔ ان اقدار میں جہاں صفات الٰہی کا اشارہ لینے سے زیادہ دینے کی طرف ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فرد کو معاشرہ کا خادم بنایا گیا ہے۔ اور جب معاشرہ اپنی حیثیت کو سلیم کرلیتا ہے۔ تو ایسا معاشرہ سخی فیاض اور ہمدرد معاشرہ کہلاتا ہے۔ جس کو قرآن نے انسانی فلاح وبہبود کے لیے انفاق فی سبیل اللہ کا نام دیا ہے۔

> "اسی کا نام بند معاشرہ اور کھلا معاشرہ ہے۔ کیونکہ ایک سے مراد دوزخ اور ایک سے مراد جنت الفردوس گم گشتہ صرف کھلے معاشرہ سے ہی ایک بار پھر سے حاصل ہوسکتی ہے۔ کیونکہ وحی انسان کی اسی طرف رہنمائی کرتی

---

1 پرویز، غلام احمد، **شاہکارِ رسالت** (طلوعِ اسلام ٹرسٹ: لاہور، 1998ء)، ص، 29

ہے۔ جس طرف فرد کا مفاد معاشرہ کی فلاح اور کامیابی کا مرہون منت ہو۔"[1]

غلام احمد پرویز اِس نظریہ کے قائل ہیں انسان کی تمام قوتیں خواہ جسمانی، ذہنی اور اقتصادی ترقی میں صرف ہونے والے تمام ذرائع اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں۔ ہر انسان کی دماغی اور تخلیقی پیداواری صلاحیتیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ لیکن یہ فرق کوئی طبقاتی تقسیم کا نہیں ہے بلکہ محنت کی ضروریات ایک دوسرے کے ساتھ مدد و تعاون کے لیے ہے۔

تفہیم و تفسیر قرآن کا منفرد عقلی رجحان

غلام احمد پرویز معجزات کے قرآنی اسلوب کے بارے میں سر سید احمد خان کے معاون اور فریب تر نظر آتے ہیں۔ کوئی بھی بات جو خلاف عقل ہے اسے تسلیم نہیں کرتے۔ قرآن حکیم کے تمام رائج اصطلاحات کو کوئی نئے معنی پہناتے ہیں۔ اور اپنی بات کو سمجھانے کے لیے انہوں نے کئی جلدوں پر مشتمل لغات القرآن لکھی۔ قرآن حکیم کی تعبیر و تشریح اور از سر نو اسے موثر بنانے کا بیڑہ اٹھایا اور اپنی قرآنی تفسیر کو لوگوں کے لیے معاون بنانے کے لیے کئی کتب تحریر کیں۔ جن میں **لغات القرآن، مفہوم القرآن، معارف القرآن، تبویب القرآن** کی کئی جلدیں مرتب کیں۔ تاکہ لوگ ان کے افکار و نظریات کو ان کی قرآنی بصیرت کے مطابق سمجھ سکیں۔

عہد نامہ قدیم و جدید کے متعلق مناظرانہ رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ اسلام، یہودیت اور عیسائیت کے مابین اختلاف کے قائل ہیں۔ غلام احمد پرویز احادیث صحیحہ کو عقلی معیار کے اوپر درست یا غلط تسلیم کرتے ہیں۔ وہ اس بات سے استدلال کرتے ہیں مغربی جمہوریت کے بارے میں قرآن حکیم کی جمہوریت کا دائرہ انسانی زندگی کے خالص معیارات اور حدود و قیود کا پابند ہے۔

قرآنی اسلوب ایک آفاقی جمہوریت کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور یہ آفاقیت حقیقی معنوں میں اپنا تصور تمام انسانیت میں پھیلا دیتی ہے۔ یہی آفاقیت ایک عالمی ریاست کی طرف راہنمائی کرتی نظر آتی ہے۔ جو کہ جہاد کے ذریعے مکمل طور پر حاصل نہیں کی جا سکتی ہے۔ اِس کے لئے تبلیغ کا راستہ اپنایا جائے اور اسلامی اتحاد کے اصول و ضوابط کو قبولیت کا درجہ دیا جائے۔

عقائد کی کلامی توضیحات

غلام احمد پرویز کے نزدیک اللہ تعالیٰ نظام ربوبیت کے ان دیکھے نتائج پر ایمان لانا ایمان بالغیب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ تصور کہ اللہ تعالیٰ عرش پر موجود ہیں۔ ایک الگ تاثر پیش کرتا ہے۔ اس بات سے استدلال کرتے ہیں:

---

1 پرویز، غلام احمد، **نظام ربوبیت**، (طلوع اسلام ٹرسٹ: لاہور، 1954ء)، ص59

"اللہ تعالیٰ جو اس پوری کائنات کے ہر مقام پر موجود ہے۔ وہ اللہ جو زمان و مکان کی تمام پابندیوں سے آزاد ہے۔ اور جہت و سمت کے تمام تصورات سے آزاد ہے۔ اسے آسمان پر کسی خاص مقام پر خاص کر دینا قرآن کا اللہ کے بارے میں تصور الہیت کے کس قدر منافی بات ہے۔"[1]

غلام احمد پرویز اللہ کے وجود کو عرش پر نہیں بلکہ ہر جگہ پائے جانے کے عقیدے کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک اگر سائنس اتنی ترقی کرے اور اس بات کا امکان پیدا ہو جائے کہ کوئی انسان روشنی کی رفتار سفر کر کے چاند یا مریخ پر پہنچ گیا اور واپس تو تب بھی اس بات کو قبول نہیں کروں گا کہ رسول اللہ ﷺ کا جسمانی معراج ہوئی۔ کیونکہ اس دعوی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایک مقام پر متعین ہیں اور میرے نزدیک یہ تصور قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔"[2]

صفات اللہ کے متعلق جو نظریہ متکلمین کا نظریہ بڑا سخت رہا ہے۔ انہوں نے صفات الہیہ کی جو تاویل پیش کی وہ اسے قبول نہیں کرتے۔ غلام احمد پرویز کا صفات اللہ سے متعلق نظریہ معتزلہ کے قریب تر ہے۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی صفات کو قبول کیا جائے تو اس نظریہ کو قبول کرنا ہے کہ صفات حادث ہیں اور اللہ قدیم اس لیے وہ سرے سے صفات کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ صرف تین صفات کو قبول کرتے ہیں۔ جن کا تعلق نظام ربوبیت سے ہے۔ رب العالمین، رزاقیت اور خلقیت یہ وہ صفات ہیں جس کا براہ راست تعلق قرآن کے نظام ربوبیت سے ہے۔

وہ اس نظریہ کے قائل ہیں کہ جب انسان میں روح پھونکی تو اب انسان بھی صفات باری تعالی کا مظہر ہے۔

"قوانین خداوندی کی اطاعت در اصل انسان کی اپنی فطرت عالیہ کی اطاعت ہے و فرمانبرداری ہے۔ کسی بغیر کی محکومیت نہیں اور جو صفات انسان کے اندر موجود ہیں انہیں مشہور بنانا ہی آدمیت ہے۔"[3]

در حقیقت اللہ کی صفات کو اپنے سامنے ایک معیار اور اپنا نصب العین حیات قرار دیتا ہے ہی اللہ پر اللہ پر ایمان لانا ہے کیونکہ اس سے انسان کا تعلق براہ راست اللہ کے ساتھ ہوتا اللہ پر ایمان لانے کا نتیجہ در حقیقت اپنی ذات کی پہچان اور خود اپنے وجود پر ایمان لے آنا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک عابد و معبود حاکم و محکوم اور آقا و غلام کے سب رشتے ختم ہو جاتے ہیں۔ اس نظریے سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ غلام احمد پرویز اللہ اور اس کے بندے کے تعلق کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

---

1 پرویز، غلام احمد، **معراج انسانیت**، (طلوع اسلام ٹرسٹ: لاہور)، ص 732

2 پرویز، غلام احمد، **معارف القرآن**، (طلوع اسلام ٹرسٹ: لاہور، 1979ء)، ص 241

3 پرویز، غلام احمد، **معراج انسانیت**، ص 420

مرکز ملت کا تصور

غلام احمد پرویز کے مطابق اللہ اور رسول اللہ کو اگر ایک ساتھ شمار کیا جائے تو اس سے مراد سنٹرل اتھارٹی یعنی مرکز ملت کی اطاعت و فرمانبرداری ہے۔ اور ان کے احکام پر آنکھیں بند کر کے عمل پیرا ہوا جائے گا۔ مرکز ملت کی اطاعت و فرمانبرداری انسان کا معاشرتی ضابطہ حیات ہے۔ اور اسی میں فلاح و کامیابی مضمر ہے۔

غلام احمد پرویز ایک جدیدیت کے حامل شخصیت کے طور پر نظر آتے ہیں۔ اور اپنے نظریات کی تاویل کو ایک الگ رخ دیتے ہیں۔ اللہ کے لفظ کی تاویل و تفسیر میں کبھی اللہ کو اللہ کا قانون اللہ بمعنی اللہ کا نظام، اللہ بمعنی اللہ کا معاشرہ اور اللہ بمعنی نظام ربوبیت جس کی تاویل میں قرآن حکیم کی متعدد آیات مبارکہ لاتے ہیں۔ اور اس کی تاویل و تشریح میں اپنے مؤثر نکات لے کر آتے ہیں۔

اگر ان کی فکر کا ماحصل پیش کیا جائے تو وہ اس بات کے قائل نظر آتے ہیں۔ جو دین نبی کریم ﷺ کے ذریعہ سے دیا گیا وہ تمام قرآن حکیم کے اندر موجود محفوظ و موجود ہے۔ اور زندگی کے ہر معاملہ یعنی حق و باطل غلط اور صحیح کا معیار صرف قرآن حکیم ہی ہے۔[1]

تاریخ، روایات، شریعت و طریقت جو ہمارے ہاں مروج ہیں انہیں قرآنی احکامات کے معیار پر ناپا جائے۔ جو اس کے معیار پر پورا اتریں انہیں قبول کیا جائے اور باقی چھوڑ دیا جائے۔ اسلام مذہب نہیں دین ہے۔ مسلمانوں کی آزاد مملکت صرف اسی وقت قائم ہو گی جب اس کے احکامات کو عملاً نافذ کیا جائے گا۔ سیرت کا مطالعہ کیا جائے تو تمام کتب ایسے قصے کہانیوں سے بھری ہیں جو علم و عقل اور خلاف قرآن ہیں۔ یہ وہ عقائد و نظریات ہیں جو انہیں جدیدیت کے آزاد رجحانات کی طرف سفر کرتے دیکھائی دیتے ہیں۔

علامہ عنایت اللہ المشرقی (1888-1963) کی فکری تحریک

عنایت اللہ مشرقی 1888ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ علوم وفنون اور تعلیم و تربیت سے فارغ ہوئے تو آپ کو اسلامیہ کالج پشاور میں درس و تدریس کا موقع ملا۔ آپ اعلی درجہ کے مورخ اور انشا پرداز تھے۔ آپ کی وجہ شہرت آپ کی کی چلائی گئی تحریک "خاکسار تحریک" تھی عنایت اللہ المشرقی کی مشہور تصانیف تذکرہ اشارات، مولوی کا غلط مذہب اور قول و فعل ہیں۔ منطق عقیدہ اور فلسفہ میں آپ کو کافی رسائی تھی۔

تعقل پرست مذہبی فکر

علامہ عنایت اللہ المشرقی ایک عقل پرست مفکر کے طور پر نظر آتے ہیں۔ آپ نے نہ صرف احادیث نبویہ

---

1 محمد عمر دراز، **دولتِ پرویز**، (النور پبلشرز: لاہور، 1992ء)، ص82

کا انکار کیا بلکہ فقہ اسلامی کو بھی علماء کی آرا کا مربہ قرار دے کر رد کیا۔ ہر ایک بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا اور جو انہیں اپنے نظریات کے مخالف لگیں اس کا رد پیش کیا۔ مذہب کیا ہے؟ کون سا مذہب سچا ہے؟ مذہب کی سچائی کا معیار کیا ہے؟ ان سب سوالات کے گرد ان کی فکر گھومتی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے افکار اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل سے نواز کر اسے مختار کل بنا دیا ہے۔ عنایت اللہ مشرقی مغربی تہذیب سے کافی حد تک متاثر نظر آتے ہیں۔ انہیں قرآن حکیم سے مغربی تہذیب اور اس کے اطوار تلاش کرنے کا شوق پیدا ہوا تو وہ لکھتے ہیں:

> "یہی انگریز ہی تو وہ لوگ ہیں کے متعلق فرشتوں نے جب اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ کیا آپ جس کو زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کرنے والے ہیں وہ تو زمین پر خون ریزی کرے گا فساد پھیلائے گا اور ہم تو آپ کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ اور صبح و شام آپ کی حمد و ثنا میں لگے رہتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان انگریز کے آئندہ اعمال پر غور و فکر کرتے ہوئے فرشتوں کو جواب دیا۔ جو باتیں میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انگریزوں کو بہت ساری چیزوں کے نام یاد کروائے اور انہیں چیزوں کی حقیقت سے آگاہ کیا۔ اور فرشتوں نے انگریزوں کے لئے دعا کی تم قیامت تک شاد رہو آباد رہو۔"[1]

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ کے عقیدہ کے مطابق قرآن حکیم میں بھی آپ کو مغرب کے لوگ ہی ایمان والے نظر آئے۔ علامہ عنایت اللہ المشرقی انگریزوں کے لیے اپنے دل میں کافی محبت و عقیدت رکھتے تھے۔ اور اس کا اظہار انہوں نے اپنی کتب میں بجا طور پر کیا۔

تحریک خاکسار

برصغیر کی تحریکِ آزادی میں کئی ایسی جماعتیں اور شخصیات سامنے آئیں جنہوں نے روایتی سیاسی خطوط سے ہٹ کر آزادی کی جدوجہد کو نئی جہت بخشی۔ ان ہی میں سے ایک نمایاں نام "خاکسار تحریک" اور اس کے بانی علامہ عنایت اللہ خان المشرقی کا ہے۔ یہ تحریک نہ صرف ایک عسکری نظم وضبط پر مبنی تنظیم تھی بلکہ اس کے پسِ پشت ایک گہرا فکری اور اصلاحی مقصد بھی کارفرما تھا۔

تاریخی پس منظر

خاکسار تحریک کا آغاز 1930ء میں لاہور میں ہوا جب علامہ عنایت اللہ مشرقی نے یہ محسوس کیا کہ برصغیر کے مسلمان سیاسی، اخلاقی اور جسمانی طور پر کمزور ہو چکے ہیں۔ ان کی نظر میں ایک ایسی تحریک کی ضرورت تھی جو محض سیاسی نہ ہو بلکہ انسان کو کردار، خدمت، نظم وضبط، اور قربانی کے جذبے سے لیس کرے۔

---

[1] مشرقی، عنایت اللہ، **تذکرہ**، (مطبع برقی قوت اردو بازار: امرتسر) ص47

"The Khaksar movement attempted to mold the Muslim character in a unique blend of Islamic values and modern discipline".[1]

"خاکسار تحریک نے مسلمان کردار کو اسلامی اقدار اور جدید نظم وضبط کے منفرد امتزاج سے ڈھالنے کی کوشش کی"۔

خاکسار تحریک محض سیاسی جماعت نہیں تھی بلکہ اس کا مقصد مسلم معاشرت میں فکری و اخلاقی انقلاب لانا تھا، جو مذہبی اور عملی تربیت سے جُڑا ہوا تھا۔

فکری بنیادیں

علامہ مشرقی کی فکر قرآن، سائنس، اور اجتماعی نظم کے امتزاج پر مبنی تھی۔ انہوں نے اپنی تفسیر "تذکرہ" میں اس امر پر زور دیا کہ قرآن مسلمانوں کو قوت، اتحاد، خدمتِ خلق اور جہاد فی سبیل اللہ کی تعلیم دیتا ہے۔ عنایت اللہ مشرقی کی فکر کا مرکز فرد کی تربیت اور اجتماعیت کا احیاء تھا۔ وہ قرآن کو ایک زندہ اور متحرک پیغام سمجھتے تھے جو سماجی اور سیاسی اصلاح کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

اسی حوالے سے ایک اور محقق لکھتا ہے:

"Mashriqi believed that without self-discipline and voluntary service, no nation could rise from its slumber".[2]

"مشرقی کا یقین تھا کہ خود نظم و ضبط اور رضاکارانہ خدمت کے بغیر کوئی قوم غفلت کی نیند سے نہیں جاگ سکتی"۔

خاکسار تحریک کی تربیت گاہیں اسی اصول پر قائم کی گئیں کہ ہر رکن خدمت اور قربانی کو زندگی کا مشن بنائے۔ خاکسار تحریک کا مقصد صرف مذہبی جوش و خروش نہیں بلکہ عملی نظم وضبط اور سماجی خدمت کے اصولوں پر مشتمل تھا، جو قوم کی تعمیر نو کے لیے ناگزیر تھے۔

تنظیمی ساخت

خاکسار تحریک کا ڈھانچہ فوجی اصولوں پر مبنی تھا۔ ہر رکن وردی پہنتا، بیلچہ اٹھاتا، روزانہ مشقیں کرتا اور خدمت خلق کے مختلف کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔ اس تنظیم کا مقصد جسمانی مشقت کے ذریعے روحانی بالیدگی حاصل کرنا تھا۔

"خاکسار تحریک کا نعرہ تھا: "خدمت، قربانی، مساوات" اور اس کی ہر سرگرمی انہی اصولوں پر مرکوز ہوتی

[1] Malik, Hafeez. Moslem Nationalism in India and Pakistan. Washington, DC: Public Affairs Press,1963, 123.
[2] Ahmad, Syed Riaz. Maulana Inayatullah Mashriqi: A Political Biography. Lahore: Vanguard Books, 1991, 244.

تھی"۔[1]

خاکسار تحریک کی اخلاقی بنیادوں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ بیلچہ علامتی طور پر خدمت، قربانی اور انکساری کی علامت تھا۔ خاکسار تحریک نے کئی مواقع پر برطانوی سامراج کے خلاف مظاہرے کیے، جن میں بعض پر تشدد جھڑپیں بھی ہوئیں، خصوصاً 1940ء میں لاہور کے واقعے نے تحریک کی شناخت کو مزید نمایاں کیا۔

سیاسی اثرات

اگرچہ خاکسار تحریک انتخابات یا سیاسی عہدوں میں زیادہ سرگرم نہ تھی، لیکن اس کی عملی موجودگی، نظم و ضبط، اور عوامی خدمت نے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونکی۔ اس نے نوجوانوں کو ایک نیا راستہ دکھایا کہ قیادت صرف تقریر سے نہیں، عمل سے پیدا ہوتی ہے۔

> "The Khaksars were a symbol of silent resistance, who carried shovels instead of swords, and discipline instead of slogans".[2]

> "خاکسار خاموش مزاحمت کی علامت تھے، جو تلواروں کی بجائے بیلچے، اور نعروں کی جگہ نظم و ضبط رکھتے تھے"۔

تحریک کے عملی پہلو عقیدے کے ساتھ ساتھ سادہ اور ہمہ گیر اصولوں پر استوار تھے۔ یہاں تحریک کی انفرادیت بیان کی گئی ہے کہ وہ پر تشدد ہتھیاروں کی بجائے اخلاقی اور سماجی طاقت کو ترجیح دیتی تھی۔

تحریک کے مقاصد

خدمتِ خلق اور سادگی کا فروغ۔

قومی اصلاح اور مسلم تشخص کا احیاء۔

استعمار کے خلاف پر امن مگر مضبوط مزاحمت۔

> "Al-Mashriqi aimed at creating a disciplined and selfless Muslim society that could challenge British imperialism through moral strength"[3].

تنظیمی ڈھانچہ اور علامات

کارکن خاکی وردی پہنتے اور بیلچہ اٹھاتے تھے۔

جسمانی مشق، مارچ، اور نظم و ضبط پر زور۔

---

1 نواب زادہ، شیر علی خان، یادوں کے چراغ (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، 1985)، ص 112

2 Hardy, Peter. The Muslims of British India. Cambridge: Cambridge University Press, 1972, 105.

3 Ahmad, Syed Riaz. Maulana Inayatullah Mashriqi: A Political Biography. Lahore: Vanguard, 1991, 57.

ہر رکن خود کو "خاکسار" یعنی "خادم" کہتا۔

"The Khaksars wore simple khaki uniforms and carried spades, which symbolized humility and service"[1].

اہم تاریخی واقعات لاہور حادثہ (1940)

مارچ 1940ء میں لاہور میں خاکساروں کے ایک پرامن جلوس پر انگریزوں نے گولی چلائی، جس میں کئی خاکسار شہید ہوئے۔

"The Khaksar tragedy of March 1940 in Lahore, where several were killed, revealed the threat the British saw in this well-organized movement".

تحریک کے بعد

قیامِ پاکستان کے بعد خاکسار تحریک کا دائرہ محدود ہو گیا۔

علامہ مشرقی نے ساری زندگی فکری و اصلاحی کام جاری رکھا۔

"After 1947, the Khaksar Movement lost much of its influence, but Mashriqi continued his intellectual mission through writing and public discourse"[2].

تنقیدی جائزہ

خاکسار تحریک کی سب سے بڑی طاقت اس کا اصولی و عملی نظام تھا، لیکن یہی اس کی کمزوری بھی بن گئی کیونکہ عوامی سیاست کی رفتار اور مطالبات سے یہ تحریک ہم آہنگ نہ رہ سکی۔ کچھ محققین کے مطابق مشرقی کی شخصیت آمریت سے قریب تھی، جبکہ دیگر کے نزدیک وہ ایک مخلص اور اصول پسند مصلح تھے۔

"Mishraqi's ideals were noble, but the movement lacked political adaptability in the rapidly changing landscape of Indian nationalism".[3]

"مشرقی کے نظریات شاندار تھے، مگر تحریک میں ہندوستانی قوم پرستی کے تیز رفتار سیاسی منظرنامے سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت نہ تھی"۔

خاکسار تحریک کی سیاسی کمزوری کو اجاگر کرتا ہے۔ مشرقی کے اصولی نظریات اپنی جگہ، مگر ان میں لچک کی

---

[1] Jalal, Ayesha. Self and Sovereignty: Individual and Community in South Asian Islam since 1850. London: Routledge, 2001, 314.

[2] Nasr, Seyyed Vali Reza. Islamic Leviathan: Islam and the Making of State Power. Oxford: Oxford University Press, 2001, 93.

[3] Nasr, Seyyed Vali Reza. Islamic Leviathan: Islam and the Making of State Power. New York: Oxford University Press, 2001, 112.

کمی نے تحریک کو محدود کر دیا۔خاکسار تحریک بر صغیر کی تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ یہ تحریک ان تحریکات میں شمار ہوتی ہے جنہوں نے کردار، خدمت اور قربانی کو سیاست سے جوڑا۔ اگرچہ اس نے آزادی کے سیاسی مراحل میں براہِ راست اہم کردار ادا نہیں کیا، لیکن اس نے نوجوانوں کو عملی، اخلاقی اور نظریاتی سطح پر متاثر ضرور کیا۔

مولانا عبد اللہ چکڑالوی(1903-1976)کا طرز فکر

عبد اللہ چکڑالوی ہندوستان کے ضلع گورداسپورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا علاقہ چکڑالہ تھا اسی نسبت سے چکڑالوی کہلائے۔ عبد اللہ چکڑالوی نے پہلے پہل اپنے آپ کو اہل حدیث تابع سنت کہا لیکن کچھ عرصہ بعد آپ حجیت حدیث کے منکر ہو گئے۔ اور اسے اللہ کی کتاب کی رو سے شرک اور خلاف شرع قرار دیا۔

تصور قرآن وحدیث

عبد اللہ چکڑالوی نے اس سے استدلال کیا ہے کہ قرآن حکیم مکمل اور کافی ہے۔ اس لیے انہوں نے احادیث رسول ﷺ کو شرک فی کتاب اللہ قرار دے کر رد کیا۔ انہوں نے اپنے لیے ایک الگ مکتبہ فکر بنا کیا جس کا نام "اہل القرآن" رکھا۔ انہوں نے بعد میں اپنا تبلیغی مرکز لاہور کو بنایا۔

ان کے خیال میں کتاب اللہ کے ساتھ شرک یہ ہے جس طرح اللہ کے احکام کی اطاعت کی جاتی ہے۔ اسی طرح کسی دوسرے انسان کے قول و فعل کو دین اسلام مانا جائے اور اس کی تابع داری کی جائے موجب عذاب ہے خواہ وہ قول و فعل کسی رسول ہی کا کیوں نہ ہو۔ انہوں نے درج ذیل قرآنی آیات کی تشریح سے استدلال کیا ہے:

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾[1]

(حکم تو صرف اللہ کا ہے)۔

﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ﴾[2]

(سن لو! پیدا کرنا اور تمام کاموں میں تصرف کرنا اسی کے لائق ہے)۔

﴿وَّ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا﴾[3]

(اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا)۔

یعنی دین میں اللہ کے سوا کسی اور کا حکم ماننا اعمال باطل کرنا ہے۔ افسوس لوگ اس میں مبتلا ہیں۔"[4]

---

1 یوسف 40:12

2 الاعراف 54:7

3 الکہف 40:18

4 چکڑالوی، عبد اللہ، مولانا، **ترجمۃ القرآن** (مکتبہ اشاعت القرآن: لاہور) ص 98

عبد اللہ چکڑالوی استدلال کرتے ہیں کہ اللہ کی کتاب کے ساتھ کسی انسان کی بات کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان کی یہ دلیل بالکل بے بنیاد ہے۔ کیونکہ رسول کا حکم در حقیقت اللہ ہی کا حکم ہوتا ہے:

﴿وَ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰیOاِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی﴾[1]

(اور وہ کوئی بات خواہش سے نہیں کہتے۔ وہ وحی ہی ہوتی ہے جو انہیں کی جاتی ہے۔)

ان باتوں کو اللہ کے حکم کے مقابل لا کھڑا کرنا یا اس کو اللہ کے علاوہ کسی اور کا حکم تصور کرنا سراسر خلاف عقل بات ہے۔ کیونکہ اللہ رسول اللہ کا ذاتی اجتہاد یا رائے بھی ہو تب بھی امت پر آپ ﷺ کی پیروی لازم آتی ہے۔ کیونکہ کہ کوئی بھی نبی یا رسول گناہ سے پاک اور معصوم ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کا معاملہ الگ ہوتا ہے۔ عبد اللہ چکڑالوی سورۃ المائدہ کی آیات کو دلیل بناتے ہیں۔

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِیْھَا ھُدًی وَّ نُوْرٌ یَحْكُمُ بِھَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ ھَادُوْا وَ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَیْهِ شُھَدَآءَ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَ اخْشَوْنِ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا وَ مَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ ھُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾[2]

(بیشک ہم نے تورات نازل فرمائی جس میں ہدایت اور نور ہے، فرمانبردار نبی اور ربانی علماء اور فقہاء یہودیوں کو اسی کے مطابق حکم دیتے تھے کیونکہ انہیں (اللہ کی اس) کتاب کا محافظ بنایا گیا تھا اور وہ اس کے خود گواہ تھے۔ تو لوگوں سے خوف نہ کرو اور مجھ سے ڈرو اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑی ذلیل قیمت نہ لو اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کریں جو اللہ نے نازل کیا تو وہی لوگ کافر ہیں۔)

﴿وَ كَتَبْنَا عَلَیْھِمْ فِیْھَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَھُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ وَ مَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾[3]

(اور ہم نے تورات میں ان پر لازم کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت (کا قصاص لیا جائے گا) اور تمام زخموں کا قصاص ہو گا پھر جو دل کی خوشی سے (خود کو) قصاص کے لئے پیش کر دے تو یہ اس کا کفارہ بن جائے گا اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے نازل کیا تو وہی لوگ ظالم ہیں۔)

﴿وَ لْیَحْكُمْ اَھْلُ الْاِنْجِیْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِیْهِ وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ

---

1 النجم 53:3-4

2 المائدہ 5:44

3 المائدہ 5:45

هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾[1]

(اور انجیل والوں کو بھی اسی کے مطابق حکم کرنا چاہیے جو اللہ نے اس میں نازل فرمایاہے اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے نازل کیا تو وہی لوگ نافرمان ہیں۔)

اس بنیاد پر حدیث رسول قرآن حکیم کے خلاف دوسرا قانون ہے۔ اور ان آیات کی رو سے ظلم کفر اور فسق ہے۔ مگر وہ ان آیات کا صحیح مفہوم نہیں پاسکے۔ کیوں اللہ تعالی کا حکم ہی رسول کے اعمال و افکار ہوتے ہیں۔ اور وہ ہرگز ظلم اور فسق نہیں ہو سکتا۔

عقائد اور معجزات سے متعلق نقطہ نظر

عبد اللہ چکڑالوی اس عقیدہ کے قائل تھے کہ جو کچھ بھی بندہ کرے گا وہی پائے گا اس کے مرنے کے بعد کسی قسم کی جزا اور ایصال ثواب کا کوئی رابطہ کسی میت سے نہیں ہوتا۔ یہ بے شک میں عقیدہ ہے کہ مردہ کو بدنی یا مالی عبادت اور صدقہ وغیرہ کسی بھی چیز کا ثواب نہیں پہنچ سکتا ہے۔[2]

لیکن شفاعت کا مسئلہ اتفاقی بھی ہے اور اجماعی بھی اس پر علماء امت کا اجماع ہے۔ اور قرآن و حدیث سے متواتر یہ بات ثابت ہے کہ صرف کفار کے لئے ایصال ثواب نہیں کیا جا سکتا لیکن عبد اللہ چکڑالوی اس کا انکار کرتے ہیں۔ تراویح کے بارے میں تمام امت کا اجماع ہے کہ اسے رسول اللہ ﷺ نے کچھ دن ادا کیا یہ سنت مؤکدہ ہے۔ مگر عبد اللہ چکڑالوی علانیہ اس کا رد پیش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنا رسالہ **البیان الصریح لاثبات کراہتہ التراویح** پیش کیا۔ ان کے نزدیک تراویح کی نماز ادا کرنا بالکل ضلالت کی باتیں ہیں۔

عبد اللہ چکڑالوی انبیاء کرام کے معجزات سے انکار کرتے ہیں صراحت کے ساتھ ترجمہ القرآن میں حضرت عیسی کے معجزات کا رد کرتے ہیں۔ جیسے حضرت عیسیٰ مٹی کا پرندہ بنا کر پھونک مارتے تو وہ اللہ کے حکم سے اڑ جاتا تھا مردوں کو اللہ کے حکم سے زندہ کیا اور بیماروں کو شفا دیتے تھے اللہ کے حکم سے لیکن عبد اللہ چکڑالوی اس بارے میں کہتے ہیں:

> "جسے چار مشہور شکاری پرندے جرخ، باز، بانشہ، شاہین شکاری پرندے تربیت یافتہ ہو کر فرمانبردار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام نے بھی مردگان ایمان کو تعلیم دی اور وہ مطیع و فرمانبردار ہو گئے۔"[3]

﴿وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـــــــــَٔةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ

---

1 المائدہ 47:5

2 چکڑالوی، عبد اللہ، مولانا، **اشاعت القرآن** (اشاعت القرآن: لاہور) ص 316

3 چکڑالوی، عبد اللہ، مولانا، **ترجمۃ القرآن**، ص 316

وَ اُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِۚ وَ اُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَۙ فِیْ بُیُوْتِکُمْۗ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ﴾[1]

(اور اللہ اسے کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل سکھائے گا۔ اور (وہ عیسیٰ) بنی اسرائیل کی طرف رسول ہو گا کہ میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس ایک نشانی لایا ہوں، وہ یہ کہ میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے جیسی ایک شکل بناتا ہوں پھر اس میں پھونک ماروں گا تو وہ اللہ کے حکم سے فوراً پرندہ بن جائے گی اور میں پیدائشی اندھوں کو اور کوڑھ کے مریضوں کو شفا دیتا ہوں اور میں اللہ کے حکم سے مُردوں کو زندہ کرتا ہوں اور تمہیں غیب کی خبر دیتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور جو اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو، بیشک ان باتوں میں تمہارے لئے بڑی نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔)

تلخیص بحث

سر سید احمد خان کی تمام کوششیں تعمیری اور نامیاتی نوعیت کا حامل ہیں۔ جس نے اسلامیان ہند پر زبردست نقوش ثبت کئے ہیں۔ اس میں عصری ضرورت کے حوالہ سے فقہی تبدیلی کی ایک لہر موجود ہے۔ جو تاریخی حوالہ جات کے برعکس عصری ضرورتوں کے مطابق قانون کی تطبیق کا پیغام دیتی ہے۔

سر سید احمد خان نے قرآن حکیم کی توضیح و تشریح کی ایک عقل پسندانہ کوشش کی ہے مولوی چراغ علی عقلیت پسندانہ افکار کی حامل شخصیت رہے۔ اور سر سید احمد خان کی قریبی رفقاء میں شمار میں ہوتے ہیں۔ انہوں نے بڑے جرآت مندانہ انداز میں عیسائی مبلغین کے نظریات کا رد پیش کیا۔ تمام کو افراد کو آزاد ہونے کے نظریہ کا استدلال کیا اور مسیحی حکمرانوں کو ان کے ماتحت باشندوں سے سیاسی سماجی مساوات کے پہلو کو اجاگر کیا۔ ان نظریات کا ابطال کیا۔ جو نسلی لسانی امتیازات بے حد حوصلہ شکن اور توہین آمیز تھے۔

غلام احمد پرویز، عبد اللہ چکڑالوی عنایت اللہ مشرقی، انکار تکبیر اولیٰ کا، تعدد ازواج کو زنا قرار دیتے ہیں۔ اور عذاب قبر سے انکار جیسے نظریات کے قائل تھے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے نام برصغیر میں جو انہیں نظریات کے حامل تھے۔ ان میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق جو سادہ لوہی کے ساتھ سائنسی مضامین میں کے متعلق، حیاتیات، نظام فلکیات اور ارضیات کے متعلق اپنی آرا کا اظہار کیا گو کہ آپ کا علم ان تمام مضامین کے حوالے سے بڑا ہی سطحی تھا۔

غلام جیلانی برقی بھی غلام احمد پرویز کی طرح دو طرح اسلام پر یقین رکھتے ہیں۔ ایک وہ اسلام جس کی بنیاد وحی پر جبکہ اور دوسرا وہ تاریخی اور فقہی مجموعات پر مشتمل ہے۔ اِس کے علاوہ جو لوگ ان نظریات کے قائل رہے اور انکار حدیث کہ ان میں نیاز فتح پوری، ڈاکٹر احمد دین کال گڑھ، عمر شاہ گجراتی اور سید رفیع الدین ملتانی وغیرہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے جدیدیت کے آزاد رجحانات کی طرف اپنی تمام تر قوتیں صرف کیں اور اس اسلوب سے یہ لوگ

---

1 آل عمران 49:3

کوئی بھی تخلیقی سمت قائم کرنے میں ناکام رہے۔

جدیدیت ہمیں دو زاویوں میں سفر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک پہلو مقید جبکہ دوسرا غیر مقید ہے۔ جدیدیت کا مقید پہلو ایک تخلیقی اور تعمیری قوتوں کے ساتھ نظر آتا ہے جبکہ غیر مقید جدیدیت ایسے تمام اصول و ضوابط اور رجحانات سے آزاد نظر آتی ہے۔

فصل دوم

جدت پسند علماء و مفکرین کی تجدیدی کاوشیں

تعارف و تبصرہ

فکر اسلامی کی تشکیل نو یا تجدید، در حقیقت فکری بالیدگی کا آغاز ہے۔ روایت اور جدت کا امتزاج جاری رکھتے ہوئے، تدبر و تفکر کے ذریعے فکر اسلامی میں شامل ہو جانے والے غیر ضروری افکار کی کانٹ چھانٹ کر کے منہاج نبویہ کی طرف بڑھنا۔ اپنی توانائیوں کو صرف کرنا اور ایک معتدل فکر کے ساتھ آگے بڑھنا اور راستہ ہموار کرنا ہے۔

برصغیر میں یہ کام متعدد علماء و مفکرین نے شدید مخالفت کے باوجود عقل اور مصلحت کا دامن نہیں چھوڑا اور قوم کو بدعات سے نکالنے اور شریعت مطہرہ کا وجود اپنی اصلی حالت میں برقرار رکھنے کی کوششوں کو جاری رکھا اور زمانے کے تقاضوں کو بھی ملحوظ خاطر رکھا۔ ساتھ ساتھ اس بات کو ثابت کیا کہ اسلام اور مسلمان جماعت کے ساتھ وابستہ رہ کر اصلاح اور ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا جا سکتا ہے۔

ایسے علماء و مفکرین کو نو راسخ العقیدگی حامل کہا جائے گا، جس سے مراد ایسے افراد جو روایت پسند ہونے کے باوجود مجددانہ صلاحیتوں کے مالک ہوں۔ دینی اقدار منہاج نبوہ اور اصول و ضوابط کے معاملہ میں متشدد نہ ہوں تاویلوں اور توجہات سے بھاگنے والے نہ ہوں۔ بلکہ اس پر غور کرنے والے ہوں اور اگر کوئی روایت سے متصادم نہ ہو تو اسے اختیار کرنے میں تاووالے نہ ہوں حیل و حجت محسوس نہ کرتے ہوں۔ ذیل کی فصل ایسے تجدید کام کی جہات کا تجزیہ لے کر آئے گی۔

مولانا شبلی نعمانی(1914ء-1857ء) اور ان کا مکتب تجدید

روایت وجدت کے درمیان تعلق اور توازن کے لحاظ سے دیکھا جائے تو سب سے نمایاں شخصیت جو نظر آتی ہے وہ مولانا شبلی نعمانی کی ہے۔ شبلی نعمانی ایک کھلے دل و دماغ کے انسان تھے۔ کلاسکی علوم دینیہ میں مہارت رکھنے کے ساتھ جدید علوم پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ وہ مغربی مستشرقین کی آراء کے معاملہ میں نرمی رکھتے تھے۔ ان کا شمار سر سید احمد خان کے رفقاء میں ہوتا ہے۔

شبلی نعمانی نے اسلامی تاریخ نویسی کی روایت قائم کی۔ اسے احیائے مذہب اور احیائے اسلام کا قدامت پسند انہ گہرا رنگ دیا۔ مجموعی حیثیت کے لحاظ سے انہوں نے جو طریقہ کار پروان چڑھایا وہ روایتی انداز فکر کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کی تصانیف کا بیشتر حصہ بنیادی طور پر حالات سنواحی کے اوپر مشتمل ہے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ اسلامی تاریخ میں وہ شخصیات زیادہ اہم ہیں اور ان کا کام اس نوعیت کا حامل ہے کہ اور وہ توجہ کے زیادہ مستحق ہیں۔ جنہوں نے تاریخ اسلام کی نشوونما میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کا رحجان تاریخ نگاروں میں امام غزالی، المامون، مولانا رومی اور امام ابو حنیفہ کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے تاریخ نگاری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کی حیات مبارکہ اور حضرت عمر فاروق کی سوانح حیات بہترین انداز میں مرتب کیا۔

سیرت و تاریخ کا مطالعہ جدید

مولانا شبلی نعمانی جدید مسلم مورخین میں برصغیر میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مغربی علوم وفنون اور علم و فضل کو خراج تحسین پیش کیا۔ گو کہ وہ مغربی مستشرقیت میں اسلام مخالف آراء پر سخت ناراض اور برہم نظر آتے ہیں۔ شبلی نعمانی اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ مغربی ماہرین نے اسلام کے متعلق تحقیق و تدوین کے تجسس کو ابھارا کیونکہ اس ضمن میں انہیں ہندوستانی علماء کی خدمات بہت کم نظر آتی ہیں۔

انہوں نے اسلام کے مطالعہ کے لیے ایک تاریخی اور سائنٹفک تناظر پیش کرنے کی کوشش کی۔ مغربی یورپ تک پہنچنے میں عربوں کے کردار کو اجاگر کیا اور باقی علوم کے تحفظ میں عربوں کی محنت اور کوششوں کو نمایاں کیا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی علم کلام کو درست جانچ اور مواد کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ اور قدامت پسند عقلیت کے لیے ایک طاقتور اور مضبوط ذریعہ سمجھتے ہیں۔[1]

شبلی نعمانی اپنی کتاب **سیرۃ النبی** کو اپنے کاموں میں سب سے زیادہ فعال قرار دیتے ہیں۔ جو ان کی زندگی کی آخری نامکمل تصنیف تھی۔ شبلی نعمانی رسول کریم ﷺ کی حیات طیبہ کے متعلق مغربی مفکرین کے مطالعہ جات کو متعصبانہ خیال نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ وہ اس بات سے خوف زدہ نظر آئے کہ مغربی علوم پڑھنے والے مسلمان نوجوان

---

1 ندوی، سید سلیمان، **حیاتِ شبلی** (دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، 1997ء)، ص198

جو ان تصانیف سے متاثر نظر آتے ہیں وہ کوئی غیر فطری بات نہیں ہے۔ کیونکہ تنقیدی فہم وفراست کے لیے ان کے پاس کوئی بنیادی عربی آخذ مصادر تک ان کی رسائی ممکن نہیں ہے۔

اس نظریہ کے پیش نظر انہوں نے کلاسیکی انداز میں سیرت مطہرہ کو پرکھنے اور دیکھنے کے عناصر کو ابھارا۔ اور جو عناصر انہیں سیرت کے ابتدائی ادب میں قابل اعتماد نظر آئے ان کی بالترتیب درج بندی کی۔ آپ سیرۃ النبی ﷺ میں ان صحیح احادیث کو شامل کیا جن کی سند حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت عمرو بن العاص، حضرت علی اور حضرت انس رضی اللہ عنہم اجمعین سے متعلق تھیں۔ دستاویزات میں مکتوبات جو آپ نے بادشاہوں کے نام لکھے۔ صلح حدیبیہ انہوں نے تقریباً1500 صحابہ کے ناموں کو شامل کیا ہے۔

انہوں نے واقدی کے افسانوی مواد کو جعلی قرار دیا اور اس کے مقابلہ میں اسحاق ابن راہویہ پر اعتماد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح شبلی نعمانی نقد سیرہ کے چار اصول مقرر کرتے ہیں:

1- قرآن حکیم میں رسول پاک ﷺ کی حیات مبارکہ کے متعلق جو کچھ ملتا ہے۔ وہ روح حقائق ہیں۔

2- صحاح ستہ میں جو شہادت ملتی ہیں اور خاص طور پر صحیح بخاری میں ادب سیرت کے حوالے سے جو مواد موجود ہے۔ اسے دیگر روایتی مواد پر تقدم حاصل ہے۔

3- ابتدائی ماخذ میں طبری، ابن سعد اور ابن اسحاق پر اعتماد کیا۔

4- اور یہ کوشش کی جائے کہ جو مغربی مورخین کے نظری مفروضات کو درست کیا جائے جو انہوں نے غیر انتقادی ادب سیرت کے حوالے سے قائم کئے۔[1]

مولانا شبلی نعمانی رسول اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ کو اسلامی اخلاقیات اور عقیدہ، اصول عمرانیات کے کلیدی پہلو کے طور پر دیکھتے ہیں۔ رسول کریم ﷺ کی زندگی اور سیرت مطہرہ اخلاقی پہلوؤں کی نمائندہ ہے۔

غیر مسلموں کے ساتھ موالات کا معاملہ

مولانا شبلی نعمانی اقتصادی تنظیم اور غیر مسلموں کے ساتھ پہلو بہ پہلو جو تمثیلی حکایات پیش کرتے ہیں۔ اس میں عمر فاروق کے اصول زندگی کو بنیاد قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں عمر فاروق کی حیات مبارکہ کو اسلامی عدل اور مثالی بہبود کی علامت قرار دیتے ہیں۔

> "حضرت عمر فاروق کی زندگی اسلامی نظام مدنی اور غیر مسلموں کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارنے کی بنیاد قائم کرتی ہے۔ صلح نامہ نجران میں اسلامی ریاست اور غیر مسلم رعایا کا درمیان اخلاقی ذمہ داریوں اور اُن کے حقوق کی نشاندہی کرتا ہے۔ مثلاً ان کی مذہبی رسومات کی ادائیگی کی ضمانت، بیرونی حملوں سے حفاظت، ان کے زمینی

---

1 نعمانی، شبلی، مولانا، **سیرۃ النبی ﷺ**(دار المصنفین، اعظم گڑھ)، ص44

محصول کو معاف کر کے جزیہ کی ادائیگی اور تجارتی مفاہمت کی حفاظت کی ذمہ داری۔"[1]

شبلی نعمانی اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ تاریخی اسلام میں مسلموں اور غیر مسلموں کے لیے قانون فوجداری ایک ہی رہا ہے۔ کیونکہ حضرت عمر فاروق نے اپنے دور حکومت میں کسی مسلمان کے لئے کسی غیر مسلم کی غیر منقولہ جائیداد کو اپنے قبضے میں لینا ناجائز قرار دیا۔ اور اسی عمل کے اجراء میں صلح نامہ نجران طے پایا۔

شبلی نعمانی اس بات کو حقیقتاً تسلیم کرتے ہیں کہ تاریخ میں حاکموں کی طرف سے محکوموں کو کبھی مساویانہ حقوق حاصل نہیں ہوئے۔[2] اگر اسلام سے پہلے کی تہذیبوں کو پرکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ مفتوح اقوام کے ساتھ جانوروں سے بدتر رویہ اختیار کیا گیا۔ اسلامی تہذیب کو یہ برتری حاصل ہے کہ دیگر کے مقابلہ میں رواداری اور یکجہتی کی قائل نظر آتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ جو کاروائیاں کی گئیں وہ تاریخی صورتحال کے پیش نظر کی گئیں۔ بعد کے زمانہ میں اسی کی کوئی سیاسی یا شرعی اہمیت واضح نہیں ہوتی۔ اسلام میں موقع محل کی مناسبت سے کسی بھی اسلامی ریاست میں روابط قائم کئے گئے۔

> "جزیہ کے متعلق وہ اس بات سے استدلال کرتے ہیں وہ ایک فوجی اخراجات کو پورا کرنے کے لئے لگایا گیا۔ جہاد کے لیے خدمات چونکہ دفاعی ہوتی ہے اس لئے یہ ہر مسلمان کے لئے لازمی نہیں۔ عسکری خدمات کے عوض مسلمانوں کو جزیہ سے مستثنٰی قرار دیا جانا منطقی طور پر جائز ہے۔ شبلی نعمانی اس موقف کو اختیار کرتے ہیں کہ کسی بھی مسلم ریاست میں غیر مسلموں سے دفاعی خدمات لینا سراسر ظلم ہے۔"[3]

وہ صرف مالی امداد سے اس خدمت کو سرانجام دے سکتے ہیں کیونکہ کسی بھی مسلمان ریاست میں اسلامی قوانین کی رو سے ان کی اقدار اور رسم و رواج کا تحفظ ریاست کی ذمہ داری ہے۔ یہ خدمات سرانجام دینا چاہیں تو جزیہ سے مستثنٰی قرار دیئے جائیں گے۔ جزیہ کا اخلاقی جواز پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ غیر مسلم اسلامی ریاست و سلطنت کی مدافعت میں عسکری خدمات سرانجام نہیں دیتے اور ایک معمولی رقم جزیہ کے طور پر ادا کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں ہی کی طرح رفاہ عام کے اداروں سے مستفید ہو سکے ہیں۔

کلاسیکی علوم کی تجدید کی ضرورت

شبلی نعمانی ایک جدیدیت پسند روایتی ذہن کے حامل شخصیت تھے وہ یورپ کے سائنسی نظریات سے پیدا ہونے والے ابہام کے مقابلہ میں ذاتی طور پر عقلیت پسندانہ جوابات کے ذریعے مصالحت کے لئے تیار رہتے۔ ان کے

---

1 نعمانی، شبلی، مولانا، **الفاروق** (دار الاشاعت: کراچی، 1992ء)، ص 101

2 نعمانی، شبلی، **سیرت النبی ﷺ**، ص 213

3 نعمانی، شبلی، مولانا، **حقوق الذمیین**، (دار المصنفین: اعظم گڑھ)، ص 25

نزدیک دور متوسط اور عقلیت پسندی کا مسلم علم الکلام ایک دوسرے کے مقابلے میں مترادف حیثیت رکھتا ہے۔ وہ کسی حد تک فطرت کے متعلق غور وفکر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

وہ اس جامد تاریخی نقطہ نظر کے قائل ہیں کہ جو علم الکلام دسویں سے تیرہویں صدی عیسوی تک اثر انداز رہا وہ آج بھی اسی طرح موثر ہونا چاہیئے۔ علم الکلام کے کلاسیکی تصورات کو وقت کے تقاضوں کے مطابق قابل فہم بنانے کے لیے موجود اصطلاحات میں از سر نو بیان کیا جانا چاہیئے۔

شبلی، علم الکلام کو دو بنیادی اور مختلف نوع میں تقسیم کرتے ہیں:

1- ایسا علم الکلام جو مذہبی مکاتیب کے باہمی اختلافات و تنازعات کا حامل ہے۔

2- دوسرا وہ جو یونانی فلاسفی کی روک اور مختلف چیلنجز کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

3- شبلی نعمانی کا جھکاؤ اور دلچسپی دوسری قسم کی طرف جو اپنے انداز آزادی اور دور جدید کے اثرات کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کی تشکیل نو کی ضرورت ہے۔

مولانا شبلی اور سر سید احمد خان الغزالی کو متوسط زمانہ کے علم الکلام اور موجودہ دور کے مذہبی تفکر کی عقلیت پسندانہ اہمیت کے مابین ایک خاص کڑی سمجھتے ہیں۔ کیونکہ الغزالی اس بات پر پکا یقین رکھتے ہیں کہ جب تک کوئی مسلمان اس بات کی گواہی دیتا رہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور رسول اللہ کے آخری رسول ہیں اسے غیر مسلم نہیں کہا جا سکتا خواہ وہ اپنے نظریات وافکار میں کتنے ہی ملحدانہ نظریات کا قائل ہو۔

جدید علم الکلام کے لیے اسلامی اساسیت کی از سر نو تعبیر و تشریح میں الغزالی کی طریقت اور شریعت کے امتزاج کی کوشش اپنی جگہ پر مسلم اور خاص توجہ کی حامل ہے سر سید احمد خان کی وحی اور وجدان کی تعبیر کی اصل بھی شبلی کو غزالی کے ہاں ملتی ہے جس سے آزادنہ تفکر کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

> "علم الکلام در حقیقت منہاجنات درجہ رکھتا ہے جو اسلامی اصولوں کی روح اور اس کی اہمیت کی تعبیر و تشریح پیش کرتا ہے۔ روح وحی کی طرح ہمیشہ اخلاقی وجدان کے تحت کام کرتی ہے۔ جو خیر اور شر میں تمیز پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ روح انسانی کا تعلق بنیادی طور پر اخلاقی ہے جو اسے روح حیوانی سے ممتاز کرتا ہے۔"[1]

ان آراء وافکار کی روشنی میں مولانا شبلی نعمانی جدیدیت سے متاثر ایک روایت پسند کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ کیونکہ وہ احادیث کی صحت کی قبولیت کے سلسلہ میں جدیدیت پسندوں کے معیار کو قبول کرتے ہیں اور اسی پر احادیث صحیحہ کی سند کو پرکھتے ہیں۔ راویوں کی تعداد کی بجائے وہ متن کو عاقلانہ زاویہ پر جانچتے ہیں۔

---

1 نعمانی، شبلی، مولانا، **علم الکلام**، (ادارہ دار المصنفین: اعظم گڑھ، 1993ء)، ص 25

ندوہ العلماء کی فکری جدوجہد

علمائے کرام میں کچھ ایسے لوگ بھی موجود بھی تھے جنہوں ندوۃ العلما کی مخالفت کی لیکن پھر ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جنہوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ مدارس کا نصاب ایسا ہونا چاہئے جو ضروریات زمانہ کے مطابق ہو۔ قدیم علماء اور علی گڑھ کے درمیان ایک تعلیمی اور مذہبی روابط کو قائم کیا جاسکے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے ندوۃ العلماء 1894ء میں لکھنو میں قائم ہوا۔ جن مقاصد کو مد نظر رکھ کر ندوہ کا قیام عمل میں لایا گیا وہ درج ذیل ہیں:

1۔ علمائے کرام کے باہمی اختلاف کا رفع اور اختلافی مسائل کے رد کا پورا انسداد۔

2۔ نصاب تعلیم کی اصلاح، شائستگی اطوار اور تہذیب اخلاق، علوم دین کی ترقی وغیرہ۔

3۔ برصغیر کے مسلمانوں کی اصلاح و فلاح سیاسی اور ملکی معاملات سے علیحدگی۔

4۔ ایک ایسے جامعہ کا قیام جس میں علوم وفنون کے علاوہ عملی صنائع کی بھی تعلیم دی جائے۔

5۔ دار الافتاء کا قیام۔

ان مقاصد کے پیش نظر ایک ایسے ادارے کی بیناد رکھ گئی جس میں مسلمانوں کی زندگی میں پیش آمدہ مسائل کے حل کے لئے کاوش کرنا اور حالات کی کشیدگی کو درو کرنا تھا۔ تاکہ ایک ساز گار ماحول ترتیب دیا جاسکے۔ اس عمدہ خیال کے محرک تو مولوی عبد الغفور ڈپٹی تھے۔ مگر اس کی تکمیل کا سہرا مولوی سید محمد علی کانپوری کے سر جاتا ہے۔

مغربی تمدن کی اشاعت نے مشرق خصوصاً برصغیر میں ایک کشمکش پیدا کردی ایک طرف روایت پسندی اور دوسری جدید اصول وضوابط اور قواعد نظر آئے۔ ایسے حالات میں تین طبقات نے اس خلا کو پورا کرنے کی کوشش جاری رکھی۔

1۔ وہ طبقہ جنہوں اپنی روایات کو نہیں چھوڑا اور اپنے تقلیدی رسوم وخیالات میں سختی کے ساتھ کے ساتھ قائم رہا اور کسی بھی طرح کی لچک اور حرکت اس میں نہیں پائی جاتی۔

2۔ دوسرا طبقہ وہ جس نے مغربی تمدن اور ایسی آب وہوا میں پرورش پائی وہ متعصب اور جاھل علماء اور عوام الناس کے عقائد کو اسلام سمجھتا ہے۔ اور انھیں ترقی میں مانع دیکھ کر منوحش اور مضطرب رہا۔

3۔ تیسرا طبقہ ایک معتدل فکر و نظر کا حامی رہا یہ ان دونوں کناروں کے لیے سبط ہے۔ یہ طبقہ نہ پہلے کی طرح تقلید اور جامد تقلید کا قائل رہا اور نہ ہی اپنے آپ کو مغربی اصول وضوابط کے اور مغربی تہذیب کے سیلاب میں

بہایا۔ اس کا اعتقاد یہ ہے مغرب کی وہ تمام خوبیاں حاصل کی جا سکتی ہیں. بغیر اس کے دین اسلام کی خالص اور حقیقی روح کو کوئی ٹھیس پہنچائی جائے۔ برصغیر میں یہ "معتدل فکر و نظر" کے حامی طبقہ کا فقدان نہیں رہا۔

ندوۃ العلماء کا تجربہ کئی لحاظ سے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے بڑا اہم تھا۔ لیکن یہ تجربہ پوری طرح سے کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ اس کے مقاصد کے تکمیل میں کوئی دشواری یا بے توجہی نہیں بلکہ شخصی نفاق تھا۔

مولانا شبلی نعمانی کے زمانے میں ندوۃ العلماء نے خاصی کامیابیاں حاصل کیں، لیکن بعد میں مختلف اندرونی خرابیوں کی وجہ سے ادارہ اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام رہا۔ ان اندرونی خرابیوں میں مالی بدانتظامی اور وسائل کی کمی، انتظامی امور میں علماء کے درمیان اختلافات، نصاب کی تجدید کے معاملے پر آراء کا ٹکراؤ، روایت پسند اور جدت پسند علماء کے درمیان کشیدگی، اور طلباء کی تربیت کے نظام میں یکسانیت کا فقدان شامل تھے۔

ندوۃ العلماء کی نمایاں ناکامیوں میں مغربی اور مشرقی علوم کے درمیان توازن قائم کرنے میں ناکامی، جدید تقاضوں کے مطابق نصاب کی تشکیل نو میں ناکامی، ملک کی سیاسی و سماجی صورتحال کے مطابق طلباء کی تربیت میں ناکامی، علمی معیار کو برقرار رکھنے میں دشواری، اور معاشرے کی تبدیل ہوتی ضروریات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے میں ناکامی شامل تھیں۔ یہ تمام خرابیاں اور ناکامیاں مولانا شبلی نعمانی کے دور کے بعد واضح طور پر سامنے آئیں اور ادارے کی ترقی میں رکاوٹ بنیں۔

مولانا شبلی نعمانی کے ذریعے ندوہ کو بڑا فیض حاصل ہوا ایک علی گڑھ سے اور دوسرا مصر سے شبلی نے قیام علی گڑھ میں مغربی افکار مغربی درس و تدریس اور علوم جدیدہ اور مستشرقین کی کتب سے جو واقفیت حاصل کی اس کا فائدہ ان کے طلبہ تک پہنچا اور "**خطبات احمدیہ**" کے ذریعے سرسید احمد خان نے مغربی نکتہ چینیوں کا جواب دیا۔ مصری اہل علم سے سیکھنے کا موقعہ انہیں دوران ملازمت مصر جانے کے اتفاق سے حاصل کیا۔ ندوہ نے مصر سے کسب فیض حاصل کیا۔ اور اس کی بدولت اسے علما پیدا ہوئے جن کی نظر زمانہ رفتار پر رہتی وہ ایک خاص اسلوب کے تحت قوم کی علمی ضروریات کو پورا کرنا چاہتے تھے۔

مولانا آزاد خود کئی وقت تک ندوہ میں مقیم رہے اور اس سے مستفید ہوتے رہے۔ اگرچہ وقت کے ساتھ ندوہ کا چراغ مدھم ہوا۔ لیکن اس نے اعظم گڑھ اور میں جو شمعیں جلائیں وہ پوری آب و تاب سے روشن ہوئیں۔ لیکن شبلی نعمانی اور دیگر رفقا ندوہ کو جیسا دیکھنا چاہتے تھے ویسا نہ دیکھ سکے: میر انصب العین ایک مذہبی انجمن

ہے ندوہ ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ اپنے مقاصد واہداف کو پورا نہ پہنچ پایا۔[1]

لیکن ندوہ فقط توسیع علم اور ترقی و اصلاح کا مرکز نہ رہا اور قدیم و جدید کی چیلنج کو پورا کرنے سے قاصر رہا۔ انیسویں اور بیسویں صدی اپنے مذہبی اور سیاسی اتار چڑھاؤ فکر اور اصلاح کی کشمکش کا دور رہا۔ اور تین جہات کی قیادت نظر آئی جس میں اپنے حصہ کی ذمہ داری کو نبھانے کی پوری کوشش کی گئی۔ احیائے مذہب اور دین کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے متعدد شخصیات نے اپنا کردار بخوبی نبھایا ہے۔ مختصراً یہ کہ مغربی آمریت اور مسلمانوں کی بدحالی نے اس سوچ کو پروان چڑھایا۔

علامہ محمد اقبال (1876ء-1938ء) اور مسلم نشاۃ ثانیہ

محمد اقبال ایک ساسی مفکر، شاعر اور فلسفی کی حیثیت سے برصغیر میں بیسویں صدی کی مذہبی اور اسلامی فکر پر اِسی طرح چھائے جیسے کہ سر سید احمد خان انیسویں صدی میں ایک نمایاں حیثیت کے حامل رہے۔ محمد اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی اور معاشرتی حالات پر ایسے موضوعاتی مسائل کے حل کے لیے آفاقی جہات کو متعارف کروایا۔ ان کی شاعری فطرت کی عکاس اور ان کی نظموں میں ہندوستانی قومیت کا رنگ بڑا نمایاں رہا۔ اسلام کے کلاسیکی علوم کی نمائندگی آپ کا اسلوب بیان کا رہا۔

محمد اقبال نے 1905ء سے 1908 تک حب یورپ میں قیام کیا تو ان کا رحجان بڑے واضح طور پر ہندوستانی قومیت سے اسلامی رنگ تہذیب جیسے بین اسلامیت کی طرف مائل ہوا۔ انہوں نے بڑی شدت سے اس بات کو محسوس کیا۔ برصغیر مسلمانان ہند جس فکری اور عملی مسائل سے دوچار ہے۔ ان کے حل کے جامع اور مربوط فکری نظام کی ضرورت ہے۔ انہوں نے اپنے خطبات میں مربوط اور منضبط طریقہ سے اسلام کے مذہبی افکار کی تشکیل نو کی بات کی۔

اسلامی اقدار کی عالمگیری

علامہ محمد اقبال اسلام کے مذہبی افکار کی جس تشکیل نو کی بات کی اس کو ایک کلید کے طور پر سمجھنے کی کوشش کی جائے تو وہ اسلام کو ایک متحرک اور ارتقاء پذیر تصور کرتے ہیں۔ لیکن وہ "اصول" کو بھی مد نظر رکھے ہوئے تغیر کے فرع اور دوام کی بات کرتے ہیں۔ انہوں نے تحصیل علم کے طریقہ کار میں مجموعی طور پر تجربات کو بنیادی اہمیت دی اور لفظ کے مقابلہ میں عمل کو مقدم رکھا۔

---

1 نعمانی، شبلی، مولانا، **مقالات شبلی** (دار المصنفین اعظم گڑھ، 1986ء)، ص97

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نانوری ہے نہ ناری[1]

علامہ محمد اقبال کی مسیحائی صرف برصغیر کے مسلمانوں کے لیے نہ تھی بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے لئے تھی۔ وہ اپنی تنقید سے اسلامی دنیا کو ایک نئی صورت دینا چاہتے ہیں۔

انہوں نے اپنے خطبات میں اسلام کو ایک عالمی آئیڈلوجی (Ideology) کے طور پر پیش کیا۔ اور پوری دنیا کے مسلمانوں کو زندگی کی تین بنیادی اقدار، قوت مساوات اور حریت پر متحد ہونے کی دعوت دی کیونکہ ان کے نزدیک یہی تین اقدار پوری مسلمان امت کو متحد اور یکجا ہونے کے تصور کو ممکن بناتی ہیں۔ یہ بات مکمل طور پر واضح ہے کہ اقبال پوری طرح مشرق کی سرچشمہ فکر سے سیر اب تھے لیکن ان کی فکر پر مغرب کی فکر کا گہرا اثر رہا۔ جو کہ ان کے خیالات جس سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جس کا اظہار انہوں ہے حطابات میں برملا طور پر کیا ہے (وہ فشلے، نطشے اور برگساں) ہیں۔

برگساں کی فکر سے اقبال نے وقت کی حیثیت کی وضاحت کی جیسے ماضی حال اور مستقبل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ علامہ اقبال نے مسلمانوں کی فکری نشاۃ ثانیہ اور تمام روحانی مسائل کے حل کے لئے اسلام کی حقانیت کی وضاحت اپنی نظموں میں شاعری کے ذریعہ سے بھی کی۔ اور اس ضمن میں جو ایک بہترین کاوش نظر آتی ہے۔ آپ کی اصلاحی اور تجدیدی فکر کو نثر میں بیان کرنے والی کتاب اپ کے انگریزی خطبات کا مجموعہ ہے جس کا عنوان تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ یعنی "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" رکھا گیا ہے۔

اقبال کے انگریزی خطبات میں جس میں ان کی مذہبی فکر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ علامہ محمد اقبال کے ان خطابات کو دنیا میں ہونے والی ترقی ارتقاپذیری اور جدید فکر کی وضاحت کے لحاظ سے جدید علوم سے تعلق رکھنے والے انسان کی ذہنی ہم آہنگی کے لیے پیش کیا گیا:

> "In these lectures, which we hate were undertaken at the request of madras Muslim association and deleted at Madars, Hydrabad and Aligarh I have tried to mint though partially, demand by urgent attempting to reconstruct Muslim religious philosophy. To with due regard of this philosophical tractions Islam recent developments in the various domains of human knowledge."[2]

---

1 محمد اقبال، علامہ، **بانگ درا**، (ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ: 1996ء) ص129

2 Muhammad Ibal, ***The Reconstruction of Religious thought in Islam*** (Iqbal Academy: (Lahore), Preface

اسلام کا علمی و فکری رویہ

دور جدید میں پیش آنے والے یا رونما ہونے واقعات نے انسانی ذہن کی تنقیدی حس کو مذہب کے بارے میں زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سارے معاملے میں اسلام نے وحی و عقل کے امتزاج کا نقطہ نگاہ متعارف کروایا۔ اسی بنیاد پر مسلمانوں نے ماضی میں شاندار کامیابی کی حاصل کی۔ علامہ اقبال بھی عقل اور وجدان کو نمایاں اہمیت کا حامل تصور کرتے ہیں۔ اور وہ مذہب کے بارے میں بطور بذریعہ علم بحث کرتے ہیں۔ اور اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کے دیگر علوم کی طرح مذہب علم کا ایک ذریعہ ہے۔ جو تمام علوم سے مستند ہے۔

اِس منہج میں وحی، روحانی کی تجربات، علمی تحاریک، خرد اور وجدان سب شامل ہے۔ وہ اس بات کا دعوی کرتے ہیں کہ وجدان عقل کی ایک اعلی ترین شکل ہے۔ وہ اس کا دشمن کسی صورت نہیں ہے مذہب جو کہ وجدان کے ذریعہ سے اپنا جواز حاصل کرتا ہے عقل ہی کے ذریعہ سے قابل فہم ہے۔ کیونکہ خرد اور وجدان دونوں عقل کے مستند ذرائع ہیں۔ کیونکہ انسانی ذہن کی تعریفات میں بنیادی صفات زمان و مکان اور وجدان کی جانب حرکت کرتا ہے۔ جو کہ سراسر مذہب کا ہی طریقہ عمل ہے۔

اس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے اللہ کے حکم کے تحت اس کی تخلیق کی گئی کائنات اپنے اندر ارتقاء انقلابی طاقت اور ارتقاء کی اہل اور قابل ہوتی ہے۔ اور انسان اسے فتح کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ انسان زمین پر اللہ کا نائب مقرر کیا گیا ہے۔ اس منصب کے تحت وہ ارتقا کی بلندی پر کھڑا ہے۔ اور اس ارتقاء پذیری کے عمل میں اگر انسان پہل کرتا ہے تو اللہ کی طاقت اور مدد اس کے ساتھ ہو جاتی ہے:

> "It is the lot man of to share in the deeper aspirations of the him universe around and to shape his own that. Destiny now by adjusting the universe, himself to it's now by putting these this energy whole to could its forces. To his oven ands and purposes. And in this process of progressive change God becomes. Co-worker with him provided man takes the initiatives."[1]

﴿إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ﴾[2]

---

1 Muhammad Iqbal, The Reconstruction of Redigious thought in Islam. Page 11

2 الانفال 12:8

(جب اے محبوب تمہارا رب فرشتوں کو وحی بھیجتا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم مسلمانوں کو ثابت رکھو عنقریب میں کافروں کے دلوں میں ہیبت ڈالوں گا تو کافروں کی گردنوں سے اوپر مارو اور ان کی ایک ایک پور پر ضرب لگاؤ)۔

مذہب انسان کو وہ طریقہ کار فراہم کرتا ہے جس کو بروکار لاکر انسان اپنے لیے فعال سرانجام دیتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ محمد اقبال اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ تصوف کسی بھی شے کی حقیقیت کی جانچ پرکھ کے لیے اسی طرح جائز ہے طریقہ کار ہے جس طرح عقلیت پسندی اگرچہ ان دونوں کا طریقہ کار مختلف ہے۔

تصور زمان و مکان، حرکت اور انقلاب

علامہ محمد اقبال اس بات سے استدال کرتے ہیں کہ قرآن حکیم نے اگر سب سے جاندار اور ٹھوس موضوع کی حقیقت پر زور دیا ہے تو اس کا تعلق انقلاب اور حرکت کے اصول پر ہے۔ کیونکہ قرآن حکیم زندگی کے مختلف مراحل میں قرآنی حقیقت کا واضح اور قطی سراغ فراہم کرتا ہے۔ زمان کا تعلق یا نام دراصل عرصہ زندگی ہے۔ اور خودی کا تعلق عرصہ قیام سے ہے۔

کسی بھی تہذیب میں زمان کا تصور زندگی اور موت کی حثیت رکھتا خاص طور پر اسلام میں اس کا مطلب لا محدود تک قربت اور رسائی حاصل کرنا ہے۔ قرآن حکیم کا سب سے اولین مقصد انسان اور خدا کے درمیان مختلف جہات میں رابطہ کا بلند تر شعور پیدا کرنا ہے۔ آزاد تخلیقی حرکت کی سب سے واضح مثال بے آواز اس کائنات کی جنبش و حرکت ہے۔ اور دن اور رات کا لامتناہی سلسلہ ہے جو اللہ کی نشانیوں میں بڑی واضح نشانی اور دلیل ہے۔

اقبال کے بقول شعور کے اس تجربے سے یہ بات واضح ہے کہ پوری کائنات ایک آزاد اور تخلیقی حرکت ہے۔ اور اگر زندگی کے تسلسل کو دیکھا جائے تو وہ محض اعمال توجہ ہے شعوری اور لاشعوری مقصد کے بغیر اس توجہ کا عمل کوئی مقصد نہیں رکھتا۔ زمان مکان در حقیقت فکر کی اس مختلف تغیرات سے متعلق ہے۔ جو اللہ واحد کی آزادانہ خداق توانائی ہے اور اس کا تعلق اللہ کی ذات کو عقلی پیرائے میں سمجھنے سے ہے۔ قرآن حکیم نے اس دین کی تکمیل کا اعلان کیا جس نے پہلی مرتبہ انسانیت کو ایک متحرک کائنات کا تصور فراہم کیا۔

قرآن حکیم کے مطابق کائنات اپنے اندر فروغ پذیری کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس کی اصل متناہی اور حرکی ہے علامہ محمد اقبال نے اپنے خطبہ مسلم ثقافت کی روح (The Spirit of Muslim Culture) میں اس بات بطور استدلال پیش کیا کہ اسی کے سبب اسلامی ثقافت کی اصل روح بیدار ہوتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر لمحہ اور ہر لحظہ بڑھتی اور نشو و نما پاتی ہوئی کائنات ہے جس سے اسلامی فکر کے تمام پہلو اس تصور سے آملتے ہیں کہ کائنات کا ہر اسلوب متحرک ہے۔ اور دین اسلام ایک ثقافتی اور متحرکت تحریک کی حیثیت سے اس نظریہ کو مسترد کرتا ہے کہ

کائنات قدیم اور ساکن ہے۔[1]

ہر ایک چیز کی اصل روحانی ہے۔ اور اللہ حکم سے اپنا وجود رکھتی ہے۔ علامہ محمد اقبال نے دراصل اللہ کا ایک تخلیقی تصور پیش کیا۔ یعنی اس حوالہ سے اس کے تخلیقی امکانات کی کوئی حد نہیں۔ ہر روز اس کی وسعت اور پھیلاؤ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ گویا ایسی کوئی چیز نہیں جو اللہ کی تخلیقی صعایت سے باہر اپنا وجود رکھتی ہو۔ یا کوئی ایسی چیز جو اللہ کی تخلیقی صلاحیتوں کو محدود کر سکے۔

توحید مرکز فکر

علامہ محمد اقبال الہیت کے تصور کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ اگر ہم کائنات کی تخلیق اور اس کے دیگر متعلقات کو دیکھیں تو بڑی شدت سے اس بات کی وضاحت ہوئی کوئی انفرادی اور خودی مطلق ہستی ضرور موجود ہے۔ جو اس سارے نظام کو جاری رکھے ہوئے ہے اور عقل اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ کوئی ایسا وجود ضرور موجود ہے جس کے حکم کے تابع ہے۔ محمد اقبال خودی مطلق کے وجود کو اللہ کی ذات سے جوڑتے ہیں۔ سورۃ الاخلاص میں خودی مطلق کو اللہ کہہ کر پکارا ہے۔

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌOاَللّٰهُ الصَّمَدُOلَمْ يَلِدْ وَ لَمْ يُوْلَدْOوَ لَمْ يَكُنْ لَّه كُفُوًا اَحَدٌ﴾[2]

(تم فرماؤ وہ اللہ ہے وہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ اس کی کوئی اولاد اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ اس کے جوڑ کا کوئی)۔

اللہ کا تصور اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ایسی لاثانی انفرادیت والی ذات جو بقائے نسل کی محتاج نہیں ہے اور جس کا خاتمہ کسی صورت ممکن نہیں۔ محمد اقبال کے نزدیک سورہ اخلاص عیسائیت کے عقیدہ تثلیث کا رد نہیں بلکہ وجود باری تعالیٰ کی انفرادیت اور احدیت کا بیان ہے۔ سورۃ الاخلاص کا مقصد اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سورہ محض عقیدہ تثلیث کا رد نہیں بلکہ اللہ کے واحد کامل ہونے کو واضح کرتا ہے۔[3]

یہاں گیرائی اور گہرائی کا معاملہ کی وضاحت نظر آتی ہے کہ فکر اقبال اس بات کا استفہام ہے کہ اللہ کی ذات کا وجود کائنات کی ہر شے کے خاتمہ سے نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ کی ذات ایسی ہے جیسے اپنی بقاء کے لئے کسی بیرونی سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی احدیت والہیت اسے ہر عیب اور نقص سے پاک ہے۔ بقول برگساں کہ انسان اپنی نسل بڑھانے کے لئے توارت کے مراحل سے گزرتا ہے۔ جبکہ اللہ کی ذات ایسی کسی چیز کی محتاج نہیں۔[4]

---

1 تنولی، طاہر حمید، **معاصر تہذیبی کشمکش اور فکر اقبال** (اقبال اکادمی پاکستان: 2013ء) ص200

2 الاخلاص 112:1-4

3 خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، **خطبات تلخیص اقبال**، (بزم اقبال: لاہور، 1988ء)، ص64

4 *Muhammed Iabal, Dr.* ***The Reconstrucjon of Religious thought in Islam***, *Page 50*

اللہ کی احدیت کی مثال انسانی ارتقاء سے پیش نہیں کی جاسکتی ہے۔انیت کاملہ کی یہ خصوصیت اللہ کی احدیت کے تصور کا ایک بنیادی جز ہے تاکہ فرد کامل کے صحیح تصور میں کسی بھی قسم کا کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے۔اللہ تعالیٰ کی ذات کی نوعیت روحانی ہے وہ ہر طرح کی اشیاء کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔علامہ محمد اقبال اس بات سے استدلال کرتے ہیں اس کائنات کا وجود کسی حادثہ کا مرہون منت نہیں جس کے کوئی آغاز یا انجام ہو بلکہ خالق اور مخلوق کی دوئی کا اصل سبب اور وجہ ہماری سوچ ہے۔اللہ کی احدیت میں نہ کوئی تغیر ہے اور نہ کوئی تبدل یہاں تک کہ ہر تصور بعض اوقات ابدیت سے بالاتر معلوم ہوتا ہے۔اس کی ابتدا یا انتہا کا تعین کرنا ناممکن ہے۔اللہ کا علم قدرت کاملہ وسیع ہے اللہ کے نزدیک فکر اور عمل، تخلیق کا عمل اور ماننے کا عمل یکساں مترادف ہے۔[1]

تخلیق آدم اور ہبوط کا مقصد عالی

علامہ محمد اقبال اس بات سے استدلال کرتے ہیں ہبوط آدم کسی اخلاقی ہستی یا گراوٹ کا نام نہیں ہے بلکہ یہ انسان کے سادہ شعور سے شعور خودی کی طرف پہلا سفر ہے۔جو اس کے وجود کی کمزوری کے باعث اس کے اندر موجود ہے یہ اس بیداری کے عمل کا نام ہے جو انسان اپنے اندر نجی علتوں کے باوجود محسوس کرتا ہے۔

دراصل ہبوط آدم ایک ایسے معاشرتی نظام کے وجود میں آنے کی طرف اشارہ جس میں انفرادیت اور مرضی کے امکانات موجود ہوں۔ ایک ایسے فطری نظام کا اظہار ہے جس میں فطرت کے محدود ہونے کے باعث اچھے اور برے دونوں عناصر اپنی جگہ رکھتے ہوں۔اور یہ فطری تصادم بقول محمد اقبال اس آیت کے معنی ومفہوم میں پوشیدہ ہے:

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّه كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا﴾[2]

(بے شک ہم نے امانت پیش فرمائی آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر تو اُنہوں نے اس کے اُٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور آدمی نے اُٹھالی بے شک وہ اپنی جان کو مشقت میں ڈالنے والا بڑا نادان ہے)۔

درحقیقت یہ اعلان ایک مربوط اور منظم معاشرہ کی تنظیم کا عکاس ہے۔اور انسان اور خدا کے درمیان ایک اخلاقی تعلق کے مترادف بھی ہے۔اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ تاکہ بندہ اور معبود کے درمیان مقررہ شدہ حقوق و فرائض کا صحیح تعین کیا جاسکے۔مقررہ شدہ عبادات کا ایک فکری پہلو یہ بھی ہے کہ عبادات اور دعا کا نظام دراصل

---

1 نذیر، نیازی، سید، **تشکیل جدید الٰہیات الاسلامیہ**، (اسلامک بک سنٹر، دہلی: 1986ء)، ص144

2 الاحزاب: 72

انسان اور خدا مابین ایک ایسا رابطہ اور تعلق ہے جو انسانی وجود اور معاشرہ کی اخلاقی ضروریات کے باعث وجود میں آتا ہے۔ دراصل ہبوط آدم ایک جدوجہد سے بھرپور ایک نئی زندگی کا نقطہ آغاز ہے۔

“Adam's insertion into a painful physical environment. Was not meant as a punishment, it was meant rather to defeat the object of satan who enemy of diplomatically I tried keep ignorant of the Joy of perpetual growth and expansion. But the life of finite ego in obstructing environment depends the perpetual exportation an on growth and expansion expansion of knowledge. based on actual experience.”[1]

در حقیقت قرآن حکیم کے اس قصہ کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو مصائب کو صبر و تحمل سے برداشت کرنے کا حوصلہ سیکھنا چاہیے اور یہ قصہ خدا اور انسان کے بہترین رابطہ کے اظہار کا عکاس ہے کیونکہ مذہب عقائد کا نام نہیں بلکہ عمل کا نام ہے جس کے ذریعہ سے قدرت خداوندی اور انسان کے درمیان قرب پیدا ہوتا ہے۔ عبادات، دعا اس کی بہترین صورتیں ہیں۔

تصور اجتہاد کے ذریعے سماجی ارتقاء

اسلام ایک مکمل معاشرتی نظام ہے اور اس نظام سے سب سے کم فائدہ اٹھانے والوں میں مسلمان قوم سب سے پیچھے نظر آتی ہے۔ اسلام ہر مثبت پہلو کو جو انسانیت نواز ہے تحسین کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا آخری پیغام انسانیت کی بالادستی اس کی آزادی اور مساوات ہے۔ اسلام ایک عالمگیر معاشرتی نظام کے تقاضے پورے کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اور دائمی اصولوں سے اسلامی تہذیب کے متغیر رو کو ہم آہنگ کا ایک ذریعہ اصول "اجتہاد" ہے۔

علامہ محمد اقبال اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ اجتہاد کا اصول ایک بین الاقوامی نصب العین کی طرف ہماری راہنمائی ہے۔ اور یہی اسلام کا اصلی منبع و مقصد ہے۔ لیکن اس اصول کو پس پشت ڈالا گیا۔ انہوں نے ترک قوم میں اجتہادی رویہ کو تحسین پیش کی۔ اور اس بات کو قابل تعریف سمجھا کہ آج کے مسلمان اقوام میں صرف ترکی وہ واحد ملک ہے جس نے عقیدہ پرستی کو توڑا خود آگہی کا سفر شروع کیا۔ تعلیمات نبوی سے ایک قوم تکمیل کا سفر طے کرتی ہے۔

نبی آخر الزماں ﷺ انسان کامل

اقبال نے انسان کامل کے نظریہ کو نظریہ ارتقاء پر فوقیت دی ہے اور وہ رسول اللہ کے کردار کو انسان کا بہترین اسوہ قرار دیے ہیں۔ پیغمبرانہ خصوصیت یہ ہے یا اس کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے۔ جب ایک واحدانی تجربہ متصوفانہ سفر طے کرتا ہے اور اسے مواقع کی تلاش میں رہتا ہے جس سے انسانی اجتماعی اور انفرادی زندگی کی تمام

---

1 *Muhammad Iqbal*, ***The Reconstrucjon of Religious thought in Islam***, *Page 82*

قوتوں کو از سرِ نو رہنمائی فراہم کر سکے جسے پیغمبرانہ شعور کا نام دیا جا سکے۔ تیار شدہ فیصلوں انفرادی فکر اور انتخاب رہ عمل کو میانہ روی کے ساتھ پیش کرنا ارتقائے انسانی کا یہ ابتدائی مرحلہ ہے۔ جس کے ذریعہ سے نفسانی توانائی راہ عمل کے ذرائع مہیا کرتی ہے۔

"رسول اللہ ﷺ جدید اور قدیم دنیا کے درمیان کھڑے ہیں۔ ان کے ذرائع کشف کا تعلق قدیم دنیا جبکہ ان کے کشف کی روح کا تعلق جدید دنیا سے ہے۔"[1]

رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس حیاتی علوم کے نئے ذرائع کا پتہ دیتی جو اسے نئی سمت کی طرف لے جاتے ہیں۔ اور اسلام میں نبوت تکمیل کو پہنچ جاتی ہے جو ایک استقرائی عمل ہے۔ یہی شعور موقوف ہونے کے ذرائع دریافت کر لیتا ہے۔ بادشاہت اور پروہت کارد قرآن حکیم نے بار بار عقل و خرد تجربات سے کام لینے اور اس کی ہدایت پر پیش کیا ہے۔

﴿اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴾[2]

(بلکہ دلوں پر ان کے تالے لگے ہوئے ہیں)۔

علامہ اقبال جدید دنیا میں رسول اللہ کی تعلیمات کو بہترین راہ عمل قرار دیتے ہیں۔ اور وحی رسول کو قدیم و جدید کا ایک امتزاج قرار رہتے ہیں۔

"The Prophet of Islam seems to stand between the aniciant and the modern world. In so for as the source of his revelation is concerned the belongs to the ancient world in so far the spirt of revelation. Is concerned he belongs the modern world.[3]"

عہدہ رسول کی ذات اقدس اسلامی فکر کے تمام پہلوؤں اور رجحانات جن کا تعلق عقلیت پسندی، متصوفانہ یا روایت پسندی سے ہو ایک ہی نقطہ کی طرف مائل کرتی ہے۔ اسلام نے یونانی علوم و فلسفہ کے جامد نظام کو رد کیا اور سے کائنات کے متحرک نظام کے خلاف سمجھا۔ اسی ضمن میں اجتہاد اسلامی کا قانونی پیش رفت کا متحرک اصول ہے۔ اسلامی تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ جتنی بھی خرابی ہوئی وہ ایک قانون کے غیر متحرک تصور کرنے سے ہوئی۔

حالات نے اس بات پر مہر ثبت کر دی کہ روایتی مسلم دنیات میں اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس قفل کو امام ابن تیمیہ اور ان کے حلقہ کے چند علماء نے پر زور مذمت سخت احتجاج کیا اور اجتہاد کا حق از سر نو قائم کیا۔ عصر اور تزکیہ کے اساسیت پسندوں نے اس کا حق پوری طرح ادا کیا۔ کیونکہ وہاں متحرک فکر کا تصور کئی مثالوں سے چلا آرہا

---

1 عزیز احمد، **برصغیر میں اسلامی جدیدیت**، ص219

2 محمد 24:47

3 *Muhammad Iabal* ***The Reconstrucjon of Religious thought in Islam***, *Page 120*

ہے۔اِس ضمن میں علامہ محمد اقبال نے ایک فیصلہ کن پیشن گوئی کی جو کہ برصغیر پاک وہند پر پوری طرح درست اترتی ہے۔ کہ ترکوں کی طرف ایک دن ہمیں بھی اسے ورثہ کی قدر و قیمت کو جانچنا پڑے گا۔

اور اگر عام اسلامی فکر میں کوئی نیا اضافہ ممکن نا ہو سکا تو ایک توانا قدامت پسند تحریک کے ذریعے اسلامی دنیا میں پھیلنے والی آزادانہ آزاد خیالی کی تحاریک جو کہ کافی متحرک ہیں ان کو روکا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اسلامی فقر کوئی نا قابل تغیر قانون نہیں۔ اجتہاد کے ذریعہ سے معاشرتی ضروریات کے پیش نظر اس میں بدلاؤ ممکن ہے۔ کیونکہ صوائے قرآن حکیم نے عباسیوں کے دور عروج سے کوئی تحریری قانوں موجود نہیں تھا۔

تیسری صدی کے شروع تک تقریباً انیس ایسے ادارے جنہیں دار الافتاء کا نام دیا جاسکتا ہے موجود تھے۔ جو فقہی نظریات سے نشوونما پانے والی تہذیب کی ضروریات کو پورا کرنے کا کام کرتے تھے۔ برصغیر میں اسلامی شریعتی اداروں میں ناکافی ضروریات ترسیل کا نہ ہونا اور اجتہاد کا جمود ایک مصنوعی حالت جسے دور بحال کیا جاسکتا ہے۔

قرآن کے ذریعے مسائل کا حل

قرآن حکیم کا مطالعہ اس طرح کیا جائے کہ عصری تقاضوں کے مطابق اس سے مسائل کا حل ڈھونڈا جائے اور حدیث رسول جسے دوسرا قانون و منابع تصور کیا گیا شریعت کے اس سرچشمہ کو بغیر سوچے سمجھے استعمال نہ کیا جائے۔ برصغیر میں اجماع کو اس کے کلاسیکی مفہوم میں قطعی طور پر مسترد کر دیا گیا تھا۔ علامہ اقبال نے اسے ایک نہایت اہم قانونی فکر قرار دیا ہے۔ اور اسے انقلابی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں۔ انقلابی معنوں میں اسے اجماع ہی تصور کیا جائے گا۔ جیسے ایک اسلامی پارلیمانی حکومتی نظام کے تحت متفقہ طور پر مان لیا گیا ہو۔ کیونکہ جدید دنیا کا دباؤ اجماع کی حیثیت کو کم کر رہا ہے۔ اس لیے ایسے لوگوں کو بھی ان معاملات میں شامل کرنا چاہئے۔ جو آئین و قانون کے معاملات میں دورس نگاہ رکھتے ہوں۔ علامہ محمد اقبال کے خیال میں ہی ایک چیز ہے جس کے ذریعے سے قدامت پسندی کے رجحانات کو کم کیا جاسکتا ہے۔ تاکہ درپیش آنے والے مسائل کا حل فکر و تدبر سے کیا جاسکے۔

اس ساری بحث سے یہ واضح ہوتا اسلامی فکر کی تشکیل نو کے مؤیدین میں اقبال ایک نمایاں مقام و مرتبہ کے حامل ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری خطابات کے ذریعہ سے مسلمانوں میں ایک ایسی خودی اور خودداری پیدا کرنے کی کوشش کی جس سے ان کی حیثیت دنیا کے سامنے واضح ہو سکے۔

اقبال نے معاشرتی سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت کی ان کی مسیحائی صرف مشرقی مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ تمام عالم کے لوگوں کے لیے ہے۔ انہوں اپنی تنقید سے پوری عالمی دنیا کو ایک نیا پیغام دینا چاہا۔ اور اسلام کو ایک مضبوط قوت اور عالمی آئیڈیالوجی کے طور پر پیش کیا۔ کیونکہ اخوت، مساوات اور حریت کے بل بوتے پر پوری دنیا کو متحد رہنے کی دعوت دی جاسکتی ہے۔ محمد اقبال دنیا کے واحد مفکر ہیں جو زمینی زندگی اور اس کے تمام پہلوؤں کو لافانی تسلیم کرتے ہیں۔ اور انسانی زندگی کو جاوداں قرار دیتے ہیں۔

سامراج کا زوال اور امت مسلمہ کی بیداری

انہوں مغربی سامراج پر تنقید طبقاتی شعور کو اجاگر کرنا اور سماجی انقلاب پر نمایاں اور سیر حاصل بحث کی ہے۔ انہوں نے اقوام عالم کو تغیر وارتقاء انقلاب، رجائیت، جدوجہد اور ایک نئ دنیا کی تسخیر کا پیغام دیا۔

جہانِ نَو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مُقامِروں نے بنا دیا ہے قِمار خانہ [1]

محمد اقبال نے اپنی زندگی اور اپنے علوم و فنون کو انسانی فلاح و بہبود اور مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کی تعمیر نو کے لیے استعمال کیا۔ معاشی مساوات، خوشحالی اور استحکام کی بات کی۔ کسی بھی قوم کی خوشحالی اور آرٹ یعنی علوم و فنون اس کے نفسانی کیفیات کا نقشہ ہوتے ہیں۔ اور سب سے بہتر اور اچھا آرٹسٹ وہ ہے جو اپنے فنون کو بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے وقف کر دے۔[2] اقبال نے اپنے فنون کو تنقید حیات اور تفسیر حیات کے طور پر استعمال کیا۔ اور ان کے الفاظ جلال و جمال اور نفی و اثبات ہے:

وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گُل
عدم، عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے [3]

انہوں نے مسلمانوں میں فکری نمو کے لیے بے عملی، فرایت، خوف مرگ کو مہلک قرار دیا۔ اور ایسی آزادی فکر کی شدید مخالفت کی اور اسے انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ کہا۔ انہوں نے اپنی شاعری میں بھی تبلیغ کی اور مسلمانوں کو خودی کی بیداری کی دعوت دی۔ ان کے الفاظ محض الفاظ نہیں۔ بلکہ زندگی کے مسائل کو اپنا موضوع بحث بنایا:

شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارث پیغمبری است [4]

انہوں نے امید و رجائیت اور بے باکی کے ساتھ برصغیر کی ملت اسلامیہ کی نمائندگی کی اور فکر اسلامی کی تشکیل نو کی ضرورت و اہمیت کو واضح کیا۔ اپنے انقلابی خیالات کا اظہار کر کے تشکیل جدید کی راہیں متعین کیں۔

علامہ اقبال کائنات اور زندگی کے تغیر و حرکت کے قائل اور حیات انسانی کے معاشی پہلوؤں، فکری پہلوؤں

---

1 محمد اقبال، علامہ، **بال جبریل**، (ایجوکیشنل بک ہاؤس: علی گڑھ)، ص99

2 شبیر احمد ڈار، **انوار اقبال**، (اقبال اکادمی: کراچی، 1966ء)، ص35

3 محمد اقبال، علامہ، **بانگ درا**، ص44

4 اقبال، علامہ، **جاوید نامہ**، (سنگ میل پبلیشرز، 1995ء)، ص39

اور سماجی پہلوؤں کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ وہ "انی جاعل فی الارض خلیفہ" کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے انسان کو اس کی قدر و منزلت سے آگاہ کرتے اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کی وجہ سے اللہ نے اسے خلیفہ اور نائب مقرر کیا ہے۔ اور علم کے باعث انسان کو فوقیت حاصل ہے۔ اہل ایمان اسی درجے پر فائز ہیں انہیں بے یقینی اور مردہ افکار سے نجات حاصل کر کے نئی دنیا آباد کرنی ہے اور نیا جہان بسانا ہے۔

فکر اقبال کی بدولت امت مسلمہ نے اپنی عظمت رفتہ کو دوبارہ حاصل کرنے کے خواب دیکھے۔ اسی کی برکت سے مسلمانوں میں امید و رجائیت پیدا ہوئی۔ وہی خواب تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کی بنیاد بنے۔ اور یہی فکر مسلم نشاۃ ثانیہ کی عالمی سطح پر نوید بن سکتی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں علامہ محمد اقبال ایک بہترین مفکر کے طور پر نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے تمام عالم انسان کی فلاح و بہبود کی بات کی اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

فروغ آدم خاکی ز تازہ کاری ھاست

مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازین کردند[1]

مولانا ابوالکلام آزاد (1888ء-1958ء) کی تحریک فکر

ابوالکلام آزاد مکہ معظمہ میں ہوا ہوئے۔ ان کا تاریخی نام فیروز تھا۔ اور اصل نام احمد تھا۔ ان کے والد مولوی خیر الدین قادری ایک صوفی آدمی تھے۔ برصغیر میں جن کے ہزاروں مریدین پائے جاتے ہیں۔[2] ابوالکلام، عربی، اردو اور فارسی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ مشاعروں میں غزلیں اور نظمیں پڑھنا شروع کیں تو آپ نے اپنا تخلص آزاد منتخب کیا۔ بمبئی جلسہ میں آپ کی ملاقات مولانا شبلی نعمانی سے ہوئی اور وہ ایسی تاریخی ملاقات ثابت ہوئی جس نے ان کی شخصیت مکمل تبدیل کر دی۔

معاشرتی معاملات میں آپ روایت پسند جبکہ علمی معاملات میں ابوالکلام آزاد یورپی سرگرمیوں کی دل سے قدر کرتے تھے۔ ابوالکلام آزاد کی صحافتی زندگی جوش اور ولولہ انگیزیوں سے بھرپور رہی۔ آپ برصغیر میں سرسید کے 16 رفیق رہنے کے بعد زبردست مخالف کے طور پر نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہندوستان میں آزاد متحدہ اور مخلوط قومیت کے طرف دار رہے۔ اور اس نظریہ کو انہوں نے مذہبی آفاقیت کا دوسرا جز قرار دے کر اسے پرانی بین اسلامیت کا نعم البدل قرار دیا۔[3]

---

1 محمد اقبال، علامہ، **زبور عجم**، (مکتبہ دانیال: لاہور) ص 110

2 ملیح آبادی، آزاد کی کہانی (دار المصنفین: اعظم گڑھ، 1978ء)، ص، 126

3 ملیح آبادی، آزاد کی کہانی، ص، 126

ابوالکلام اور مسلم تحریکات

ابوالکلام آزاد کے مذہبی تفکر کی بات کی جائے تو انہوں نے تین طرح کی اصلاحی تحریکات میں ایک امتیازی خط قائم کیا۔ پہلی قسم ان لوگوں کی جو مغرب زدہ جدیدیت کے حاملین کی تھی۔ اور مغربی چمک دمک سے متاثر نظر آتی تھی۔ دوسری قسم وہ جو سیاسی اصلاح چاہتی تھی اور کا اس کے مقاصد میں سیاسی دفاع اور آبادکاری شامل تھی۔ تیسری قسم میں اصلاح مذہب اور دین اسلام کی تعبیر نو کی تحریک۔

ابوالکلام آزاد نے ان تینوں تحریکوں کے مقاصد کو واضح کیا اور اپنے رسائل اخبار میں جس میں " الہلال" اور تذکرہ ترجمان القرآن اور یگر مضامین لکھے۔ آپ اپنے آپ کو تیسری تحریک میں شامل کرتے ہیں۔ ابوالکلام آزاد نے مذہب کی تاسیس اور تجدید میں فرق کی واضحت کی۔ وہ اس بات سے استدلال کرتے ہیں۔ کہ اسلام ایک مثالی مذہب ہے اور اس پر پورا یقین ہے کہ اسلام اپنی ذات میں جامع اور مکمل دین ہے۔ اجتہاد کی ضرورت اس کی اکملیت کو ابھارتی ہے نہ کہ اس میں کسی قسم کی تجدید اس لیے اسے تعمیر نو تو کہا جاسکتا ہے لیکن تجدید نہیں۔

قرآن کی روشنی میں فکری جدیدیت

اسلامی قانون کے حوالے سے ابوالکلام آزاد قرآن حکیم کو اسلامی شریعت کے اصلی ماخذ سمجھتے اور احادیث رسول کی باوقت ضرورت بطور استدلال پیش کرتے ہیں۔ اور اجتہاد کے قانونی تصور کی جگہ ابوالکلام آزاد مذہب کی تعمیر نو یا تاسیس کو جگہ دیتے ہیں۔ اور اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ نئے زمانہ میں جس چیز کی ضرورت ہے وہ کوئی آزاد یا نیا قانون شریعت نہیں بلکہ اسلام کی پوشیدہ بنیادی سچائی کیوں کہ اور صلاحیتوں کی تکمیل کرنے کا اہل ہونا ہے۔

ابوالکلام آزاد عوامی اجماع کے معاملہ میں غیر مصالحانہ رویہ اختیار کرتے نظر آتے ہیں جبکہ اور دیگر مذہبی اور سیاسی نکات پر ابوالکلام آزاد کے نظریہ سے دیگر علماء متفق نظر آتے ہیں۔[1] مولانا ابوالکلام آزاد کی ملاقات جب مولانا شبلی نعمانی سے ہوئی تو اس وقت مولانا شبلی سرسید احمد خان اور علی گڑھ کی آزاد جدیدیت اور آزادیوں سے دل برداشتہ ہو کر سید احمد خان کی تحریک سے الگ ہو چکے تھے۔ جس سے آزاد کی ذہنی نشو و نما اور علی گڑھ کی مخالفت کے رویے نے تقویت پکڑی۔[2]

ابوالکلام آزاد نے جدیدیت پسندی کی جگہ ایک روشن خیال اساسیت کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ اور رسالہ تہذیب الاخلاق کا جواب میں قرآن کے انسانیت کے نظریہ کی پیش کش روایت پسندی اور جدیدیت کے امتزاج کو

---

1 محمد میاں، علمائے حق، (دار المصنفین: اعظم گڑھ، 1967ء)، ص 191

2 حسین احمد، مولانا، متحدہ قومیت اور اسلام (ادارا طلوعِ اسلام: دہلی) ص 26

پیش کرنے کی محض نظریاتی بحث رہی۔ اور یہ عنصر بلاشبہ سر سید احمد خان کے اثر اور صحبت کے اثر کا اظہار ہی ہے۔ جس کی وہ شدید مخالفت کرتے رہے۔ ابو الکلام آزاد نے اس بات سے استدلال کیا کہ قرآن حکیم چار الہامی مقاصد رکھتا ہے:

"قرآن حکیم کا مقصد اللہ تعالی کی صفات کو مناسب انداز میں پیش کرنا۔ قرآن حکیم قانون فطرت علیت زندگی کے اصول وضوابط پر زور دیتا ہے۔ اچھی اور معیاری زندگی گزارنے کے معیارات متعین کرتا ہے۔ اور حیات بعد الموت کے اصول پر ایمان رکھتا ہے۔"[1]

ابو الکلام آزاد سر سید احمد خان کی طرح ہی تقلید سے انکار کرتے رہے اور قوانین فطرت کو ہی تمام بنیادی مسائل کا حل قرار دیتے ہیں۔ اللہ کا انسان اور انسان اور انسان کا اللّٰہ سے رشتہ اخلاق کے معیار اور اس کی سیاسی و مذہبی اقدار قرآن کے اندر تلاش کرتے ہیں اور اس ضمن میں بہت سارے مسلم مفکرین کے افکار کارد کرتے ہیں۔

مولانا ابو الکلام آزاد وحی کو اللہ اور انسان کے درمیان رابطہ تصور کرتے ہیں۔ وہ اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ:

"وحی انسان کو کوئی انوکھی چیز نہیں پہنچاتی بلکہ اس کی ذات اندر پوشیدہ صلاحیتوں اور علم یقین کی بنیاد کی ترجمان ہوتی ہے۔ انسان کا المیہ یہ ہے وہ کائنات کے مظاہر کو کھو دینے میں لگا رہتا اور اس کی جانب رجوع نہیں کرتا جو خلاق اعظم ہے کیونکہ اللہ نے اپنے تخلیق حسن پر نقاب ڈال رکھے ہیں۔"[2]

وحی تین صفات باری تعالیٰ کا اظہار انسانیت اور کائنات کی طرف کرتی ہے۔ اور وہ صفات رحمت، عدالت اور ربوبیت ہے۔ کیونکہ ہر ذی روح کو زندہ رہنے کے لئے ان تینوں کی ضرورت رہتی ہے ربوبیت جسے سر سید احمد خان قوانین فطرت کا نام دیتے ہیں جو انسانی ضروریات کو پورا کرتے ہیں اور مذہبی اصطلاح میں اسے عادات الٰہی کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی مخلوق کا اس کے ماحول سے مطابقت اور نشوونما "ہدایت" کے اصول سے تحفظ حاصل کرنا ہے۔ جو وحی کی صورت میں کسی پیغمبر کے اوپر اللہ کی طرف سے وارد ہوتی ہے۔[3]

اگر دیکھا جائے تو ابو الکلام کا نظریہ ہدایت اقبال کے نظریہ ارتقائیت اور سر سید احمد خان کے نظریہ قوانین فطرت سے کافی حد تک مطابقت رکھتا ہے۔ کیونکہ ابو الکلام آزاد بھی سر سید احمد خان کی طرح قرآن حکیم کے فکر و عقل پر متواتر زور دیتے ہیں۔ کیونکہ اگر عقل انسان کو جسمانی طور پر اس کے ماحول میں مضبوط ہونے کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ تو وحی اخلاقی اور روحانی ترقی کی طرف کو مشعل راہ مہیا کرتی ہے۔ کیونکہ کوئی واحد قوت اسی ضرور

---

1 آزاد، ابو الکلام، مولانا، **ترجمان القرآن**، ص45

2 آزاد، ابو الکلام، مولانا، **ترجمان القرآن**، ص57

3 پانی پتی، اسماعیل، شیخ، **مقالات سید**، ص، 177

موجود ہے جو اس سارے نظام کو چلا رہی ہے اور وہ خدا کی ذات ہے۔ ابوالکلام آزاد تاریخ کے ارتقاء اور موجودہ نظریات کی مدد سے اس طرح استدلال کرتے ہیں۔

"انسان کے حیوانی وجود نے مرتبہ انسانیت پر پہنچ کر نشو و نما اور ارتقائیت کی پچھلی منزلیں بہت پیچھے چھوڑ دی ہیں۔ اب وہ بلندی کے ارفع مقام پر پہنچ گیا ہے۔ جو اسے کرہ ارض میں تمام مخلوقات سے بلند اور ممتاز کرتا ہے۔ پھر وہ انسانی ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انسان عناصر کے درجے سے بلند ہو کر نباتاتی درجے میں آیا پھر حیوانی زندگی اور اس کے بعد وہ انسانیت کی شاخ پر بلند آشیانہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ اور ان لامحدود بلندیوں کا وارث بنانا۔"[1]

مذاہب کا تقابل اور مخلوط قومیت کا نظریہ

ابوالکلام آزاد نے جدید اسلامی برصغیر میں مذہب کے تقابلی مطالعہ کی طرف قدم اٹھایا اور دیگر مذاہب جن میں زرتشت، بدھ مت، ہندومت، عیسائیت اور یہودیت میں تصور الہ کا مطالعہ کیا۔ اُنہوں نے مذہب کے تقابلی مطالعہ میں ہندومت میں دلچسپی ظاہر کی۔ اور ان کی تحریروں میں ہندومت سے متعلق دلچسپی نظر آتی ہے۔ وہ ہندومت کو تعدد الہ کا توحیدی اور واحدانیت کا مذہب قرار دیتے ہیں۔ ابوالکلام آزاد سامی مذہب اور ہندومت کے درمیان ایک عقیدہ معاد کے تعلق کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہندومت کے دیوتا سامی مذہب کے فرشتوں کے ہم پلہ ہیں۔

"کیونکہ آریہ کا دیوتاؤں یا متعلق یہ عقیدہ رہا کہ یہ محض شخصیں ہیں۔ جن میں یہ قوت موجود ہوتی ہے کہ وہ کوئی بھی کام کر سکتے ہیں۔ تو اس تصور کی بنیاد پر فرشتوں کو اللہ کی بارگاہ میں درخواست گزار کا درجہ حاصل ہے کیونکہ دیگر مذاہب کے مقابلہ میں تصور الہ صرف پر اسلام میں پایا جاتا ہے۔"[2]

ابوالکلام آزاد تقابل مذاہب میں سر سید احمد خان کی کتب کا دائرہ زیادہ وسیع رکھتے ہیں۔ اگر ان کی تاویلی اور تفسیری انتخابیات کی تہہ میں اترا جائے تو اندازہ ہوتا ہے۔ وہ اسلام میں مضبوطی کے قائل نظر آتے ہیں۔ انہوں نے مذہب کی جس آفاقیت اور بلندی کی بات کی ہے اس کا رنگ صوفیانہ ہے۔ ان کا رجحان یہودیت اور عیسائیت کے لیے مناظرانہ جبکہ ہندومت سے رواداری کرتے ہیں۔

گاندھی سے متاثر ہونے سے پہلے وہ ہندوستان میں ایک ایسے معاشرہ کے قیام کے خواں ہاں تھے جو مخلوط قومیت رکھتا ہو۔ وہ ہندوستان میں آزاد مسلم حکومت کے خواہشمند تھے۔ اور ایک اسلامی معاشرہ کو ابوالکلام آزاد پانچ ستونوں پر قائم کرتے ہیں۔

---

1 آزاد، ابوالکلام، **غبار خاطر**، (دارالاشاعت: لاہور، 1968ء)، ص 48

2 آزاد، ابوالکلام، **ترجمان القرآن**، ص 158

"جماعت کا کسی ایک امام کی تابع داری اختیار کرنا اور اس کی دعوت پر لبیک کہنا۔ خلیفہ کی اطاعت داسلام کی جانب ہجرت اور جہاد کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔ ہندوستان کی اسلامی شاخ کا ایک امیر ہو۔"[1]

وہ اس بات کے قائل تھے کہ اسلام میں حکمرانی صرف اللہ اور رسول کی۔ خلیفہ ایک ہی ہو جس کی تابع داری تمام مسلمانوں پر عائد ہو۔ صراط مستقیم کی تعریف کرتے ہوئے آزاد نے خدائے واحد کے سامنے جھکنے اور کسی کی اطاعت قبول کرنے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے اللہ نے اس امت کو خیر الامم قرار دیا ہے۔ اس میں اخلاق، عزت نفس اور قومی راست بازی کا احساس پیدا کیا ہے۔

انہوں نے واضح کیا کہ یہ امت قوت توازن اور اعتدال کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مسلمان امن چاہتے ہیں۔ اور صرف مدافعت میں ہی ہتھیار اٹھاتے ہیں۔ اس لیے ہندوستان میں بد امنی اور انتشار سے پرہیز کرنا چاہیے۔

1916ء میں آزاد اپنے اس نظریہ سے منحرف ہوگئے۔ اور تحریک خلافت کی بجائے مسلم جمہور کو کانگریس کے اتحاد کی دعوت دی اور اس کے قریب تر ہونے کی کوشش کی۔ ابو الکلام آزاد کثیر المذاہب حیات باہمی کے خواہشمند تھے۔ اسی بات نے انہیں ہندوستان میں سیاسی نظریات قائم کرنے میں مدد دی۔ انہیں علماء کے اجماع کو اپنے خاص طرز میں ڈالنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ لیکن ہندوستان کی عام عوام نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ابوالکلام آزاد کو مسلم قانون کی اصلاح کے مسئلہ سے اس کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اجتہادی مسئلہ میں وہ متذبذب رہے۔

تحریک نظم جماعت اور اصلاح فکر

ابو الکلام آزاد کی " قیام نظم جماعت " کی دعوت پہلی اسلامی دعوت تھی جو حالات اور مصالحت وقت کی پوری بصیرت کے بعد مسلمانوں اور اسلام کے ملی وملکی و دینی مفاد کے تحفظ کے لیے برصغیر کے مسلمانوں کو دی گئی۔ جس میں مسلمانوں کے جماعتی مرض کی تشخیص کی گئی اور بہترین نسخہ شفا بھی تحریر کیا گیا۔ ابو الکلام آزاد نے مسلمانوں میں جن باتوں کا فقدان محسوس کیا کہ مسلمانوں میں کوئی رشتہ انسلاک موجود نہیں تھا۔ نہ ان کا کوئی قائد یا امیر نہ وحدت ملت کا کوئی رابطہ ہندوستان کے مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے اپنے کردار کو واضح کرنے میں ناکام تھے۔

ان کے خیال میں دس کروڑ مسلمان جو کرہ ارض میں سب سے بڑی جماعت اسلامی جماعت ہے ہندوستان میں ایسے زندگی بسر کر رہی نے نہ تو کوئی رشتہ انسلاک ہے اور نہ ہی وحدت ملت کا کوئی رابطہ ہے۔ نہ کوئی امیر نہ کوئی قائد محض ایک بھیڑ ہے ایک گلہ ہے جو برصغیر کی آبادیوں میں بکھرا ہوا ہے یقیناً ایک حیات غیر شرعی ہے ایک جاہلی روایت میں پوری قوم اقلیم مبتلا ہے۔ ایک جگہ وہ حقیقت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

---

1 آزاد، ابو الکلام، **خطابات**، ص207

"یہ ساری نامرادی اور مصیبت اس لئے ہے کہ ہندوستان میں مسمانوں کا کوئی جماعت نظام موجود نہیں ہے۔ جن کا انتظام شرعاً ان پر واجب تھا۔ کوئی صاحب امر و سلطان موجود نہیں جو ہدایت امت کے لئے کارفرما ہو اور چھ کروڑ انسان اس جماعتی اختلال و برہمی میں مبتلا ہیں اور جماعتی زندگی کی اس معصیت کی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام راستے بند ہو گئے ہیں۔ موجودہ حالات میں جس کی سے زیادہ ضرورت ہے۔ وہ پہلی چیز جماعت ہے چونکہ جماعت مفقود ہے اس لئے کوئی راہ نہیں کھلتی اور خود سرکردگان کار حیران ہو کر ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں کہ اب کیا کرنا ہے۔[1]"

ان سب حالات میں ابوالکلام آزاد نے جماعت کی کمی اور اس کی ضرورت کو محسوس کیا اور علمائے ہند کو اس کے قیام کی دعوت دی۔ نظم جماعت کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ برصغیر کے تمام مسلمان شریعہ کے نظام کے تحت ایک صاحب علم و عمل امیر قائد کی اطاعت پر مجتمع ہو جائیں۔ وہ ان کا امام ہوں اور جو تعلیم دی جائے اس کی پیروی کریں اور اس کی تعلیم کو صدق دل سے قبول کریں۔ اور قرآن و سنت کے ماتحت مصالح و مقاصد شریعت کے تحفظ کے لیے ان کے جو احکام ہوں اس پر تعمیل کریں، وہ لکھتے ہیں:

"کامل بارہ سالوں کے متصل غور فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بغیر اس کے کبھی عقدہ کامل نہیں ہو سکتا میرا اشارہ مسئلہ نظم جماعت اور قیام امارت شرعیہ کی جانب ہے۔ مسئلہ نظم جماعت سے مقصود یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اصلاح حال اور ادائے فرائض شرعیہ کی استطاعت کبھی ظہور پذیر نہیں ہو سکتی۔ جب تک وہ اپنی موجودہ حیات انفرادی کو ترک کر کے اجتماعی و شرعی اختیار نہ کرلیں۔ یعنی نظام شرع کے مطابق سب ایک امیر و قائد شرع کی اطاعت پر مجتمع ہو جائیں اور بکھرے ہوئے متفرق قومی مرکزوں کی جگہ ایک ہی مرکز قومی پیدا نہ ہو جائے یہی اصل اساس کار ہے اور تمام مقاصد اصلاح اور مصالح انقلاب کا نفاذ و ظہور اسی کے قیام ووجود پر موقوف ہے۔[2]"

مسئلہ تحریک نظم جماعت کئی پہلوؤں سے اہم ہے اور اس کی کئی اور حیثیتیں بھی رہی:

1۔ اسلامی شرعی حیثیت یعنی مسلمان خواہ کسی بھی ملک کے باشندے کے اور ان کے گرد نواح میں رہنے والے لوگ خواہ کتنے ہی مختلف ہوں۔ ان کی دستوری سیاسی حالت اور حیثیت خواہ کچھ بھی ہو۔ ان کے لیے نظم جماعت کی حیثیت

---

1 آزاد، ابوالکلام، **خطبات آزاد**، (ساھتیہ اکادمی: نئی دہلی، 1985ء)، ص166

2 آزاد، ابوالکلام، مولانا، **خطبہ صدارت تحریری، سالانہ اجلاس جمعیت علماء ہند** (رواج پرنٹنگ پریس: دہلی، 1985ء)، ص44

کیا ہے؟اس کے شرعی پہلو کیا ہیں؟

2۔اگر مسلمان اپنے آپ کو ایک مسلم وحدت کے طور پر زندہ رکھنا چاہتے ہیں اور اپنا اسلامی اور ملی وقار برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔تو اس کی اہمیت کیا ہے؟

3۔اگر مسلمان ایک متحدہ سیاسی قومیت کے عنصر کی حیثیت سے قومی و ملکی فرائض و حقوق کی منازل سے گزرنا، سیاسی زندگی کی جدوجہد میں حصہ لینا، معاشی اور اقتصادی دوڑ میں حصہ لینا چاہتے تو نظم جماعت کی اہمیت کیا ہے؟

4- نظم جماعت کے قیام سے عمل صالح کی ادائیگی، مسلم سیاست اور فرائض کی ادائیگی میں کس قدر مفید اور نفع آور ہو گا۔

یہ وہ تمام پہلو اور حیثیتیں تھیں جن کو مد نظر رکھ کر اس تحریک کا آغاز کیا گیا۔

مولانا ابو الکلام آزاد نے ہر پہلو سے تحریک کے مقاصد اور اہمیت کی وضاحت اور اصحاب اہل نظر کی، توجہ مبذول کروائی کہ نظم جماعت تمام اعمال کے اصل اور اساس کے لئے ہے۔اسلام اور اسلامی زندگی کی تمام برکات نظم جماعت سے وابستہ ہیں۔کیونکہ اسلام نے مسلمانوں کا تمام اعمال زندگی کے لیے بنیادی حقیقت یہ قرار دی ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن وسنہ میں جابجا اجتماع اور وحدت پر زور دیا گیا ہے۔

مسئلہ نظم جماعت اور جمعیت علمائے ہند

ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے نظم جماعت کی اہمیت یہ تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اصلاح حال اور فرائض شرعیہ کی ادائیگی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنی انفرادی اجتماعی زندگی کو ترک کر کے اجتماعی زندگی اختیار نہ کرلیں۔کیونکہ مولانا ابو الکلام آزاد کے نزدیک تمام اعمال اصلاحیہ اور تمام مصالح انقلاب کا نفاذ اسی کے قیام و وجود سے ہے۔اس کے بغیر احیاو تجدید ملت کی راہ پیدا نہیں ہو سکتی۔اور نہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ بر آں ہوسکتے ہیں۔

"مسلمانوں کے لیے راہ عمل ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اور ہمیشہ کی طرح اب بھی برصغیر کا مسلمان اپنی جتماعی زندگی کی معصیت سے بعض آ جائیں گے جس میں ایک عرصہ سے مبتلا ہیں۔ جس کی وجہ سے فلاح و کامیابی کے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں۔[1]"

یہ امر واضح ہو گیا کہ مولانا ابو الکلام آزاد مسلمانوں کے آزاد اور مستقل نظامی حیثیت کے خواہاں تھے۔ انہوں نے وقت کے اس اہم مسئلے کو مسلمانوں کے اصحاب نظر و تدبر اور حکومت کے ارباب حل و عقد، دونوں فریقین کے سامنے نہ صرف پیش کیا بلکہ اس کے حل کی طرف راہنمائی بھی فرمائی۔

1 آزاد، ابو الکلام، مولانا، **خطبات صدارت تحریری، سالانہ اجلاس جمعیت علماء ہند**، ص46

مارچ 1928ء میں جمعیت علمائے ہند کے سالانہ جلسے کے موقع پر انہوں نے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کے الجھاؤ، ملی زندگی کے انتشار، اور ان کی اقتصادی و تعلیمی مشکلات کو بیان کیا۔ نظم ملت کی ضرورت، منصب امامت کے خصائص اور شرائط امت پر روشنی ڈالی اور جمعیت علمائے ہند کو نظم ملت کے فریضے کی جانب توجہ دلائی۔

انہوں نے واضح کیا کہ ہندوستان میں اب اور آئندہ مسلمانوں کی دینی بقا کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک امارت شرعیہ کے ماتحت اپنے آپ کو منظم کریں۔ اس قسم کے نظم ملت کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی وحدت ملی نمایاں ہو، ان کے تمام مذہبی و ملی کام منظم ہوں، ان کی ضرورتیں پوری ہوں، ان کے بیرون و مداخل میں ایک نظم پیدا ہو، دارالافتاء، دارالقضاء اور بیت المال کا قیام ہو، ان کے غریبوں اور محتاجوں کی باقاعدہ امداد ہو، اور ان کی معاشرتی خرابیوں کی باقاعدہ اصلاح ہو۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے مطابق اسلامی معاشرہ پانچ ستونوں پر قائم ہے۔ ان میں جماعت کا امام ایک ہو یا خلیفہ کی تعیین، خلیفہ کی دعوت حق پر لبیک کہنا، ہجرت یعنی دارالاسلام کی طرف ہجرت اور نقل مکانی کرنا، جہاد کرنا جس کی کئی مختلف اشکال ہو سکتی ہیں، اور خلیفہ کی اطاعت و متابعت شامل ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد دراصل مذہب کی "تاسیس"، جسے وہ تعمیر نو تعبیر کرتے ہیں، اور "تجدید"، جس کے مبلغ سر سید احمد خان تھے، میں خط امتیاز قائم کرتے ہیں۔ وہ اسلام کے ایک مثالی مذہب ہونے پر یقین رکھتے تھے، اس لیے اس کی اکملیت اور جامعیت کو ابدی تسلیم کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اس اجتہاد کی ضرورت تھی جو اکملیت کو ابھارے، تعمیر نو کرے، نہ کہ تجدید۔

انہوں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی، وہ کافی حد تک ہندوانہ رسم و رواج کی بڑھوتری کا دور تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ذہنی اور فکری اعتبار سے اس سے مختلف تھے۔ ان کا ذہنی میلان بڑا تجدد پسند تھا۔ انہوں نے مذہبیات کا مطالعہ کیا اور حکیمانہ افکار کو بنظر غائر دیکھا۔ تذکرہ، الہلال، البلاغ، اور غبار خاطر، ان کے فلسفہ حیات کو پیش کرتے ہیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی (1903ء-1979ء) اور احیاء و اقامت دین کی تحریک

بیسویں صدی میں بر صغیر ہند میں احیائے فکر اور اسلامی احیا کی تحاریک ایک حقیقت ہے۔ جن شخصیات نے ان کی تحاریک کو ابھارنے اور ان کی ترقی وارتقاء میں اہم کردار ادا کیا ان کی حیثیت ایک کلیدی اور مرکزی اہمیت کی حامل ہے۔ اور ان شخصیات میں سید ابوالاعلیٰ مودودی ایک منفرد مقام پر نظر آتے ہیں۔

سید مودودی (1903ء) میں پیدا ہوئے۔ 1920 کے آغاز میں ہی اپنی صحافتی خدمات کا آغاز کیا۔ مفتی کفایت اللہ، صدر جمعیت علماء ہند نے نومبر 1921 میں ہفتہ وار رسالہ "مسلم" نکالا۔ پہلے وہ خود اس کے ایڈیٹر رہے، لیکن جلد ہی مودودی کو اس کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔

اس سے قبل مودودی کو رسالہ "تاج" میں بھی کام کا تجربہ تھا۔ ایچ۔بی۔خان نے اپنی کتاب "بر صغیر پاک و ہند کی جنگ آزادی میں علماء ہند کا سیاسی کردار" میں لکھا ہے [1] کہ ہفتہ وار "مسلم" زیادہ عرصہ نہ چل سکا اور 1923 میں بند ہو گیا۔ مودودی 1925 سے 1928 تک "الجمعیۃ" (جمعیت علمائے ہند کے ترجمان رسالے) کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے، جیسا کہ خود مودودی کی کتاب "تصور اور تعمیر سیرت" میں بھی اس کی تصدیق ملتی ہے۔ [2]

سید ابوالاعلی مودودی کی شخصیت اپنی سوچ، افکار اور عمل کے میدان میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ تدبر و اصلاح اور فکر و تحقیق کی صلاحیتیں ان کی شخصیت کو اجاگر کرتی ہیں۔ ان کے مذہبی تفکر کو دیکھا جائے تو وہ ایک جدت پسند معتدل فکر کی حامل شخصیت نظر آتے ہیں۔

فکر اسلامی کی تجدید میں سب سے توانا تحریک

سید مودودی کے علمی اور فکری کام چار اہم پہلوؤں پر مشتمل ہیں: درست تصور دین جسے انہوں نے بھرپور انداز میں اجاگر کیا، وہ طرز فکر اور تدبر فہم جس کے ذریعے یہ کام سرانجام دیا گیا، وہ حکمت عملی جس سے احیائے دین اور تبدیلی احوال کو اپنے حالات اور زمانے کی روشنی میں واضح کیا، اور ایک تنظیمی ڈھانچہ جس کے تحت انہوں نے اپنی جدوجہد کو جاری رکھا۔

فکری اعتبار سے سید مودودی کے کام پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان کے افکار و نظریات امام ابن تیمیہ، امام غزالی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی علمی روایت کا ہی ایک تسلسل ہے، جو کہ بیسویں صدی میں احیائے فکر کی ایک روشن مثال ہے۔ بیسویں صدی ایک فکری جمود، لبرل ازم اور مغربی استعماری قوتوں کے غلبے کی صدی رہی۔ ایسے ماحول میں سید مودودی نے اپنے کام کا آغاز کیا جس میں عام طور پر دو طرح کے رجحانات نظر آتے تھے۔ مذہبی طبقات پہلے رجحان میں فلاح کا راستہ دیکھ رہے تھے جبکہ جدیدیت پسند طبقہ دوسرے رجحان کو اپنی زندگی کا نصب العین تصور کر رہا تھا۔

ایسے حالات میں دعوت اور فکر و عمل کی ایک بہترین کوشش سید مودودی کی نظر آتی ہے۔ انہوں نے اس کام کے لیے روایت سے اجتناب کا راستہ نہیں اپنایا، بلکہ روایت کو عمل کا حصہ بنا کر پیش کیا۔ جدید نقطہ نظر اور افکار و نظریات سے پہلو تہی کی بجائے، انہوں نے جدید کو اپنی تہذیبی اقدار پر پرکھ کر قبول یا رد کے اصول کو اپنایا۔

سید مودودی ایک معتدل فکر کی حامل شخصیت کے طور پر نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے اپنی قابلیت کو علمی اور عملی میدان میں پیش کیا ان کی سوچ ایک تعمیری حیثیت کی حامل رہی۔ ان کی کتب مولانا کے افکار کا مجموعہ ہے

---

1 خان، ایچ۔بی۔ **بر صغیر پاک و ہند کی جنگ آزادی میں علماء ہند کا سیاسی کردار**۔ کراچی: نفیس اکیڈمی، 1986

2 مودودی، سید ابوالاعلی، **تصور اور تعمیر سیرت**، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، 1963ء

جس میں انہوں نے معاشی معاشرتی اور دینی مسائل کا حل اور اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا مکمل جواب دیا۔ ان کے ہاں تہذیبی اور فکری مسائل کے حل میں جو مرکزی حیثیت نظر آتی ہے وہ عقیدہ کی ہے۔ عصری اسلامی بیداری تحریک میں سید مودودی ایک کلیدی حیثیت کے حامل ہیں۔

سید مودودی کے افکار و نظریات صرف علمی نوعیت کے ہی نہیں بلکہ انہوں نے اسلام کو غالب اور نفاذ اسلام کے لئے عملی جدوجہد کا مظاہرہ کیا۔ اور ایک منظم اور غالب تحریک کا آغاز کیا۔ ان کا دائرہ بحث بہت وسیع ہے۔ اس میں تفسیر، سیرت نگاری، حدیث، شرح حدیث، علم الکلام، تصوف، تہذیب و تمدن کے اصول و مبادی جیسے بیشتر علوم آتے ہیں۔ انہوں نے قدیم طرز مباحث کے ساتھ جدید افکار و نظریات پر بحث کی۔ اور دلائل کی قوت اور عمدہ اسلوب تحریر و تقریر کو اپنایا۔ زمانہ کے پیش آمدہ میں جمہور امت کے نقطہ نظر کی ترجمانی کی اور بہت سارے مسائل میں ان کی انفرادی اجتہادی بصیرت نظر آتی ہے۔

قرآن کا تصور الٰہ اور تصور کائنات، بطور محرک عمل

سید مودودی اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ انسان کے لیے نجات کا واحد راستہ قرآن حکیم کا بتایا ہوا راستہ ہے اگرچہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ارفع و اعلیٰ قرار دیا ہے لیکن انسان کی زندگی مشکلات اور امتحانات سے بھری ہوئی ہے۔

> "اس سیارہ پر انسان کو اللہ کی نیابت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے انسان کو اس دنیا میں قیام کرنے اور اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا ذمہ سونپا گیا ہے اور اسے راہبانہ زندگی اختیار کر کے بچنے کی اجازت نہیں دی گئی اسے اپنے آپ کو وحی کے ابدی اور ناقابل تغیر قانون کے مطابق ڈالنا بہت ضروری ہے۔"[1]

چونکہ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابند ہیں اس لیے اسلام کا یہ تصور میں فطری ہے کہ انسان اللہ کی رضا اور نیابت الٰہی میں اپنی زندگی گزار دے۔ کیونکہ اسلام اس بات کے علاوہ کسی بات پر زور نہیں دیتا کہ سوائے اللہ سبحان و تعالیٰ کی پیروی کے، اور جب تک اسلام کے پیروکار اس پر کاربند رہے بلند اور عظمت والے مانے گئے اور جب روگردانی کی اس صف سے نکال دیئے گئے۔

سید مودودی یہ خیال رکھتے ہیں کہ معیشت مذہب، معاشرت اور سیاست ان سب کا تعلق تصور دیں سے ہے۔ وہ رسمی اور فرقہ وارنہ مذہب کی بجائے کا تصور انسان، تصور کائنات اور ایک کائناتی نظریہ حیات کے قائل تھے۔ اس لیے وہ اسلام کو ایک عالمگیر اور انسانی ضروریات پر ایک مکمل نظام حیات کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

سید مودودی اپنے افکار و نظریات میں ایک انفرادی حیثیت کے حاصل نظر آتے ہیں۔ قرآن حکیم نے اللہ

---

1 مودودی، سید ابواعلیٰ، مولانا، **اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی** (مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی: لاہور، 1955ء)، ص 33

اور معبود کا جو تصور پیش کیا عقیدہ کی تشریح اور اس سے ہم آہنگ تقاضوں کی تعلیم سید مودودی ایک بڑا فکری کارنامہ ہے۔

> "اللہ صرف پالنے والا ہی نہیں بلکہ مطاع، حاکم اور مصدریت کا سرچشمہ بھی ہے۔ اگر ایمان کے معنی اپنے پیدا کرنے والے کی پہچان کرنا ہے تو دوسری طرف اس سے عہد اطاعت باندھنا ہے اور پھر زندگی کے ہر شعبہ میں اسے راہنما اور اس سے رضا کا حصول اور اس کے ہر رنگ کو شعبہ زندگی میں لانا ہی اصل کامیابی و کامرانی ہے۔"[1]

یہ تصور الہامی ہدایت سے بے نیاز محض عقل، تاریخ اور تجربات کے سہارے زندگی گزارنے کے تمام طریقوں کو باطل قرار دیتا ہے۔ سید مودودی اس بات سے استدلال کرتے ہیں عبادت محض مخصوص اسلامی مظاہر کا نام نہیں ہے بلکہ ہر قوت کو اللہ کی بندگی میں دینے اور تمام زندگی اس کی ہدایت کے مطابق گزارنے کا نام ہے۔

اس تصور کی وضاحت کے بعد سید مودودی قرآن حکیم اور رسول اللہ کے طریقہ عمل سے اس بات کی وضاحت کرتے ہیں اسلامی تعلیمات زندگی کے ہر میدان میں کافی ہیں۔ اور پوری انسانی فکر اس مدار میں سفر کرتی ہے ۔ سید مودودی کی فکر کا مرکزی نقطہ نظر دیکھا جائے تو وہ صرف تصور توحید کے تمام پہلوؤں کی وضاحت ہی نہیں بلکہ اس تصور کی بنیاد پر زمانہ سازی کا عمل نظر آتا ہے۔

انہوں نے اپنی فکری استدلال کے لیے اسلام کے اولین دور کی صحت کی طرف اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔ کیونکہ اس دور کا نمایاں باب قوت اور جدوجہد کا اصل سرچشمہ قرآن حکیم اور اس کے احکام سے براہ راست راہنمائی جبکہ حدیث رسول اور طریقہ نبوی پر مضبوطی سے قائم رہنا تھا بڑھتی ہوئی آبادی اور اسلامی دنیا میں پیدا ہونے والے مسائل کے حل کے لیے فقہ اسلامی کی تدوین اجتہاد اور ان اجتہادی فیصلوں پر نقد وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ لیکن حالات کچھ اس قسم سے موافق ہو گئے ہیں کہ روایت اور فقہ کو اولیت حاصل ہے جبکہ قرآن وسنت سے استدلال سے دوری آگئی ہے۔ جن مصلحین نے روایت سے بغاورت کی بات کی در حقیقت وہ اسلام کی اصل روح اور اس کے متن سے نابلد رہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کی ضروری توضیح

سید مودودی جہاد کے متعلق خالص روایتی نقطہ نگاہ رکھتے ہیں "جہاد فی الاسلام" میں انہوں نے اس موضوع پر بہت منفر داندار میں لکھا۔ سید مودودی اس بات سے استدلال کرتے ہیں جہاد خالص اللہ کی راہ میں حق اور نیکی کے لیے ایک انتہائی کوشش اور جدوجہد کا نام ہے اور یہ کوشش متعدد شرائط کی حامل ہے۔ اسلام میں جہاد کا مطلب کسی

---

1 مودودی، سید ابو اعلیٰ، مولانا، **دینیات** (مکتبہ جماعت اسلامی: لاہور، 1951ء)، ص134

قسم کی ظالمانہ قتل وغارت نہیں بلکہ اس کا مقصد مظلوموں کا دفاع ہے۔

جہاد تعمیر وترقی اور انسانی حقوق کے تحفظ کی ایک اعلانیہ کوشش ہے۔ یہ افراد کی قانونی اور آئینی خلاف ورزی نہیں بلکہ ریاستی آئینی اقدام ہے۔ اس وعدہ خلافی کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے جہاد جنگ اور امن کا اسلامی قانون ہے۔ جس پر عمل کرنے کا اختیار صرف مسلمانوں کی حکومت کو حاصل ہے۔

> " اسلام میں بربریت اور جارحیت پسندانہ رویہ اختیار کرنے کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ دفاعی جنگ میں اسلام شہریوں کے جان ومال اور عزت وآبرو یہاں تک مرنے والوں کی لاشوں کی حفاظت وتحفظ کی ہدایات جاری کرتا ہے اور فتح کے متکبرانہ اظہار سے منع کرتا ہے۔ آج کی مہذب کہلانے والی قوتوں کے لیے اسلام کے یہ جنگی اصول ایک نمایاں سبق ہیں۔"[1]

سید مودودی اس بات سے استدلال کرتے نظر آتے ہیں جب انسان اپنی مرضی سے اللہ کے دین سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے تو اسے اپنے ارادے میں مظبوطی کا احساس ہوتا ہے اللہ کے قانون کی پابندی کے سبب وہ پوری کائنات سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ یہی وہ طریقہ اور راستہ جس کے ذریعہ اطمینان قلب اور اللہ سے محبت واطاعت کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔

سید مودودی نے اسلام اور جاہلیت کی تصویر کشی کے ذریعہ سے انسانی زندگی کے معاملات تک رسائی حاصل کی ہے۔ تاریخ دو ہی نقاط کی حامل رہی۔ ایک اسلام اور وسرا تصور جاہلیت یعنی ہر ایک شہ سے بے نیاز ہو کر حکم باری سے روگردانی ہے۔ لیکن اللہ نے اپنی نیابت کی ذمہ داری امت مسلمہ پر ڈالی ہے۔ اور اسے امر بالمعروف اور نہی عن کی ذمہ داری سونپی ہے۔ تزکیہ باالنفس سے لے کر جہاد وقتال تک سب راہ کے مراحل ہیں۔

احیائے امت کے لیئے موزوں قیادت کی تیاری

سید مودودی نے یہ واضح کیا کہ فقہ اور روایت سے تعلق اور راہنمائی کو منقطع کیے بغیر احیائے فکر اور احیائے اسلام کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ قرآن حکیم اور سنت نبوی سے رشتہ جوڑا جائے اور پیش آمدہ حالات میں را ہنمائی کے لیے وہی ترتیب قائم کی جائے جو دور اول کی رہی۔ یعنی قرآن حکیم سنت رسول اور جتہاد۔ آج کے ماحول میں اس مکمل علمی اثاثے کو سامنے رکھ کر جدید عصری مسائل کے ادراک کے ساتھ حقیقی غور وفکر اجتہاد واستنباط کے سلسلہ کو آگے بڑھانا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ اس عرف کو بھی مد نظر رکھا جائے جو اسلام سے متصادم نہیں ہے۔

سید مودودی نے حکمت عملی کو اختیار کیا اس کی ترتیب تحقیق اور تجزیہ اور تھی استنباط واطلاقی رہی جس سے

---

1 مودودی، سید ابو اعلیٰ، مولانا، **جہاد فی الاسلام** (دار المصنفین، علی گڑھ، 1976ء)، ص116-117

ان کے علم الکلام میں نئے دور کی ضرورتوں اوراس کے تقاضوں کو مد نظر رکھ کر اسلامی علوم کی تشکیل جدید نہیں انسانی فکر کی تشکیل نو کی طرف قدم بڑھایا گیا۔ کیونکہ انسانی فکر کی تشکیل نو سے ہی عصری چیلنجز کا جواب دینا ممکن ہے۔ کیونکہ انسانی فکر کی تبدیلی ہی پیش آنے والے مسائل میں کافرماہو کر اجتماعی مسائل کا حل پیش کرتی ہے۔

سید مودودی نے ہر سطح پر قیادت کی فکری نشوونما پر زور دیا تاکہ انسانی قیادت کو ایک صالح قیادت کی طرف منتقل کرکے انسانیت کی بقااور فلاح کے لئے کام کیا جاسکے۔ ایسی قیادت جو تفکر و تدبر کے ساتھ پاک وہند اور پورے عالم اسلام کی بیداری کا بیڑا اٹھائے اور دین کی روشنی میں نئے راستہ نکالنے کی کوشش کرے۔ فکر کی تشکیل نو کے ساتھ عمل کے میدان میں منفرد کارنامے سرانجام دے اور عملی جدوجہد میں ایک مثالی کردار ادا کرنے میں سرگرم ہوجائے۔

تجدید واحیائے دین کالائحہ عمل

اسلام ایک کامل دین اور مکمل دستور حیات ہے اسلام جہاں انفرادی زندگی میں فرد کی اصلاح پر زور دیتا ہے وہیں اجتماعی زندگی کے زرین اُصول وضع کرتا ہے جو زندگی کے تمام شعبوں میں انسانیت کی راہ نمائی کرتا ہے اسلام کا نظامِ سیاست وحکمرانی موجودہ جمہوری نظام سے مختلف اوراس کے نقائص ومفاسد سے بالکل یہ پاک ہے۔ اسلامی نظامِ حیات میں جہاں عبادت کی اہمیت ہے وہیں معاملات ومعاشرت اور اخلاقیات کو بھی اولین درجہ حاصل ہے۔ اسلام کا جس طرح اپنا نظامِ معیشت ہے اور اپنے اقتصادی اصول ہیں اسی طرح اسلام کا اپنا نظامِ سیاست وحکومت ہے اسلامی نظام میں ریاست اور دین مذہب اور سلطنت دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں، دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں دونوں ایک دوسرے کے مددگار ہیں، دونوں کے تقاضے ایک دوسرے سے پورے ہوتے ہیں، چنانچہ ماوردی کہتے ہیں کہ جب دین کمزور پڑتا ہے تو حکومت بھی کمزور پڑ جاتی ہے اور جب دین کی پشت پناہ حکومت ختم ہوتی ہے تو دین بھی کمزور پڑ جاتا ہے، اس کے نشانات مٹنے لگتے ہیں۔ اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں ریاست کی اہمیت کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا۔

"اسلام میں خدا کے سوا کسی انسان کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ قانون کا خالق بنے"۔[1]

انبیاء کرامؑ وقت کی اجتماعی قوت کو اسلام کے تابع کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ ان کی دعوت کا مرکزی تخیل ہی یہ تھا کہ اقتدار صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہوجائے اور شرک اپنی ہر جلی اور خفی شکل میں ختم کردیا جائے۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، اور نبی کریم ﷺ نے باقاعدہ اسلامی ریاست قائم بھی کی اور اسے معیاری شکل میں چلایا بھی۔

"اسلامی فکر میں دین اور سیاست کی دوری کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا اور کا اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ اپنی ریاست کو اسلامی اصولوں پر قائم کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ یہ جدوجہد ان کے دین وایمان کا تقاضا

---

1 مودودی، اسلامی ریاست فلسفہ نظام کار اور اصول حکمرانی، ص 15

ہے"۔1

قرآن پاک اور احادیث نبویہ میں جس طرح اخلاق اور حسنِ کردار کی تعلیمات موجود ہیں۔اسی طرح معاشرت، تمدن اور سیاست کے بارے میں واضح احکامات بھی موجود ہیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف "حکومتِ الٰہیہ" نہ صرف اسلامی نظامِ سیاست کی وضاحت کرتی ہے بلکہ امتِ مسلمہ کے لیے ایک واضح لائحہ عمل بھی پیش کرتی ہے۔ مولاناؒ کے مطابق امتِ مسلمہ کی اصل حیثیت "گواہِ حق" کی ہے، اور اس کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ زمین پر اللہ کی حاکمیت قائم کرے۔

توحیدِ حاکمیت کا اقرار اور اس کا نفاذ

مولانا کے نزدیک امت کی سب سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ دنیا میں اللہ کی حاکمیت کا اقرار کرے اور اپنی زندگی میں، بالخصوص اجتماعی زندگی میں، اس کا نفاذ کرے۔ امت کو چاہیے کہ وہ ہر اس نظام کو رد کرے جو انسانوں کو قانون سازی کا اختیار دیتا ہے، کیونکہ یہ حق صرف اللہ کو حاصل ہے:

"اسلام میں خدا کے سوا کسی انسان کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ قانون کا خالق بنے"۔[2]

امت پر لازم ہے کہ وہ طاغوتی نظاموں کے خلاف فکری، اخلاقی اور سیاسی جدوجہد کرے۔ مولانا کے مطابق صرف انفرادی عبادات کافی نہیں، بلکہ وہ اجتماعی نظام جو اللہ کی نافرمانی پر مبنی ہو، اسے بدلنا فرضِ عین ہے۔

"جو لوگ اللہ کی زمین پر اس کے قانون کے بجائے دوسروں کے قوانین نافذ کرتے ہیں، وہ درحقیقت طاغوت کے پیروکار ہیں"۔[3]

مولانا امت کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی اجتماعی جدوجہد کا رخ اسلامی ریاست کے قیام کی طرف موڑیں، جو اللہ کی شریعت کو نافذ کرے، عدل قائم کرے، اور انسانوں کو اللہ کے دین کی طرف بلاتے ہیں اسلامی ریاست کا قیام محض سیاسی عمل نہیں، بلکہ یہ ایمان کا تقاضا قرار دیتے ہیں۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ نہ صرف اللہ کے احکام پر خود عمل کرے بلکہ دنیا میں بھلائی کو فروغ دے اور برائی کا سدباب کرے۔ یہ فریضہ مولانا کے مطابق سیاسی، تعلیمی اور سماجی ہر سطح پر ہونا چاہیے۔

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾[4]

---

1 مودودی، تجدید احیائے دین، ص56

2 مودودی، حکومتِ الٰہیہ، ص15

3 مودودی، حکومتِ الٰہیہ، ص24

4 آل عمران 110:3

"تم بہترین امت ہو جو انسانوں کے فائدے کے لیے اٹھائی گئی، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو"۔

مولانا کے نزدیک امت اگر چاہتی ہے کہ وہ اللہ کی زمین پر اس کی حاکمیت قائم کرے تو اسے پہلے خود کو فکری، اخلاقی اور عملی اعتبار سے تیار کرنا ہو گا۔ وہ افراد تیار کرنے ہوں گے جو خوفِ خدا اور فہمِ دین کے ساتھ قیادت کا اہل ہوں۔ امت مسلمہ کو دین کو صرف ذاتی عبادات تک محدود نہیں رکھنا، بلکہ سیاست، معیشت، قانون، تعلیم ہر میدان میں اس کا نفاذ یقینی بنانا ہے۔ یہی دینِ اسلام کی جامعیت ہے۔

"حکومتِ الٰہیہ" مولانا مودودیؒ کی فکر کا وہ نچوڑ ہے جو امت مسلمہ کو اس کی اجتماعی دینی ذمہ داریوں کا شعور بخشتا ہے۔ اس کے مطابق امت کا مقصد صرف نجات پانا نہیں، بلکہ انسانیت کو اللہ کے عدل، ہدایت اور شریعت کی روشنی میں چلانا ہے۔ یہ صرف ممکن ہے جب امت مسلمہ علم، دعوت، قربانی اور منظم جدوجہد کے ذریعے دنیا میں اللہ کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرے۔

دین بطور سماجی نظام

مولانا مودودیؒ کے نزدیک دینِ اسلام محض چند اعتقادات، عبادات یا روحانی اعمال کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ ایک مکمل سماجی نظام ہے جو فرد، خاندان، معاشرہ، ریاست، معیشت، اور عدل کے ہر پہلو کو اپنے دائرہ کار میں لیتا ہے۔ ان کے مطابق "دین" کا حقیقی مطلب ہی زندگی کے ہر شعبے پر اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کرنا ہے۔ مولانا مودودیؒ کہتے ہیں کہ:

"اسلام ایک جامع دین ہے جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر پوری طرح حاوی ہونا چاہتا ہے"۔[1]

وہ دین کو ریاست، عدالت، تعلیم، ثقافت، معیشت، قانون، اخلاق اور سماجی تنظیم کے ساتھ لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں۔ اسلام کا سماجی نظام عدل و قسط پر مبنی ہے۔ معاشرے کے ہر فرد کو بنیادی حقوق، معاشی تحفظ اور مساوی انسانی حیثیت حاصل ہے۔ وہ طبقاتی تقسیم، جاگیرداری، سرمایہ دارانہ استحصال اور نسلی امتیاز کو اسلام کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ اسلام انسانوں کے درمیان تفریق نہیں کرتا، بلکہ ان سب کو ایک خدا کے بندے اور ایک قانون کے تابع بناتا ہے۔

ثقافت اور تہذیب

دین کو تہذیب و ثقافت کا خالق سمجھتے ہیں۔ ان کے مطابق لباس، فنون، تعلیم، تفریح اور ادب سب کو اسلامی اخلاقی اصولوں کے تحت ہونا چاہیے۔ مغربی ثقافت کی بے راہ روی اور سیکولر بنیادوں پر وہ سخت تنقید کرتے

---

1 مودودی، حکومتِ الٰہیہ، ص10

ہیں۔

"اسلام نہ صرف فرد کی زندگی کو سنوارتا ہے بلکہ ایک صالح معاشرہ، عادلانہ ریاست اور خدائی قانون پر مبنی تمدن کی تشکیل کرتا ہے۔"[1]

مولانا مودودیؒ کے نظریے کے مطابق اسلام ایک مکمل سماجی نظام ہے جو زندگی کے ہر پہلو کو منظم کرتا ہے۔ اس نظام کا مقصد ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا ہے جس میں عدل، امن، مساوات، اخلاق، ایمان اور فطرت کا توازن قائم ہو۔ وہ دین کو محض روحانی تسکین نہیں، بلکہ ایک عملی، انقلابی اور جامع ضابطۂ حیات قرار دیتے ہیں۔

مولانا نے اسلام کا جامع اور حرکی تصوّر پیش کیا۔ ان کے نزدیک اسلام دیگر مذاہب کی طرح محض ایک مذہب نہیں، جو صرف پوجاپاٹ کے چند طریقوں اور چند رسوم وروایات کے مجموعے کا نام ہو اور اس کے علاوہ زندگی کے دیگر میدانوں میں اس سے کوئی رہ نمائی نہ ملتی ہو، بلکہ وہ ایک دین ہے، جو زندگی کے تمام پہلوؤں میں انسانوں کو رہ نمائی فراہم کرتا ہے۔ ان کی انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی، خاندانی و معاشرتی زندگی ہو یا سماجی، معاشی زندگی ہو یا سیاسی، وہ مسجد میں ہوں یا بازار میں، گھر میں ہوں یا اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں، وہ ہر جگہ اور ہر معاملے میں انھیں اللہ کے قانون کے تابع کرتا اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کی تاکید کرتا ہے۔

"اسلام کا جامع تصور خود مسلم عوام کے ذہنوں سے اوجھل تھا۔ وہ بس نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کو مکمل دین سمجھ بیٹھے تھے۔ مولانا نے زور دے کر یہ بات کہی کہ ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی میں اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے حکموں پر چلے۔ محض مسلمانوں جیسا نام رکھ لینا، یا چند رسوم وروایات پر عمل کرنا کافی نہیں ہے"۔[2]

مولانا نے اپنی کتابوں 'دینیات' اور 'خطبات' میں یہ بات بہت آسان، عام فہم اور موثر اسلوب میں کہی ہے۔ مولانا نے اجتماعیت کے تصوّر کو بہت ابھار کر پیش کیا۔ اس زمانے میں اللہ اور بندے کے تعلق پر بہت زور دیا جاتا تھا اور اسی کو اصل دین سمجھا جاتا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ جہاں دین میں فرد کا ذاتی ارتقا مطلوب ہے وہیں دینی بنیادوں پر معاشرے کی تشکیل بھی ضروری ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ مولانا اس معاملے میں اُس زمانے میں رائج بعض نظاموں اور ازموں سے متاثر اور مرعوب تھے، جس کی وجہ سے انھوں نے اسلام کو 'نظام' کی حیثیت سے پیش کیا۔ حالاں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اُس زمانے میں اسلام کا اجتماعی پہلو دبا ہوا تھا، اس لیے مولانا نے اس پر زور دیا اور اسے نمایاں کر کے پیش کیا۔

مولانا نے پوری قوت کے ساتھ یہ بات کہی کہ اسلام میدانِ سیاست میں بھی انسانوں کی مکمل رہ نمائی کرتا

---

1 مودودی، حکومتِ الٰہیہ، ص 44

2 مودودی، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ص 175

ہے۔اس کائنات کو اللہ تعالیٰ نے وجود بخشا ہے اور اس میں انسانوں کی ضروریات کی تمام چیزیں فراہم کی ہیں۔کائنات کی تمام مخلوقات اللہ کے حکموں کی پابند ہیں۔وہ ان سے سرِ مو انحراف نہیں کر سکتیں۔انسانوں کو محدود دائرے میں ارادہ واختیار کی جو آزادی دی گئی ہے اس میں ان کا امتحان ہے۔

"اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ اپنے اختیار کو استعمال کر کے اس کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلتے ہیں یا اپنی خواہشات کے پیچھے بھاگتے ہیں۔تکوینی حاکمیتِ الٰہ کے ساتھ تشریعی حاکمیتِ الٰہ کا تصوّر پیش کیا"۔[1]

بعض حضرات نے اسے 'دین کی سیاسی تعبیر' کا نام دیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ مولانا کا پیش کردہ 'سیاسی اسلام' کا تصوّر درست نہیں ہے۔حالاں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔اس زمانے میں مذہب اور سیاست کے درمیان علیٰحدگی کا تصوّر عام تھا۔مولانا نے یہ فکر پیش کی کہ میدانِ سیاست کو اسلام سے خارج سمجھنا درست نہیں ہے۔اسلام نے جہاں زندگی کے تمام میدانوں میں رہ نمائی کی ہے وہاں سیاست کا میدان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

"مسلم عوام کو قرآن مجید سے جوڑا۔اس زمانے میں یہ تصور عام تھا کہ قرآن کا سمجھنا عام لوگوں کے بس کی بات نہیں۔اس کے لیے بہت سے علوم میں درک و مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔یہ کام صرف خواص اور علما کا ہے۔عوام کا کام ان کی بات ماننا اور ان کے پیچھے چلنا ہے"۔[2]

مولانا نے یہ فکر پیش کی کہ قرآن اس لیے نہیں نازل کیا گیا ہے کہ اسے بے سمجھے بوجھے پڑھ لیا جائے، مکان یا دوکان کے افتتاح یا کسی کی وفات کے موقع پر قرآن خوانی کروالی جائے، بلکہ وہ کتابِ ہدایت ہے۔اس میں زندگی گزارنے کا طریقہ بتایا گیا ہے، اس لیے ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ اسے سمجھنے کی کوشش کرے۔انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا، اس پر حواشی لکھے، اس کی تفسیر کی اور درسِ قرآن کی مجلسیں قائم کیں۔ان کوششوں کے نتیجے میں عوام کا ربط قرآن سے مضبوط ہوا۔

مولانا نے اپنی مؤثر تحریروں کے ذریعے اسلام پر کیے جانے والے اعتراضات کا بھرپور جواب دیا۔الجہاد فی الاسلام، مرتد کی سزا اسلامی قانون میں، پردہ وغیرہ اس کا بیّن ثبوت پیش کرتی ہیں۔مولانا کے اسلوب کی خاص بات یہ ہے کہ وہ مدافعانہ اور معذرت خواہانہ لب و لہجہ سے پاک ہے۔وہ اعتراض کرنے والوں پر اقدامی حملہ کرتے ہیں، ان کی خامیاں اور کم زوریاں نمایاں کرتے ہیں اور پورے اعتماد کے ساتھ اسلامی تعلیمات کی

تشریح و توضیح کرتے ہیں۔ان کی تحریریں اعتراضات کا مُسکت جواب فراہم کرتی ہیں اور اسلامی تعلیمات کی معقولیت کو دلائل سے ثابت کرتی ہیں۔

مولانا نے بہت سے فتنوں کا بر وقت تدارک کیا اور پوری قوت کے ساتھ ان کی سرکوبی کی۔اُس زمانے میں

---

1 مودودی، ابوالاعلی، سید، **مسئلہ قومیت**، (مکتبہ اسلامی پبلیشرز، نئی دہلی)، 1977ء، ص92

2 مودودی، ابوالاعلی، سید، **قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں**، اقبال اکیڈمی، کراچی، 1944ء، ص77

منکرینِ حدیث، جو اہلِ قرآن کے نام سے مشہور تھے، ان کا فتنہ سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ انکارِ حدیث کے پردے میں وہ بہت سے مسلّماتِ دین کا انکار کر رہے تھے۔ مولانا نے ان سے مباحثہ کیا، ان کے شبہات زائل کیے اور ان کے اعتراضات کے تاروپود بکھیر کر رکھ دیے۔ ان کی تصنیف 'سنّت کی آئینی حیثیت' اسی مباحثہ و مجادلہ کی روداد پر مشتمل ہے۔ اسی طرح قادیانیت کا فتنہ بھی اس زمانے میں زوروں پر تھا۔ مولانا نے اس کے خلاف محاذ سنبھالا۔ عملی طور پر بھی جدّوجہد کی اور علمی طور پر بھی اس کے خلاف مؤثر و مدلّل لٹریچر فراہم کیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کی تصنیف 'قادیانی مسئلہ' کو بنیاد بنا کر ان کے بدخواہوں نے انھیں تختۂ دار تک پہنچانے کی کوشش کی گئی، لیکن مشیّتِ الٰہی سے وہ اپنے ارادوں میں ناکام رہے۔

اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں

سید مودودی نے علماء کے مخلوط قومیت کے نظریہ کو رد کیا۔ کیونکہ سید مودودی اس بات استدلال کرتے ہیں کہ ان کی قومیت کا ادارہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو لیکن چونکہ ہندوستان میں ہندومت کا ثقافتی اور مذہبی موجود ہے جس سے اسلامی معاشرہ کو تہذیبی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا انہوں اس بات کو محسوس کیا ہندوستان میں اسلام کو تہذیبی خطرات لاحق ہیں جو علمائے دیوبند کے مخلوط قومیت کے اتحاد کے نظریہ سے پیدا ہو گئے ہیں۔

سید مودودی دار السلام کی الگ تعریف بیان کرتے ہیں۔ جو بہت مختلف ہے۔ ان کے نزدیک مسلمان کے لیے اپنا ایک ملک اور الگ مسلمان ریاست کا تصور بالکل ایک مختلف چیز ہے۔ سید مودودی مسلمانوں کی خود مختاری یا سیاسی آزادی کے خواہاں نہیں بلکہ وہ اسلام حکومت اور معاشی، سماجی اور تہذیبی پہلوؤں سے اسلامی حکومت کے قائل رہے۔ جو خالص اساسی اور کتاب اللہ اور سنت نبوی کے مطابق ہو وہ اس بات سے استدلال کرتے ہیں۔

> "مسلمان ایک قومی وحدت نہیں بلکہ ایک جماعت ہیں۔ وہ کسی ایک جماعت کی سیاسی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی مصالحت کا قائل ہے۔ اسلام مسائل کو عالمی پس منظر میں دیکھتا۔ نہ کہ قوم، طبقات یا افراد کی نجی اصطلاحوں کے طور پر اس کے مقاصد دائمی ہیں۔ اسلام کسی خاص قوم کے کا عطا کردہ روایتی اور ثقافتی معطیہ کا پابند نہیں۔ اور وہ قومی اور تاریخی ڈھانچہ کا منکر ہے۔"[1]

مولانا مودودی اسلامی انقلاب کی بات کرتے ہیں۔ اور اسے ایمان کی ایک شق قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تمام مسلمان دنیا کے لوگ بے شک الگ ثقافتی پہچان رکھتے لیکن ان کے اہداف و مقاصد اور حقیقی پہچان صرف دین اسلام کے نام سے ہے۔ ان کی عبادت کے طور طریقے اور معاملات زندگی میں یکسانیت بالکل نمایاں ہے۔

سید مودودی ایسے پاکستان کے خواہاں تھے جہاں زندگی کے ہر شعبہ میں اسلامی اقدار نمائندگی ہو اس سلسلہ

---

1 مودودی، سید ابو اعلیٰ، مولانا، مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش (ادارہ ترجمان القرآن: پٹھان کوٹ، 1956ء)، ص 135

میں انہوں نے دستور و قوانین کے لئے اصول تدریجیت کی تائید کی۔ سید مودودی چاہتے تھے کہ انگریزوں کے بنائے آہنی ڈھانچہ کو بالکل مسمار کر دیا جائے اور اس کی جگہ مکمل نیا اسلامی نظام ترتیب دیا جائے۔ اور موجودہ لادینی نظام تعلیم اور دیگر شعبہ جات میں ایک فکری نظام متعارف کروایا جائے۔

اسلامی قوانین شریعہ کو بحال کیا جائے باقی دیگر قوانین منسوخ کر دیئے جائیں۔ فقہ کے برعکس اگر اسلام کا سیاسی خلیفہ نظر رکھا جائے تو یہ وضاحت ہوتی ہے کہ نہ تو اسے کسی تبدل کی ضرورت ہے اور نہ ہی ارتقاء کی کیونکہ مغربی جمہوریت میں جہاں آقا اور غلام کا اطلاق سماجی اور سیاسی حوالہ سے نہیں ہوتا۔ اسلام اس کے مقابلہ میں آقا و غلام کا جو تصور پیش کرتا ہے وہ انسان اور خدا کے مابین رستہ ہے۔

سید مودودی اسلامی سیاست کے تصور کو ایک دینی ریاست تصور کرتے ہیں۔ جس میں انسان اللہ کا نائب اور خلیفہ کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ اسی تصور کے تحت وہ دینی جمہوریت کی اصطلاح کو متعارف کراتے ہیں۔ جس میں وہ اداروں کو اللہ اور سنت نبوی کے مطابق احکام کی بجا آوری کی بات کرتے ہیں۔

> "دینی جمہوریت جس کے قائدین اور نمائندوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ شریعت کے تمام احکام کو قبول کریں اور ان اصول وضوابط کو مٹانے میں کسی قسم کی پس و پیش کا مظاہرہ نہ کریں۔ یہ احکامات بینکوں بیمہ کے اداروں اور دیگر معاملات زندگی کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ دینی جمہوریت کا دائرہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر پھیلا ہوا ہے۔ تاکہ پورا انسانی نظام اللہ کے احکام کی تابعداری میں نمایاں کام سرانجام دے سکے۔"[1]

اِس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سید مودودی اسلامی ریاست کو ایک مثالی ریاست گردانتے ہیں۔ اور ایک مثالی ریاست دو گروہوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایک گروہ مسلمان جبکہ دوسرا گروہ غیر مسلم اور مثالی ریاست اپنے شہریوں کے جان و مال کی عزت کی محافظ ہوتی ہے۔ اِس کے لئے سید مودودی تاریخ اسلام سے نظائر پیش کرتے ہیں اور غیر مسلم کے لیے مکمل مساوات کے قانون کی پاسداری کی جائے۔ آزادی اظہارِ رائے کی مکمل آزادی رکھیں گے اور ملکی نظام تعلیم کے پابند رہیں گے گئے۔ جبکہ وہ اپنے مدارس اور جامعات میں اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے آزاد ہوں گے۔ اسلام ایک فطری مذہب ہے۔ اور تمام انسانوں کے حقوق کی ضمانت دیتا ہے۔

مولانا وحید الدین خان (1925ء–2024ء) کی دعوت فکر

مولانا وحید الدین خان یکم جنوری 1925ء میں اعظم گڑھ (یوپی) کے ایک دور افتادہ گاؤں میں پیدا ہوئے۔ جب ان کی عمر چار سال تھی تو والد انتقال کر گئے، ان کی پیدائش چونکہ ایک گاؤں میں ہوئی تھی اس لئے شخصیت اور نظریہ میں بھی وہی فطری رنگ نظر آتا ہے جو ایک گاؤں کی زندگی میں ہوتا ہے جس کا اظہار وہ خود ان الفاظ میں

1 مودودی، سید ابو اعلیٰ، مولانا، **خلافت و ملوکیت** (اسلامیک پبلیکیشنز: لاہور، 1966ء)، ص 351

کرتے ہیں۔[1]

ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں کے ایک مدرسہ میں حاصل کی۔ مولانا نے انگریزی کی بجائے اپنی ابتدائی تعلیم مدرسے میں قرآن مجید اور اردو کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی زبان بھی سیکھی۔ مولانا چونکہ بچپن سے ہی باپ کے سائے سے محروم ہو گئے تھے۔ اس لئے ان کی کفالت ان کے چچا صوفی عبد المجید خان (وفات 1947ء) نے کی۔ انہی کے اصرار پر 1938ء میں انہیں عربی کی مشہور درس گاہ مدرسہ الاصلاح سرائے میر) میں داخل کرادیا گیا۔ مولانا نے یہاں مدرسہ کی تعلیم مکمل کی۔

دینی فکر و عملی خدمات

مولانا نے 1950ء میں پچیس سال کی عمر میں۔من انصاری الی اللہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، پھر اسی مقصد کے لیے ادارہ اشاعت اسلام کے نام سے اپنے دعوتی سفر کو جاری رکھا۔ مولانا صاحب سب سے پہلے جس تحریک سے متاثر ہوئے وہ جماعت اسلامی تھی۔ یہاں مولانا کی زندگی کا ایک الگ ہی رنگ تھا۔ بالکل سادہ منش آدمی کے طور پر اپنی اس زندگی کا آغاز کیا۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا نظر آتا ہے۔[2]

یہ وہ دور ہے جب مولانا وحید الدین خان صاحب جماعت اسلامی ہند کے ایک ذمہ دار کی حیثیت سے شعبہ نشر اشاعت کے انچارج ہیں۔ سادگی کے پیکر، صوفی منش، اقامت دین کی عظیم ذمہ داریوں کا احساس اس قدر غالب ہے کہ تن بدن کا ہوش نہیں۔۔۔ تاہم دین کی تعبیر میں اختلاف رائے کی بنیاد پر سید ابوالاعلیٰ مودودی کی سیاسی تحریک جماعت اسلامی سے الگ ہو گئے، کچھ عرصہ تبلیغی جماعت سے وابستہ رہے،، ندوۃ العلماء اور جمعیت علماء ہند سے بھی وابستہ رہے، ان تمام تنظیموں سے وابستگی اور پھر علیحدگی بھی ہو گئی۔[3]

مولانا وحید الدین خان کی علمی و عملی زندگی دو ادوار میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ پہلا حصہ 1976ء سے پہلے، دوسرا حصہ 1976ء سے بعد۔ عربی زبان تو مولانا نے بچپن ہی سے پڑھنا شروع کر دی تھی اور بعد میں مدرستہ الاصلاح میں پڑھنے کی وجہ سے ان کے اندر جو مذہبی رجحان تھا اس کو اور تقویت ملی۔ الجمعیۃ میں ایڈیٹر کی حیثیت سے 1967ء سے 1974ء تک کام بھی کرتے رہے۔

1963ء میں مولانا نے دوبارہ نئے سرے سے دین کا مطالعہ از سر نو کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسلام کی اساسات کو

---

1 **ماہنامہ تذکیر** (مرتب احسن تہامی)، (دار التذکیر، غزنی سٹریٹ لاہور، شمارہ 2، فروری 2006ء)، ج 19، ص 2-3

2 ماہنامہ تذکیر، ج 19، ص 3، شمارہ 2، (فروری 2006ء)

3 ماہنامہ تذکیر، ج 19، ص 3، شمارہ 2، (فروری 2006ء)

جاننے کے لیے اس کے اصل مصادر و مراجع کی طرف رخ کیا۔ مولانا مختلف اخبارات و جرائد میں لکھتے رہے۔ ان میں سے بیشتر مضامین اسلام اور عصر حاضر کے عنوان کے متعلق ہوتے تھے۔ اس کے بعد اس موضوع پر ان کی پہلی مفصل کتاب، **علم جدید کا چیلنج** 1966ء میں شائع ہوئی اور اسلام کے مفصل مطالعے کے بعد جو کتاب ان کی طرف سے منظر عام پر آئی وہ 1975ء میں چھپنے والی کتاب، **اسلام**، تھی۔

اکتوبر 1976ء میں، الرسالہ کا پہلا پرچہ جاری ہوا مگر بہت جلد ہی ایک مشن کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس کے ذریعے مولانا نے مغربی دنیا تک اسلام کو جدید انداز میں پھیلانا شروع کیا اور یہ کام آج تک جاری و ساری ہے۔ الرسالہ، ہی کی بدولت مغربی دنیا کے اندر مولانا کی فکر پہنچی، پھر ان کے نقطہ نظر کو جاننے کے لیے مختلف ممالک سے دعوت نامے آنے شروع ہو گئے۔ مختلف کانفرنسوں میں انہیں بلایا جانے لگا۔ بلایا تو پہلے بھی جاتا تھا مگر صرف ملکی سطح پر ہونے والی کانفرنسوں میں مگر اس اشاعت کے بعد پوری دنیا میں ان کو پذیرائی ملی۔

1976ء میں مسلم، کرسچن ڈائیلاگ میں شرکت کی جو لیبیا کی دارالحکومت طرابلس میں ہوا تھا۔ اس میں مسلمانوں کی طرف سے جامعہ الازہر (قاہرہ) کے نمائندہ نے شرکت کی اور ویٹیکن (روم) نے مسیحیت کی طرف سے نمائندگی کی۔

اب تک مولانا کی دو سو سے زیادہ کتب چھپ چکی ہیں۔ جن کے انگریزی، عربی اور کئی علاقائی زبانوں میں تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ چند ایک اہم جو ان کی احیائی فکر کی نمائندگی کرتی ہیں، کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے:

1۔ **تذکیر القرآن**؛ دعوتی انداز میں لکھی گئی تفسیر، دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ تمام نحوی، صرفی، فقہی، ادبی اور صوفی انداز سے ہٹ کر لکھی گئی اپنی نوعیت کی واحد تفسیر ہے۔

2۔ **ماہنامہ الرسالہ**؛ جو 1976ء سے تاحال ایک ماہ وار شمارہ جاری ہے۔ مولانا صاحب کی تحریریں، زیادہ تر موضوع قرآن پر مشتمل ہوتے ہیں۔

3۔ **علم جدید کا چیلنج**؛ جس میں سائنسی الحاد کے جوابات، قرآنی اور عقلی دلائل کے ذریعے دیئے گئے ہیں۔ یہ شاید اس موضوع پر اپنی طرز کی پہلی اردو کتاب ہے۔

4۔ **الاسلام**؛ دین کی تعبیر و تشریح کے اعتبار سے مولانا کی سب سے پہلی مفصل کتاب ہے جو 1975ء میں شائع ہوئی۔

5۔ **مذہب اور سائنس**؛ مذہب اور سائنس کے موازنے کے بارے میں یہ بہت اچھی کتاب ہے۔ وہ تصورات جو قرآن نے آج سے چودہ سو سال پہلے دیئے تھے ان کی تصدیق سائنس نے آج کی ہے۔

6۔ **تعبیر کی غلطی**؛ اس کتاب میں مولانا نے دین کی تعبیر کے حوالے سے ان غلطیوں کی نشاندہی کی ہے جو ان کی نظر میں دوسرے علماء (خصوصاً سید ابو الاعلی مودودی (1903ء-1979ء) سے دین کی تعبیر میں ہوئیں۔

7۔ **پیغمبر انقلاب**؛ سیرت النبی ﷺ پر لکھی جانے والی کتاب جس کو ایوارڈ بھی ملا۔ اس میں مسلمانوں کو ہدایت ہے وہ

اپنے آپ کو مدنی دور کا باسی تصور کرتے ہیں حالانکہ بات اس کے برعکس ہے۔ انہیں نبی ﷺ کے اسوہ پر عمل کرتے ہوئے مکہ کی دعوتی زندگی کو مد نظر رکھنا چاہیے۔

8۔ ڈائری (1983ء تا1992ء)؛ مختلف سیمینار اور مختلف ممالک کے اسفار کے تذکرہ پر مشتمل کتاب ہے۔ یہ قسط وار ہر سال چھپ رہی ہے۔

9۔ رازِ حیات؛ اس کتاب میں مختلف حلقہ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی ترقی کے اسباب، قصوں کی شکل میں تحریر کئے گئے ہیں اور اس کے بعد ان کی مثال کو سامنے رکھ کر قاری کو تلقین کی جاتی ہے کہ اگر وہ کامیاب زندگی گزارنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ ان واقعات سے سبق حاصل کرے۔

10۔ مطالعہ حدیث؛ یہ کتاب حدیث رسول ﷺ کے متعلق مولانا کا جو نقطہ نظر ہے اس کی جامع عکاسی کرتی ہے۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ حدیث دین کے سمجھنے اور زندگی کے شرعی مسائل کے حل کے لیے کس طرح معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

دعوت فکر اور دعوت دین بالقرآن

مولانا وحید الدین خان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ قرآن ایک اعلیٰ ترین علمی کتاب ہے، اس میں فطری حدود کے اندر علم و عقل کی پوری رعایت رکھی گئی ہے۔ قرآن مجید کا طریقہ یہ ہے کہ فنی آداب اور علمی تفصیلات کو چھوڑ کر اصل بات کو موئثر دعوتی اسلوب میں بیان کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کا مقصد علمی مطالعہ پیش کرنا نہیں، اس کا مقصد تذکیر و نصیحت ہے اور تذکیر و نصحیت کے لیے ہمیشہ سادہ اسلوب کار آمد ہوتا ہے نہ کہ فنی اسلوب۔

> قرآن عام طرز کی علمی تصنیف نہیں، وہ ایک دعوتی کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو ساتویں صدی کے ثلث اول میں ایک خاص قوم کے اندر اپنا نمائندہ بنا کر کھڑا کیا اور اس کو اپنے پیغام کی پیغام بری پر مامور فرمایا۔ اس پیغمبر نے اپنے ماحول میں یہ کام شروع کیا اور اسی کے ساتھ قرآن کا تھوڑا تھوڑا حصہ حسب ضرورت اس کے اوپر اترتا رہا۔ یہاں تک کہ 23 سال میں پیغمبر کے دعوتی کام کی تکمیل کے ساتھ قرآن کی بھی تکمیل ہو گئی۔[1]

مولانا وحید الدین خان لکھتے ہیں کہ قرآن آدمی کو مشن دیتا ہے وہ حقیقتاً کوئی نظام قائم کرنے کا مشن نہیں ہے۔ بلکہ اپنے آپ کو قرآنی کردار کی صورت میں ڈھالنے کا مشن ہے۔ قرآن کا اصل مخاطب فرد ہے نہ کہ سماج۔ اس لیے قرآن کا مشن فرد پر جاری ہوتا ہے نہ کہ سماج پر۔ تاہم افراد کی قابل لحاظ تعداد جب اپنے آپ کو قرآن کے

---

1 خاں، وحید الدین، مولانا، دیباچہ **تفسیر تذکیر القرآن**، (دار التذکیر، لاہور، 2003ء)، ج1، ص7

مطابق ڈھالتی ہے تو اس کے سماجی نتائج بھی لازماً نکلنا شروع ہوتے ہیں۔ یہ نتائج ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے بلکہ حالات کے اعتبار سے ان کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔[1]

قرآن میں مختلف انبیاء کے واقعات انہیں سماجی نتائج یا سماجی رد عمل کے مختلف نمونے ہیں اور اگر آدمی نے اپنی آنکھیں کھول رکھی ہیں تو وہ ہر صورت حال کی بابت قرآن میں رہنمائی پاتا چلا جاتا ہے۔ قرآن فطرت انسانی کی کتاب ہے۔ قرآن کو وہی شخص بخوبی طور پر سمجھ سکتا ہے جس کے لیے قرآن اس کی فطرت کا ثنی بنا جائے۔

کفار نے جب دعوت اسلام قبول نہ کی تو اسلام اور پیغمبر اسلام پر طرح طرح کے اعتراض کرنا شروع کر دیئے اور اعتراض بھی بے معنی، جن کی کوئی حیثیت نہیں ہے، قرآن کریم میں مچھر کی مثال دی گئی تو کفار نے کہا کہ اللہ اتنی چھوٹی سے چیز کی مثال کیوں دے رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو جواب ان الفاظ میں دیا:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَن يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ﴾[2]

(اللہ اس سے نہیں شرماتا کہ بیان کرے مثال مچھر کی یا اس سے بھی کسی چھوٹی چیز کی۔ پھر جو ایمان والے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ حق ہے ان کے رب کی جانب سے۔ اور جو منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس مثال کو بیان کرے کے اللہ نے کیا جاہا ہے۔ اللہ اس کے ذریعہ بہتوں کو گم راہ کرتا ہے اور بہتوں کو اس سے راہ دکھاتا ہے۔ اور وہ گم راہ کرتا ہے ان لوگوں کو جو نافرمانی کرنے والے ہیں)

مولانا کے خیال میں آدمی کے اندر نصیحت پکڑنے کا ذہن نہ ہو تو وہ کسی بات کو سنجیدگی کے ساتھ نہیں لیتا ایسے آدمی کے سامنے جب بھی کوئی دلیل آتی ہے تو وہ اس کو سطحی طور پر دیکھ کر ایک شوشہ نکال لیتا ہے۔ اس طرح وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ دعوت کوئی معقول دعوت نہیں ہے۔ اگر وہ معقول دعوت ہوتی تو کیسے ممکن تھا کہ اس میں اس قسم کی بے وزن باتیں شامل ہوں۔ مگر جو نصیحت پکڑنے والے ذہن ہیں جو باتوں پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں، ان کو حق کو پہچاننے میں دیر نہیں لگتی۔ خواہ حق کو مچھر جیسی مثالوں ہی میں کیوں نہ بیان کیا گیا ہو۔

امت وسط کا مرتبہ اور فریضہ

بیت المقدس کی جگہ خانہ کعبہ کو قبلہ کیوں قرار دیا گیا اس کے اندر کیا حکمت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو لامت سے معزول کرکے امت محمد کو اس کی جگہ مقرر کر دیا ہے۔ اب قیامت تک بیت المقدس کے بجائے کعبہ خدا کے دین کی دعوت اور خدا پرستوں کے باہمی اتحاد کا عالمی مرکز ہو گا۔ وسط کے معنی بیچ

---

1 خاں، وحید الدین، مولانا، دیباچہ **تفسیر تذکیر القرآن**، ج1، ص7

2 البقرۃ2:26

کے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اللہ کے پیغام کو اس کے بندوں تک پہنچانے کا درمیانی وسیلہ ہیں۔ اللہ کا پیغام رسول کے ذریعہ ان کو پہنچا ہے۔ اب اس پیغام کو انہیں قیامت تک تمام قوموں کو پہنچاتے رہنا ہے۔ اسی پر دنیا میں بھی ان کے مستقبل کا انحصار ہے اور اسی پر آخرت کا بھی۔[1]

امت وسط کا فریضہ دعوت دین ہے اور ان کو اس کے لیے مطلوب صفات اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے۔ داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ صبر و حوصلہ اور برداشت سے کام لے۔ اور ہر آنے والی پریشانی اور مشکلات کو صبر و تحمل سے حل کرنے کی کوشش کرے۔ اس لیے قرآن کریم میں آزمائش نیک بندوں کے لیے رکھی گئی ہے، اور صبر کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص خوشخبری کا وعدہ ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ﴾[2]

(اور ہم ضرور تم کو آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے۔ اور ثابت قدم رہنے والوں کو خوش خبری دے دو۔)

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں دعوتی نکات بیان کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

حق کی رو میں مشکلات و مصائب کا دوسرا سبب مومن کا تعلیق کر دبا تلی مولی الھام صحت اور تنقید کا کام ہے۔ اور نصیحت اور تنقید ہمیشہ آدمی کے لیے سب سے زیادہ مبغوض چیز رہی ہے، ان میں بھی نصیحت سننے کے لیے سب سے زیادہ حساس وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے دنیا کے کاروبار کو دین کے نام پر کر رہے ہوں۔ داعی کی ذات اور اس کے پیغام میں ایسے تمام لوگوں کو اپنی حیثیت کی نفی نظر آنے لگتی ہے۔ داعی کا وجود ایک ایسی ترازو بن جاتا ہے جس پر ہر آدمی تل رہا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ داعی بننا بھڑ کے چھتہ میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔ ایسا آدمی اپنے ماحول کے اندر بے جگہ کر دیا جاتا ہے۔ اس کی معاشیات برباد ہو جاتی ہیں۔ اس کی ترقیوں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ حتی کہ اس کی جان تک خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ مگر وہی آدمی راہ پر ہے جس کو بے راہ بتا کر ستایا جائے۔ وہی پاتا ہے جو اللہ کی راہ میں کھوئے۔ وہی جی رہا ہے جو اللہ کی راہ میں اپنی جان دے دے۔ آخرت کی جنت اسی کے لیے ہے جو اللہ کی خاطر دنیا کی جنت سے محروم ہو گیا ہو۔[3]

---

1 خاں، وحید الدین، مولانا، **تفسیر تذکیر القرآن**، ج1، ص60

2 البقرۃ 155:2

3 خاں، وحید الدین، مولانا، **تفسیر تذکیر القرآن**، ج1، ص61

مولانا وحید الدین خان کی تجدیدی فکر

1۔ مولانا وحید الدین خان کی تجدیدی فکر کا پس منظر اور بنیادی اصول

مولانا وحید الدین خان (1925-2021) برصغیر کے ان جلیل القدر مفکرین میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے دورِ جدید میں اسلامی فکر کی تجدید اور اس کی عصری معنویت کو اجاگر کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کی فکر کی بنیاد قرآن و سنت کی اصل روح کو اجاگر کرنا اور اسلام کو ایک زندہ، متحرک اور انسانی معاشرے کے لیے قابل عمل دین کے طور پر پیش کرنا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"دین اسلام کی اصل روح یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا کے سامنے جواب دہ سمجھے اور اسی بنیاد پر اپنی پوری زندگی کو تشکیل دے"۔[1]

ان کے نزدیک تجدید دین کا مطلب دین میں کوئی نیا اضافہ یا تبدیلی نہیں، بلکہ اس کی اصل روح کو نئی زندگی دینا ہے۔ مولانا نے اپنی کتاب "تجدید دین" میں لکھا:

"تجدید دین کا کام ہر دور میں اس لیے ضروری ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ دین کی اصل تعلیمات پر روایتی اور غیر متعلقہ چیزیں غالب آجاتی ہیں، جنہیں چھانٹ کر اصل پیغام کو واضح کرنا تجدیدی عمل ہے۔"[2]

مولانا کے نزدیک دین کی اصل دعوت توحید، اخلاق، فکر آخرت اور انسانیت کی فلاح ہے اور انہوں نے اس پیغام کو جدید سائنسی اور عقلی زبان میں پیش کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"آج کا انسان سائنسی ذہن رکھتا ہے، اس کے سامنے دین کو پیش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کی زبان اور اس کے ذہنی افق کو ملحوظ رکھیں۔"[3]

مولانا کی فکر میں سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ اسلام کو ایک دعوتی تحریک سمجھتے ہیں اور اس کی اصل روح کو اجاگر کرنے کے لیے روایتی تقلیدی انداز کے بجائے اجتہادی اور عقلی اسلوب اختیار کرتے ہیں۔

2۔ دعوتی اسلوب اور پر امن بقائے باہمی مولانا کا عملی ماڈل

مولانا وحید الدین خان کی تجدیدی فکر کا سب سے اہم پہلو ان کا دعوتی اسلوب اور پر امن بقائے باہمی کا عملی ماڈل ہے۔ انہوں نے اپنی مشہور کتاب "The vision of Islam" میں لکھتے ہیں:

---

[1] *Khan, Maulana Wahiduddin. "Islam and Modern challenges." (No Title) (2001).*
[2] *Khan, Maulana Wahiduddin. Woman between Islam and Western society. Islamic Centre, 1995.*
3 خاں، وحید الدین، مولانا، قرآن کا مطلوب انسان، نئی دہلی: مکتبہ الرسالہ، 7 ستمبر 2009ء، ص 13

"دعوت دین کا اصل طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے مخاطب کو دوست سمجھے، اس سے ہمدردی اور خیر خواہی کا رویہ اختیار کرے، اور اس کے سامنے اسلام کے پیغام کو حکمت اور نرمی کے ساتھ پیش کرے"۔[1]

مولانا نے ہمیشہ مسلمانوں کو دعوتی انداز اپنانے کی تلقین کی اور کہا:

"اسلام کی دعوت تلوار سے نہیں، بلکہ دلیل اور محبت سے پھیلتی ہے۔"[2]

انہوں نے معاشرتی ہم آہنگی اور عدم تشدد پر خصوصی زور دیا اور کہا:

"اسلام کا اصل پیغام امن اور رواداری ہے۔ ایک سچا مسلمان وہ ہے جو اپنے معاشرے میں امن اور خیر کا ذریعہ بنے۔"[3]

مولانا کے نزدیک مسلمانوں کو اپنی ناکامیوں کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرانے کے بجائے اپنی اصلاح اور دعوتی ذمہ داری کو سمجھنا چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں:

"آج کے مسلمان کو سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ خود کو دعوت دین کے لیے تیار کرے اور اپنے اخلاق و کردار سے دوسروں کے دلوں کو جیتے۔"[4]

ان کا یہ دعوتی ماڈل نہ صرف برصغیر بلکہ عالمی سطح پر بھی قابل قبول ہوا اور انہوں نے بین المذاہب مکالمے اور مذہبی رواداری کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔

3۔ اجتہاد، جدیدیت اور سائنسی فکر

مولانا وحید الدین خان نے اجتہاد اور جدیدیت کو اسلامی فکر میں مرکزی حیثیت دی۔ ان کے نزدیک اجتہاد صرف فقہی مسائل میں نہیں، بلکہ دین کی دعوت اور اس کی تعبیر میں بھی ضروری ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اجتہاد کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہم دین کی روح کو ہر دور کے انسان کے لیے قابل فہم اور قابل عمل بنائیں۔"[5]

انہوں نے اپنی کتاب "قرآن اور علم جدید" میں سائنسی فکر اور اسلامی تعلیمات کے درمیان ہم آہنگی کو اجاگر کیا اور کہا:

"قرآن کا پیغام یہ ہے کہ انسان غور و فکر کرے، کائنات کے اسرار کو سمجھے اور اپنے علم کو خدا کی معرفت کا ذریعہ بنائے۔"[6]

مولانا نے جدید تعلیم یافتہ طبقے کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے لیے سائنسی اور عقلی دلائل کو بھرپور

---

[1] *Khan, Maulana Wahiduddin. "The vision of Islam." (2014), pg 6.*

[2] خاں، وحید الدین، مولانا، تجدید علوم الدین، نئی دہلی: مکتبہ الرسالہ، 8 فروری 2017، ص24

[3] خاں، وحید الدین، مولانا، رازِ حیات، دار الابلاغ، لاہور، 25 مارچ 2016ء، ص36

[4] خاں، وحید الدین، مولانا، اظہارِ دین: عصری اسلوب میں اسلام کا علمی اور فکری مطالعہ۔ نئی دہلی: مکتبہ الرسالہ، 19 دسمبر 2019، ص45

[5] *Khan, Maulana Wahiduddin. "The vision of Islam." (2014), pg 7.*

[6] خاں، وحید الدین، مولانا، تجدید علوم الدین، ص57

انداز میں استعمال کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"اسلام عقل و علم کا دین ہے، اس میں تقلید اور جمود کی کوئی گنجائش نہیں، بلکہ مسلسل غور وفکر اور اجتہاد اس کی اصل روح ہے۔"[1]

مولانا کی فکر کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو دعوتی ذمہ داری کا احساس دلایا اور کہا:

"دعوت دین کا اصل میدان آج کا جدید معاشرہ ہے، جہاں دلیل، علم اور حکمت کے بغیر کوئی بات قبول نہیں کی جاتی۔"[2]

ان کے یہ افکار آج کے نوجوانوں اور جدید ذہن رکھنے والے مسلمانوں کے لیے راہنمائی کا ذریعہ ہیں۔

4۔ علمی تنقیدات، اثرات اور وراثت

مولانا وحید الدین خان کی فکر پر جہاں تحسین ہوئی، وہیں بعض حلقوں میں تنقید بھی ہوئی۔ خاص طور پر ان کی جہاد اور قتال سے متعلق تعبیرات پر بعض علماء نے اعتراض کیا کہ انہوں نے روایتی تصور کو کمزور کیا۔ مولانا نے اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا:

"اسلام میں قتال کا حکم مخصوص حالات کے لیے ہے، اصل پیغام دعوت اور اصلاح ہے۔ آج کے دور میں مسلمانوں کی اصل ذمہ داری دعوت دین اور معاشرتی اصلاح ہے۔"[3]

انہوں نے اختلاف رائے کو علمی ارتقاء کا ذریعہ قرار دیا اور کہا:

"اختلاف رائے کو دشمنی نہ سمجھا جائے، بلکہ اسے علمی مکالمے کا ذریعہ بنایا جائے۔"[4]

مولانا نے اپنی علمی وراثت میں یہ پیغام دیا کہ دین کی اصل روح کو اجاگر کرنا اور اس کی دعوت کو پرامن انداز میں عام کرنا ہی اصل تجدید ہے۔ ان کی خدمات کو عالمی سطح پر سراہا گیا اور انہیں کئی اعزازات سے نوازا گیا۔ ان کی وفات علمی دنیا کے لیے ایک بڑا خسارہ ہے، تاہم ان کی تصانیف اور افکار آج بھی مسلمانوں کے لیے رہنمائی کا ذریعہ ہیں۔

علامہ جاوید احمد غامدی اور ان کے افکار

جاوید احمد غامدی صاحب کی پیدائش 18 اپریل 1951ء کو ضلع ساہیوال کے ایک گاؤں جیون شاہ کے نواح میں ہوئی۔ اگر جاوید احمد غامدی کے دینی علوم کی بات کی جائے تو قرآن وحدیث کی تعلیم انہوں نے اپنے امام امین

---

1 خاں، وحید الدین، مولانا، تجدید علوم الدین، ص57

2 اظہارِ دین، عصری اسلوب میں اسلام کا علمی اور فکری مطالعہ: 2019، ص67

3 Islam and Modern challenges: 2001

4 خاں، وحید الدین، مولانا، قرآن کا مطلوب انسان، ص88

احسن اصلاحی سے کی۔ دیگر اساتذہ میں مولانا ادریس کاندھلوی، مولانا ابو الخیر مودودی، مولانا حنیف ندوی، مولانا عطاء اللہ حنیف، ڈاکٹر سید عبد اللہ اور مولانا سید ابو الاعلی مودودی شامل ہیں۔ ان مشہور زمانہ شخصیات سے فیض حاصل کیا۔

علمی و فکری خدمات

علامہ غامدی 1980ء سے دینی علوم پر علمی اور تحقیقی کام انجام دے رہے ہیں۔ ان کے کام کے وہ اجزا حسب ذیل ہیں جو تصانیف کی صورت اختیار کر چکے ہیں:

1۔ البیان (5 جلدیں) قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر

2۔ میزان: دین کی تفہیم و تبیین

3۔ برہان: تنقیدی مضامین کا مجموعہ

4۔ مقامات: دینی، ملی اور قومی موضوعات پر متفرق تحریریں

5۔ خیال و خامہ: مجموعہ کلام

اردو ماہنامہ اشراق؛ اردو زبان میں غامدی صاحب کے افکار کا ترجمان ہے۔ اس کا آغاز 1985ء سے ہوا، اس کے اہم سلسلے یہ ہیں: قرآنیات، معارف نبوی، دین و دانش، نقد و نظر، نقطۂ نظر، حالات و وقائع، تبصرۂ کتب۔

انگریزی ماہنامہ؛ نشاۃ الثانیہ Renaissance؛ انگریزی زبان میں اس رسالے کا آغاز 1991ء سے ہوا۔:

ادارۂ علم و تحقیق؛ یہ ادارہ 1991ء میں قائم کیا گیا۔ اس کا بنیادی مقصد اسلامی علوم سے متعلق علمی اور تحقیقی کام، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیانے پر اس کی نشر و اشاعت اور اس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

جاوید احمد غامدی کے افکار و نظریات

علامہ غامدی نے اپنے فکر و نظر میں واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اخلاقی مفاسد سے معاشرے کی حفاظت اور باہمی تعلقات میں دلوں کی پاکیزگی قائم کرنے کے لیے مرد وزن کے اختلاط کے آداب مقرر فرمائے ہیں اور یہ تنبیہ بیان کی ہے کہ دوسروں کے گھروں میں جانے اور ملنے جلنے کا یہی طریقہ ہے اور اگر لوگ اس کا خیال رکھے گے تو یہ ان کے لیے باعث خیر و برکت ہو گا۔ ان طریقوں کی پابند ہونا از حد ضروری ہے، قرآن میں اللہ تعالی نے یہ تنبیہ کی ہے کہ اللہ انسان کے ہر عمل اور نیت و ارادوں سے واقف ہے۔[1]

حدیث و سنت میں فرق

جاوید احمد غامدی قرآن و سنت میں فرق کے ساتھ ساتھ حدیث و سنت میں بھی فرق کرتے ہیں۔ سنت کی

---

1 غامدی، جاوید احمد، **المیزان**، (المورد، ادارہ علم و تحقیق، لاہور، 2009ء)، ص462، 442

تعریف کچھ یوں کرتے ہیں۔

"سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی اللہ تعلیم نے اس کی تجدید واصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے"۔[1]

قرآن کریم میں اس کا حکم آپ ﷺ کے لیے اس طرح بیان ہوا ہے؟

﴿ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَٰهِيمَ حَنِيفًا وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾[2]

(پھر ہم نے تمھیں وحی کی کہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو۔ جو بالکل یک سو تھا اور مشرکوں میں سے نہیں تھا)

اس ذریعے سے جو دین ہمیں ملا ہے وہ یہ ہے:

1۔ اللہ کا نام لیکر اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا

2۔ ملاقات کے وقت سلام اور اس کا جواب۔

3۔ چھینک آنے پر الحمد اللہ اور اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہنا

4۔ نومولود کے دائیں کان میں آذان اور بائیں میں اقامت

5۔ بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا

6۔ حیض ونفاس کے بعد غسل

7۔ میت کا غسل

8۔ تجہیز و تکفین

9۔ تدفین

10۔ عید الفطر

11۔ نکاح وطلاق اور ان کے متعلقات

12۔ زکوۃ اور اس کے متعلقات وغیرہ وغیرہ۔

تصور جرم زنا

غامدی صاحب ثبوتِ زنا کے لیے چار گواہ پیش کرنے کا انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اسی طرح زنا کے جرم میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر حال میں چار گواہ ہی طلب کیے جائیں اور وہ اس بات کی شہادت دیں کہ انہوں نے ملزم اور ملزمہ کو عین حالت مباشرت میں دیکھا ہے، قرآن وحدیث کی رو سے یہ شرط صرف اس صورت میں ضروری ہے جبکہ مقدمہ التزام ہی کی بنا پر قائم ہوا ہو اور الزام ان پاک دامن شہر

---

1 غامدی، جاوید احمد، **المیزان**، ص14

2 النحل 123:16

فار پر لگایا جائے جن کی حیثیت عرفی ہر لحاظ سے مسلم ہو اور جن کے بارے میں کوئی شخص اس بات کا تصور بھی نہ کر سکتا ہو کہ وہ کبھی اس جرم کا ارتکاب کر سکتے ہیں۔[1]

معاشرتی اور سیاسی نظریات

غامدی صاحب کی فکر کے ابتدائی عہد کی تحریروں سے ان کی معاشرتی سیاسی فکر Socio Political Thought کے حوالے سے جو باتیں مختصر طور پر ثابت ہوتی ہیں اور جن سے ان کی آج کی فکر تقریباً مکمل طور پر مختلف ہے، ان کو مختصر احسب ذیل نکات کی شکل میں بیان کیا جاسکتا ہے:

1۔ اسلامی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد مسلمان معاشرے کے ہر فرد پر واجب ہے۔

2۔ قرآن مجید کے لفظ خلیفہ سے مراد صاحب اقتدار مراد ہے اور خلافت ایک دینی اصطلاح ہے جس کی اقامت ایک دینی ذمے داری ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ایک شاخ ہے۔

3۔ سورہ توبہ کی تعلیمات اس باب میں صریح ہیں کہ دنیا میں جو لوگ اللہ کے احکام کے تابع نہیں، وہ زمین پر اقتدار کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

4۔ کسی مسلمان حکومت کے ارباب اقتدار اگر قرآن و سنت کے مطابق نظام کا نفاذ نہیں کرتے تو اس طرح وہ حقیقت میں کفر کا ارتکاب کر رہے ہیں اور ان کا اسلام قیامت کے دن اللہ کے ہاں معتبر نہیں ہو گا۔

5۔ اتمام حجت کسی مسلم حکومت کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے اور اس کے نتیجے میں کسی کی تکفیر بھی جائز ہے۔

6۔ مخلوط تعلیم جیسی چیزوں سے اجتناب لازم ہے اور نوجوانوں کو جہاد و قتال کی تربیت دینی چاہیے، وغیرہ۔ یہ نکات واضح کرتے ہیں کہ غامدی صاحب کی فکر آغاز میں بنیادی طور پر "دین کی سیاسی تعبیر" ہی کا اپنے الفاظ میں اعادہ ہے۔

جاوید احمد غامدی کی فکر جدید اصلاح و تعبیر اور تشریح

جاوید احمد غامدی کی فکر جدید اسلامی روایت میں ایک منفرد اور اجتہادی رخ کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کی فکر کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ دین اسلام کو زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں اور جدید ذہن کے لیے قابل فہم اور قابل عمل بنایا جائے۔ غامدی صاحب نے روایت پرستی کے بجائے براہ راست قرآن و سنت کی روشنی میں دین کی تعبیر و تشریح کو ترجیح دی۔ ان کے نزدیک دین کے اصل مصادر صرف قرآن اور سنت ہیں، اور سنت سے ان کی مراد وہ عملی روایت ہے جو امت کے اجماع اور تواتر سے منتقل ہوئی ہے، نہ کہ صرف احادیث کا مجموعہ۔

غامدی صاحب کے نزدیک حدیث دین کے فہم اور اس کی تفصیل میں معاون تو ہے، مگر وہ دین میں کسی نئے حکم یا عقیدے کا ماخذ نہیں بن سکتی۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ "حدیث سے عقیدہ و عمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا

---

1 جعفر سبحانی، **منشور جاوید**، (اسلامی اکیڈمی لاہور، 2017ء)، ج1، ص18

اور یہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ نہیں بن سکتی"۔ اس فکر نے روایتی حلقوں میں شدید بحث کو جنم دیا کیونکہ اس سے حدیث کے روایتی مقام پر سوال اٹھتا ہے۔[1]

غامدی صاحب نے دین کی سند و رجال کی اجارہ داری کو بھی چیلنج کیا اور اس بات پر زور دیا کہ دین کی تعبیر ہر صاحب علم کے لیے کھلی ہے۔ ان کے مطابق امت مسلمہ نے حدیث و سنت کے نام پر کلام الناس کو کلام الٰہی کی ہم سری کا درجہ دے دیا ہے، اور اس اجارہ داری سے نجات ضروری ہے۔ اس فکر نے دین کی تفہیم کو شخصی و طبقاتی اختیار سے نکال کر علمی مکالمے اور اجتہاد کے دائرے میں داخل کیا۔

تعبیر و تشریح کے اصول

غامدی صاحب کی تعبیر دین میں سب سے نمایاں اصول یہ ہے کہ قرآن و سنت کی روشنی میں ہر مسئلے کو براہ راست سمجھا جائے اور عقل و فطرت کو بھی رہنمائی میں شامل کیا جائے۔ ان کے نزدیک سنت وہ عملی روایت ہے جو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کے ذریعے امت میں جاری کی اور جو نسل در نسل تواتر عملی سے منتقل ہوئی۔ اس سنت کی فہرست بھی وہ خود مرتب کرتے ہیں اور اسے قرآن کے بعد دین کا دوسرا ماخذ قرار دیتے ہیں۔[2]

غامدی صاحب کے نزدیک دین کی تشریح میں عقل اور انسانی فطرت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہ عربی زبان، اس کے محاورات، دورِ جاہلیت کے اشعار اور سیاق و سباق کو بھی قرآنی آیات کی تفسیر میں بنیادی حیثیت دیتے ہیں۔ ان کی تعبیر کے مطابق دین کا اصل مقصد فرد کی اصلاح، اخلاق کی تطہیر اور معاشرتی عدل ہے، نہ کہ محض سیاسی غلبہ یا جبری نفاذ۔[3]

غامدی صاحب کی فکر میں اجتہاد کو کلیدی مقام حاصل ہے۔ وہ تقلید و جمود کے قائل نہیں بلکہ ہر دور کے مسائل کا حل اجتہاد اور تحقیق سے نکالنے پر زور دیتے ہیں۔ ان کے مطابق دین میں کوئی بھی حکم یا اصول صرف اسی وقت قابل قبول ہے جب وہ قرآن و سنت سے براہ راست ثابت ہو اور عقل و فطرت سے ہم آہنگ ہو۔[4]

[1] زبیر، حافظ محمد، فکرِ غامدی: ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ، لاہور: مکتبہ رحمۃ للعالمین، 30 ستمبر 2012ء

[2] Sawja, Attash. "Propagating Gender Norms in an Islamic Republic: Three Pakistani Alims and their Online tafsīr s." *Journal of Qur'anic Studies* 25, no. 3 (2023): 55-88.

[3] Ahmad, Hafiz Saeed, and Abid Naeem. "An application of Traditional & Modern Methods in Specific Ayahs of Quran for Interfaith Harmony in Pakistan." *Islamic Research Journal {القدوة}* 2, no. 04 (2024): 161-180.

[4] Yasir, Muhammad, Aurang Zeb Nasar, and Mufti Sana Ullah. "PHILOSOPHY OF DAWAH IN ISLAM: A COMPARATIVE ANALYSIS OF MAULANA WAHEED U DIN AND JAVED AHMED GHAMIDI'S THOUGHTS." *Pakistan Journal of International Affairs* 6, no. 2 (2023).

تنقیدی جائزہ

غامدی صاحب کی تعبیر و تشریح پر روایتی علماء نے کئی اعتراضات اٹھائے۔ ان پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ دین کو جدید ذہن کے لیے قابل قبول بنانے کی کوشش میں اس کی اصل روح کو مختصر اور محدود کر دیتے ہیں۔ بعض ناقدین کے مطابق غامدی فکر کا بنیادی مقصد امت مسلمہ کو اس کے تاریخی اور متوارث فہم دین سے دور کرنا ہے۔ تاہم ان کے حامی انہیں دین کی اصل روح کو اجاگر کرنے والا اور اجتہاد کو زندہ کرنے والا مفکر قرار دیتے ہیں۔

غامدی صاحب کی فکر میں نمایاں تبدیلیاں بھی آئیں۔ ان کی ابتدائی تحریروں میں اسلامی ریاست کے قیام، خلافت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو ریاستی فریضہ قرار دیا گیا تھا، مگر بعد میں انہوں نے دین کو فرد کی اصلاح، اخلاقی تربیت اور معاشرتی عدل تک محدود کر دیا۔ اس فکری ارتقاء نے انہیں برصغیر میں ایک منفرد اور اجتہادی مکتب فکر کا نمائندہ بنا دیا ہے۔

باب پنجم: برصغیر پر فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے اثرات کا جائزہ

فصل اوّل: معاشرتی فکر پر اثرات

فصل دوم: سیاسی فکر پر اثرات

فصل سوم: دینی فکر پر اثرات

باب پنجم

برصغیر پر فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے اثرات کا جائزہ

فصل اوّل

معاشرتی فکر پر اثرات

بیسویں صدی کے ابتدائی دو عشروں کی بات کی جائے تو یہ دونوں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور ان کی اجتماعی حیثیت کو ختم کرنے کی ایک کامیاب کوششوں سے عبارت ہیں۔ برصغیر میں مسلمانوں کی اکثریت وجہ سے اس وقت تحریک خلافت کو ایک مضبوط مرکزی حیثیت حاصل ہوئی کیونکہ اس کی ایک بنیادی وجہ مسلمانوں کی اکثریت کا ہونا تھا اگر پس منظر میں دیکھا جائے تو مسلمانوں کی علمی، اقتصادی، سیاسی اور تہذیبی اور اخلاقی حالت کو سید احمد شہید نے ابھارا اور انہیں عالم گیر برادری ہونے کے احساس سے دوچار کیا۔

شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان نے اس تحریک کو بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ جس کا بھرپور نتیجہ یہ نظر آیا کہ مسلمانوں کے حجاز مقدس اور اسلامی ممالک کی طرف رجوع کیا۔ اور اس مظلومیت اور بدحالی کے زمانہ میں یہ روحانی رشتہ مقامات مقدسہ سے اور مضبوط ہوا۔ لیکن اس کے بعد 1857ء کی ایک انقلابی جنگ کے بعد بعض راہنماؤں اور علمائے کرام نے حجاز مقدسہ کو ایک بار پھر سے اپنا محور مانا اور اس تحریک کو زندہ کیا۔

> "مولا قاسم نانوتویؒ، امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور رشد احمد گنگوہیؒ کا محور و مرکز حجاز مقدس ہی رہا۔ اس تعلق کی مضبوطی کا اندازہ ہجرت کے ان فتوؤں سے لگایا ہے جاسکتا ہے، جو شاہ عبدالعزیز کے دور سے لیکر تحریک خلافت کے وقت تک بھی جاری ہوتے رہے اور ایک تحریک جو ہجرت کی تحریک چلی اور لوگوں نے اس میں بھرپور حصہ لیا"۔[1]

قومی دینی ادب

اگر برصغیر کے انیسویں اور صدی کے مسلم ادب کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ کس طرح سرسید احمد خان نے خطات احمدیہ لکھ کر مغرب کے مذہب پر الزامات کا راز فاش کیا اور اس فتنہ سامانیوں کا منہ توڑ جواب دیا۔ اور سید امیر علی نے برصغیر کے مسلمانوں کے سامنے صلیبی جنگوں کی تاریخ لکھ کر پوری سیاست کی تاریخ سے آگاہی دی۔

---

1 Dani, Ahmed Hasan, *Proceeding of The first congress of Pakistan, History & Culture*, Unversit of Islamabad· 1975 Vol: 1 P-60

مولانا شبلی نعمانی نے قسطنطنیہ کے سفر کرنے کے بعد مسلمانوں کے علمی کارناموں کو عام کیا اور مسلمانوں کو پست ذہنی اور غلام ذہینت سے پردہ اٹھایا۔ اِسی طرح مولانا شرر نے اپنے ناولوں میں صلیبی جنگوں کو موضوع بنایا۔ اور یورپ کی بربریت اور زیادتیوں کا ایک بہترین نقشہ کھینچا اور اپنی تحریروں سے مسلمانوں کے شاندار ماضی کی عکاسی کی اور اسلامی ممالک سے ہندوستان کو قریب کیا۔

یہ اسلامی شعور اور فکر نو کی بیداری کی ایک لہر تھی جس نے آگے چل کے مسلمانوں کو ایک نئی کی زندگی بخشی۔ مولانا شبلی، مولانا ظفر علی خان، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مظہر الحق، مولانا آزاد سبحانی، مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال ان تمام شخصیات نے اپنے ہونے کا حق ادا کیا اور وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کی ہدایت پر انہیں اپنی حیثیت کو ابھارنے کا موقع ملا۔ اور مسلم یونیورسٹی کا مطالبہ مانتے ہوئے انہوں فنڈز فراہم کرنے کا حکم جاری کیا۔[1]

اس سب میں صحافت کا کردار بڑا واضح اور نمایاں نظر آتا ہے۔ مولانا محمد و علی جوہر نے اپنی اخبار میں قسط وار مضامین شروع کیے جس میں انہوں نے بڑی بے جگری سے انگریزوں کی سازشوں کو بے نقاب کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کامریڈ کے پرچے ضبط کر لئے گئے۔ ان کی صحافت کا ایک بڑا کارنامہ یہ رہا ہے کہ انھوں نے مسلمانوں میں بیداری کے لئے چالیس چالیس گھنٹے مسلسل جاگ جاگ کے مضامین لکھے اور اگر وہ تھک جاتے تو دوسروں کو ڈکٹیٹ کرواتے۔ انھوں نے سازشوں اور جانوں کا نقاب تار پود کر دیا جس کا تعلق بالواسطہ یا بلا واسطہ مسلمانوں سے تھا بعد ازاں انھیں قانون تحفظ ہند کے تحت مولانا محمد علی جوہر کو نظر بند کیا گیا۔[2]

اگر بیسوی صدی کے اوائل کا تذکرہ جائے تو برصغیر میں مسلمانوں کا یہ زمانہ کرب اور مصائب کا تھا۔ مغربی تمام تر صلاحتیں ذہنی اور جسمانی مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی کوششوں میں لگی تھیں لیکن ان سب استعماری طاقتوں کے خلاف اوران کے عزائم کے خلاف مسلمانوں کی مجاہدانہ صلاحیتوں کے ساتھ ہر میدان میں اور ہر محاذ پر کر مقابلہ کیا۔ اگر ایک طرف اسلامی اور دینی فرائض کی سرکوبی کا سلسلہ جاری تھا یا اسلام مخالف قوتیں اپنے مشن پر تھیں تو دوسری جانب اسے کیا کرنے کی اصلاحی کوششوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ ادبی کی طرف سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے۔ اور حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلامی اتحاد اور انگریزوں کی مذہبی، ثقافتی اور سیاسی شازشوں کے خلاف ادب میں مسلمانوں میں ثقافتی اور مذہبی وسیاسی بیداری میں نمایاں کردار ادا کیا۔

اسلامی قومیت

1912ء میں علامہ محمد اقبال نے خواجہ حسن نظامی کو اسلامی قومیت کے بارے میں اس وقت آگاہ کیا جب

1Hamid, Abdul: **Muslimm Sepration in India:** Oxford University Press 1971.P-93

2جعفری، رئیس احمد، **سیرت محمد علی**(جامعہ ملیہ: دہلی،1936ء)، ص232

پورا ہندوستان اس حقیقت سے غافل تھا انہوں نے لکھا کہ میرے اشعار کی تاریخ، کامریڈ، بلقان، زمیندار اور طرابلس اور نواب محسن الملک کی سچائی کی بیانی اور حق گوئی کی تاریخ سے بہت پہلے کی ہے۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں مولوی عبدالحق نے تمام ادب کا جائزہ لینے کے بعد اپنے ایک اردو مضمون میں لکھا تھا مسلمانوں کی بیداری میں انہیں جگانے میں اور اپنی پہچان کے لیے علامہ محمد اقبال کی شاعری نے ایک اعجاز مسیحائی دکھایا انہوں نے بہت پہلے سے ہی ہندی بت خانوں اور وطنیت کے بتوں کا پردہ فاش کر دیا تھا۔

"اسلام تیرا دیس ہے، تو مصطفوی ہے"[1]

1909ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں علامہ محمد اقبال نے اپنی نظم "شکوہ" سنائی تو لوگوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اگر اس وقتی حالات کا جائزہ لیا جائے تو کوئی بھی پڑھا لکھا مسلمان ایسا موجود نہیں تھا جس نے یہ نظم "شکوہ" زبانی یاد نہ کی ہو۔ علامہ محمد اقبال نے اپنی نظم میں جب ایک لڑکی جو جنگ طرابلس میں زخمیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوئی تھی اس کے بارے میں اشعار لکھے اور کہا "فاطمہ تو آبروئے ملت مرحوم ہے" یہ جملہ اتنا زبان زدعام ہوا کے گھروں میں رہنے والی پردہ دار عورتوں میں جزبہ جہاد ابھرا۔

> "1912ء میں حب بلقان کی تمام ریاستوں نے مل کر ترکی پر حملہ کیا اور یونانی بادشاہ نے اسے صلیبی جہاد قرار دیا تو علامہ محمد اقبال نے اپنی "محاصرہ ءادرنہ" لکھ کر ترکوں کے بے مثال کردار کو ابھارا اور اسلامی قانون جنگ کے مسئلہ کی وضاحت کی۔ اور مسلمانوں کے سر بلند کر دیئے"۔[2]

1913ء میں بلقان کے امدادی سامان جمع کرنے کے لیے مولانا ظفر علی خان نے موچی دروازہ کے باہر ایک جلسہ منعقد کیا اس میں علامہ محمد اقبال نے اپنی نظم "جواب شکوہ" سنائی اس کے بعد اس نظم کی ہزاروں کا بیاں فروخت ہوئیں۔ اور ان سب کا معاوضہ بلقان کے لیے جمع کئے گئے فنڈ میں جمع کرا دیا گیا۔ علامہ اقبال کی نظم "ترانہ ملی" ہر شخص کی زبان پر رہی جس سے قوم کے اندر حریت، بین الاقوامیت اور حق کی خاطر اس کی حمایت میں مر مٹنے کا جذبہ پیدا ہوا۔

چین و عرب ہمارے ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا[3]

برصغیر کے مسلمانوں کے لیے یہ وہ تمام ملی اور سماجی مسائل تھے جن کے حل کے لیے۔ ان کی تمام تر توجہ مبذول ہو گئی تھی۔ اور انہیں مقاصد کے پیش نظر کانگریس کی معاونت کو قبول کیا گیا اور اتحاد قائم ہوا۔ جو کہ زیادہ

---

1 محمد اقبال، علامہ، ڈاکٹر، **بانگ درا** (وطنیت، 1955)، ص160

2 اختر احمد، میاں، **اقبالیات کا تنقیدی جائزہ** (اقبال اکیڈمی: کراچی، 1957ء)، ص118

3 محمد اقبال، علامہ، **بانگ درا**، (محاصرہ ادرنہ)، ص217

دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ کیونکہ ہندو مسلم اتحاد کے نمائندوں میں نظریات کا اختلاف تھا۔ اور اس طرح یہ ہم آہنگی زیادہ دیر بر قرار نہ رہ سکی۔ اسی دوران جب مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر ابھی نظر بند تھے اسی دوران یورپ میں ہنگامی صلح کا اعلان ہوا کیونکہ انگریزوں نے ظالمانہ طور پر قسطنطنیہ پر فوجی قبضہ کیا ہوا تھا۔ اور اس پر پورے ہندوستان میں۔ احتجاجی جلسے ہو رہے تھے۔ اور مقامات مقدسہ کی حفاظت کے لیے لکھنو میں مسلم کانفرنس میں خلافت حرمین شریف کی حفاظت کا کوئی مستقل نظام قائم کرنے پر گفتگو ہوئی۔ اور اس طرح بمبئی کے نمائندوں نے ایک انجمن "مجلس خلافت" کے نام سے قائم کی۔ کانفرنس میں اس کے لیے ایک تجویز منظور ہوئی اور "آل انڈیا یا سنٹرل خلافت" بمبئی قائم ہو گی بعد میں جس کے سیکٹری مولانا شوکت بنے۔[1]

تنظیم اور تبلیغ کی تحاریک

شدھی اور سنگھٹن کی تحاریک کے تحت ہونے والی زہر افشانی کو روکنے کے لیے بطور دفاع مسلمانوں میں تنظیم و تبلیغ کی تحریکیں قائم ہوئیں۔ ہندی تحریکیں ان پڑھ اور اسلام کی اصل روح سے ناواقف مسلمانوں کو لالچ دے کر یا زبر دستی دباؤ کے ذریعہ سے انہیں ہندو بنانے کی کوششیں کر رہی تھی۔

تبلیغ کی تحریک کا اصل مقصد ان کوششوں کو روکنا تھا۔ مسلمان راہنماؤں نے صرف یہ کوشش کی تھی ان نو مسلمان خاندانوں کو اسلام اور اس کی تعلیمات سے آگاہی فراہم کی جائے۔ اس زمانہ میں جتنے بھی مبلغ بھیجے گئے یا تبلیغی ادب شائع کیا گیا اس کا اصل مقصد مسلمانوں کو آگاہی فراہم تھا۔ ایسا کوئی لڑیچر شائع نہ ہوا جس میں صیاد کی کوئی ترغیب یا اشتعال پسندی کو ابھارا گیا ہو۔ تبلیغ کی تحریک نے اجمیر، راجپوتانہ، میر واڑہ، مارواڑ، اور مشرقی پنجاب خاص طور پر کرنال، گوڑ گاؤں، پانی پت میں اپنی ذیلی شاخیں قائم کیں۔

مسلمان مبلغین نے کسی غیر مسلم راہنماؤں کو برا بھلا نہ کہا کیونکہ یہ قرآنی تعلیم کے خلاف باتیں تھیں۔ بر صغیر میں تبلیغ کے لیے اہل علم حضرات اور صوفیاء اکرام آتے رہے۔ انھوں نے ہندوستان میں انسانی اقدار اور عالمگیر اخوت اور بھائی چارہ کے چراغ روشن کیے۔ بنگال، سندھ اور پنجاب کی اکثریت اولیاء کرام بزرگان دین کی تبلیغ سے ہی متاثر ہو کر مسلمان ہوئی جس کی نمایاں مثال مولانا عبد اللہ سندھی اور شیخ عبد المجید سندھی ہیں۔[2]

مولانا ظفر علی خان ایک لیڈر کے طور پر سامنے آئے انہوں نے تحریک خلافت کو جاندار بنانے میں پنجاب نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ان کا اخبار "زمیندار" اور ان کی ولولہ انگیز نظموں نے مسلمانوں میں ایک جوش و جذبہ پیدا کیا۔ لیکن انہیں ایک باغیانہ تقریر کرنے کے جرم گرفتار کر لیا گیا اور مقدمہ چلا کر پانچ سال قید بامشقت کی

1 حسن ریاض، **پاکستان ناگزیر تھا**، (کراچی یونیورسٹی، پریس، 1970ء)، ص86

2Gopal, Ram Indian Muslim. **A Political History** (Lahore book traders) P.150.

سزا سنائی۔ منٹگمری جیل میں قید کے بعد جب وہ رہا ہوئے تو ہندو تحریکوں کے نتیجہ میں شہروں میں فسادات برپا تھے۔ اور خلافت کی چادر چاک ہو چکی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آگے چل کر پنجاب کی خلافت کمیٹی مجلس احرار بن کر ابھری۔[1]

اس دور میں علامہ اقبال انگریزوں کی سیاست اور چالوں سے اور ترکی کے حالات سے کافی حد تک باخبر تھے۔ لہٰذہ انہوں اپنے آپ کو اس جذباتی رو میں بہنے سے بچایا اور مسلمانوں کا وفد لے کر یورپ اور خلافت قائم رکھنے پر اصرار کیا۔ جس کا اظہار انہوں نے برملا اپنی شاعری میں کیا۔ ایک قطعہ جس کا نام "دریوزہ خلافت"

نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا
خلافت کی کرنے لگا تُو گدائی
خریدیں نہ جس کو ہم اپنے لہُو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی
"مرا از شکستن چُناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی "[2]

شدھی او سنگھٹن تحاریک کے نتیجہ میں برپا ہونے والے فسادات اور مسلمانوں کے انتشار کے بعد خلافت کمیٹی کا نیا دور شروع ہوا جس میں کمیٹی کو مسلمانوں کی داخلی سیاست کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

مولانا شوکت علی نے بیان دیا۔

> "اب موجودہ حالات کے پیش نظر ہندوستان میں مسلم سوسائٹی کی اصلاحات میں کسی قسم کی تاخیر نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ عوام اور علماء کے درمیان بو عدم مطابقت پیدا ہوئی۔ اسے دور کیا جائے وہ اس لئے کہ اسلام میں عیسائیت کی طرح پیشوائیت نہیں ہے"۔[3]

اِس کے علاوہ مولانا شوکت علی نے عرب جہالت اور معاشرتی و معاشی برائیوں کی طرف توجہ دلائی۔ خلافت کمیٹی نے اپنے دائرہ کار کو جماعتی زندگی کے تمام شعبہ جات تک بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ چونکہ ہندوستان میں کل ہند جماعت خلافت کمیٹی ہی واحد تنظیم تھی، اس نے مسلمانوں کی اصلاح کی اضافی ذمہ داری بھی قبول کر لی۔

اس وقت مسلمانوں کے پاس تعلیمی سہولیات محدود تھیں۔ علی گڑھ محمڈن کالج، انجمن حمایت الاسلام لاہور، اسلامیہ کالج اور سندھ مدرسہ کراچی جیسے چند ادارے ہی تھے جہاں لوگ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ تاریخ کے پروفیسر بھی گنتی کے تھے، جن کا علم صرف ہندوستان کے مسلم دور اور مغلیہ سلطنت تک محدود تھا۔ وہ معاشیات،

---

1 غلام حسین ذوالفقار، **ظفر علی خان** (خیابان ادب لاہور، 1967ء)، ص102

2 محمد اقبال، علامہ، **بانگ درا**، (غلام علی سنز: لاہور، 1973ء)، ص284

3 Aziz K.K, **Document** No 74 Page 297

سیاسیات اور جدید علوم سے ناواقف تھے۔

پارلیمانی سطح پر مسلمانوں کی نمائندگی انتہائی محدود تھی۔ صرف چند شخصیات جیسے پیر جسٹس امیر علی، علی امام، محمد علی جناح، میاں فضل حسین اور میاں محمد شفیع ہی کل ہند سطح پر موجود تھے۔ یہی محدود سیاسی نمائندگی ایک اہم وجہ تھی کہ مسلمان دولت، صنعت، تجارت اور علم میں پیچھے رہے۔ تاہم، خلافت کمیٹی نے ان ثقافتی اور سماجی رویوں پر گہرا اثر ڈالا اور برصغیر کے مسلمانوں کی بیداری اور عالم اسلام سے روابط کو مضبوط کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

خلافت تحریک کے عوامی راہنماؤں میں مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان شامل تھے۔ علامہ محمد اقبال نے ایک اسلامی مفکر اور قومی شاعر کی حیثیت سے مسلمانوں کی مذہبی و سماجی ترقی اور قومی بیداری کا شعور پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

تحریک علی گڑھ کے ثقافتی و سماجی اثرات

انیسویں اور بیسویں صدی کے برصغیر میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے سماجی اور ثقافتی اثرات میں تحریک سید اپنے منفرد پہلوؤں کے اعتبار سے نمایاں نظر آتی ہے۔ اس تحریک میں مسلمانوں کی اجتماعی ثقافتی، سماجی، مذہبی اور سیاسی زندگی کی واضح جھلک موجود تھی۔ سر سید نے مسلمانوں کے انگریزوں اور ہندوؤں سے تعلقات کو واضح انداز میں بیان کیا۔

1857ء کی جنگ کے بعد مسلمانوں کی حالت نہایت مایوس کن تھی۔ ان کی ذہنی، معاشرتی اور اخلاقی پستی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ سید احمد خان نے نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ایک جامع پروگرام ترتیب دیا۔ انہوں نے مسلمانوں کی نئی طرز زندگی اور روشن مستقبل کے لیے اصلاحی کام کا آغاز کیا۔

1: درست مذہبی عقائد: یعنی جو کچھ کتب صحیحہ میں لکھا وہ کچھ اور ہے جن باتوں کا اظہار ہے وہ کچھ اور ہیں۔ ہزاروں عقائد شرکیہ کو عبادات میں شامل کر لیا گیا ہے۔

2: آزادی رائے: تقلید کی ایسی ہوا چلی ہے کہ سب پست و پامال ہو گئے ہیں، لہٰذا آزادی رائے کی تحریک نے جنم لیا۔

3: تصحیح مسائل مذہبی: یعنی توہمات کو بھی سے ادا کیا جاتا ہے جسے یہ سب دین اسلام کا حصہ ہے۔ ایسے مسائل جن میں متقدمین سے غلطیاں ہوئیں انہیں زیر بحث لانا ضروری ہے۔

4: بچوں اور عورتوں کی تعلیم: ایسا طریقہ تعلیم متعین کرنے کی ضرورت ہے جس سے دینی اور دنیاوی تعلیم کو اعلیٰ درجہ کا اختیار حاصل ہو سکے۔ صرف طریقہ متعین کرنا ہی ضروری نہیں بلکہ اس کے لیے ہر ممکنہ کوشش کی بھی ضرورت ہے۔ عورتوں کو دست کاری سیکھانے اور ان کی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام ہونا چاہیے۔

5: ہنر و فن و حرفہ: برصغیر کے مسلمانوں کو ہر قسم کے علوم و فنون کو حاصل کرنا اور سیکھنا تہذیبی اور ثقافتی تبدیلی کا بڑا

جزو ہے۔[1]

تہذیب الاخلاق میں ان کے علاوہ بسیں شقیں ایسی ہیں جس کا تذکرہ ملتا ہے۔ جو مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور اصلاح و ترقی کے مقاصد میں شامل ہیں۔ مثال کے طور پر اخلاق و صدق، بے عزتی غیرت و عزت، ضبط اوقات وغیرہ اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سر سید احمد خان نے مسلمانوں کی انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی معاملات تک تقریباً تمام شعبہ ہائے زندگی میں اصلاح و تجدید کا بیڑا اٹھایا۔ کالج کی سنگ بنیاد کے لیے 1876ء میں علی گڑھ ہو گئے تاکہ سکول کو کالج کے درجہ لے کر جایا جا سکے۔ مقصد کے اعتبار سے سید احمد چار قسم کے تعلیم یافتہ افراد کو پیدا کرنا چاہتے تھے۔

1: ایسے افراد جو اپنی تعلیم انگریزی میں مکمل کریں اور سرکاری عہدے اور اعزازات حاصل کریں۔

2: ایسا طبقہ جو انگریزی پر عبور حاصل کرنے کے بعد مغربی علوم کو انگریزی زبان سے اردو میں منتقل کریں تاکہ سمجھنے والے کے لیے آسان ہو جائے۔

3: جو اردو کی تعلیم حاصل کریں ان کا معیار بھی انگلستان کے بچوں کے برابر ہو تاکہ انہیں بھی اپنے علوم کے کو ترقی اور فروغ کا موقع میسر رہے۔

4: اور جو لوگ عربی اور فارسی میں مہارت حاصل کریں وہ مسلمانوں کے قدیم تہذیبی سرمایہ کو موجودہ اور آنے والی نسلوں تک پہنچانے کا کام کریں۔ لیکن اس کے برعکس جو طبقہ ایم اے او کالج کے بورڈ آف سینٹر پر قابض رہا انہیں صرف ایسے لوگوں سے دلچسپی رہی جو انگریزی زبان میں مہارت رکھتے تھے۔ اور سرکاری عہدوں اور اعزازات کے خواہش مند تھے۔ ہوا یہ کو ایم او کالج ایسے لوگوں کی خواہشات کا مرکز بن گیا۔[2]

ترقی اردو؛ سر سید احمد خان کے مذہبی افکار کی بات کی جائے تو وہ مسلمانوں کے کسی بھی طبقہ میں اس قدر مقبول نہ ہو سکے۔ لیکن اردو ادب اور مسلمانوں نے عقل و شعور پر دیکھا جائے تو اس کے گہرے کے اثرات مرتب ہوئے۔ انفرادی طور پر ان طلبہ پر اس بات کا گہرا اثر رہا جو ذاتی طور پر سر سید احمد خان سے وابستہ رہے۔

ان کی شخصیت میں وہی ذوق، علمی و فکری آزادی، جوش اصلاح اور وقار اور خودداری کی ایک نمایاں جھلک پیدا ہوئی۔ انہوں نے سید احمد خان کی اصلاحی تحریک کو جاری رکھنے کا لائحہ عمل ترتیب دیا۔ "خواجہ غلام ثقلین" انہوں نے مجاہدانہ قوت اور نیاز مندی سے اصلاح تمدن کی مہم کا آغاز کیا۔ اسی طرح "مولوی عبد الحق" نے "ترقی اردو" کا کام مبلغانہ حیثیت سے انجام دیا۔

---

1 شان محمد، ڈاکٹر، **سر سید تاریخی اور سیاسی آئینہ میں**، (ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، 1998ء)، ص 115

2 اصلاحی، ظفر اسلام، **سر سید احمد خان کا تصویر تعلیم**، (اسلامک بک فاونڈیشن: دہلی، 2001ء)، ص 158

اس ضمن میں سید عبد اللہ کا مضمون واضح اہمیت کا حامل نظر آتا ہے۔ جس میں انہوں نے وضاحت کی اور لکھتے ہیں کہ سر سید کی تحریک کا اثر "اردو ادبیات" پر بے حد اثر انداز ہوا۔ عملی اور سیاسی نقطہ نظر کے اعتبار سے بڑا بصیرت افروز ثابت ہوا اور آگے چل کر سیاست کو اس اردو تحریک نے بڑی تقویت بخشی۔ [1]

ادبی سرمایہ کے اعتبار سے سید احمد خان کی شخصیت کو دیکھا جائے تو ان کی شخصیت منفرد اور ممتاز نظر آتی ہے۔ سید احمد خان وہ اسے شخص تھے جنہوں نے ایک روایتی تقلید سے ہٹ کر ادب میں آزادی رائے کی تحریک کا آغاز کیا اور اس کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اور ایک ایسے مکتب فکر کی بنیاد ڈالی جس میں تہذیب، عقل اور مادی ترقی کو ایک بنیادی حیثیت حاصل ہوئی۔ دور جدید میں ترقی پسندانہ تحاریک اپنی خصوصیات کے لحاظ سے سید احمد خان کی حقائق نگاری اور عقلیت پسندی کی ایک ترقی یافتہ صورت رکھتی ہیں۔

صحافتی اثرات: سی سید احمد خان کی تحریک کے معاشرتی اعتبار سے ادبی اور صحافتی اثرات بڑے واضح اور جامد نظر آتے ہیں۔ ان کے قریبی رفقاء اور دیگر میں علی گڑھ سے وابستہ مصنفوں اور ادیبوں کی ایک فہرست ملتی ہے۔ جن میں نمایاں نام نواب عماد الملک، مولانا عبد الحلیم شرر، مولوی عبد الحق، مولانا حسرت موہانی، عبد المجید دریا آبادی، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، اور الیاس برنی، وغیرہ۔ [2]

صحافت میں الہلال، زمیندار اور ہمدرد کو ایک اہم مقام حاصل رہا۔ اکثر شعراء حضرت جو مخزن میں لکھنے والے تھے۔ ان کے کلام میں سید احمد خان کی روح جلوہ گر نظر آتی ہے۔

انجمن حمایت اردو؛ ایجوکیشن کمیشن میں ہندوؤں نے اردو مخالفت بھرپور طریقہ سے کی۔ پنجاب اور شمالی مغربی اضلاع کے ہندو اردو اور فارسی زبان کی مخالفت کرنے میں سب سے آگے نظر آئے۔

> " دونوں صوبوں سبھاؤں اور انجمنوں کی طرف سے موریل کمیشن پیش کئے گئے اس کے جواب میں سید احمد خان نے مسلمان دوستوں کی مدد سے پنجاب میں "انجمن حمایت اردو" قائم کی اور محضر اور موریل کمیشن میں بھیجے۔ اگر ادبیات اور تاریخ کے مطالعہ سے اس متنازعہ فیہ کے مسئلہ کا جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے۔ کہ ہندو اپنے مقصد کی وجہ سے ایک کام کی مزاحمت کرتے نظر آتے ہیں۔ جو انھیں مسلمانوں کے دور حکومت کی یاد دلاتا ہے"۔ [3]

سید احمد خان نے ان تمام خطرات کو محسوس جو آنے والے وقت مسلمانوں کو پیش آنے والے تھے۔ متحدہ قومیت کا تصور اور ایک اسلامی ریاست کا قیام ہی آگے جا کر سر سید احمد خان کی تحریک اور ان کی کوششوں کا اصل

---

1 سید عبد اللہ، ڈاکٹر، **ڈاکٹر سید عبد اللہ اور اردو کی خدمات**، (مقتدرہ قومی زبان: پاکستان، 2003ء)، ص 57

2 صدیقی، اقتدار حسین، **سر سید احمد خان کا تاریخی شعور**، (شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)، ص 251

3 حالی، **حیات جاوید**، (آئینہ ادب: لاہور) 1966ء، ص 104

مقصد ٹھہرا۔ انہوں نے برصغیر کے نوجوان نسل کی ذہنی رسائی حاصل کی اور تاریخ کے اصول تغیر حرکت اور نفاذ کا احساس پوری طرح سے پیدا کر دیا۔

سید احمد خان اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے لیے اپنی پوری قوت صرف کر دی اور ہندوؤں کے خفیہ منصوبوں اور تعصب پسندی کا تاریود بکھیر دیا۔ اگرچہ وہ آثار قدیمہ کے ماہر نہ تھے تاریخ اسلامی اور تاریخ کی جانب ان کی توجہ برطانیہ کا ہندوستان کے آثار قدیمہ سے شغف اور دلچسپی دیکھ پیدا ہوئی۔

آثار الصنادید؛ جو دہلی کی پرانی اور قدیم عمارتوں کے متعلق ہونے والی تحقیق مرکزی حیثیت کی حامل ہے اس کتاب میں عمارتوں کی تاریخ، تزائین آرائش اور ان کی پیائش کی تمام تفصیلات درج کی گئی ہیں۔ ابوالفضل کی "**آئین کبریٰ**" کی مدد اور مختلف مخطوطات سے انہوں نے مغل حکومت کی اصطلاحات کی بھرپور کوشش کی مختلف ضمیے اور تاریخ وار سکوں کی تصاویر کو بھی درج کیا۔ اور عربی سنسکرت اور ترکی زبانوں کا تجزیہ پیش کیا۔

خطبات احمدیہ؛ انہوں نے 1870ء میں خطبات احمدیہ کے نام سے اردو میں رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ پر مضامین شائع کئے۔

محمڈن ایجوکیشن کانفرنس 1895ء میں جو پروگرام ترتیب دیا گیا اس میں ایک شق یہ بھی تھی کہ پرانی دستاویزات فارسی مخطوطات کو تلاش اور جمع کرکے اس کی ترتیب وتدوین اوراشاعت کا کام کیاجائے۔ تاکہ تاریخ کے درست جائزہ کے لیے مواد میسر ہو اور اسلامی تاریخ اور تحقیق کو فروغ حاصل ہوا۔ اس کے لئے اردو، انگریزی ہندوستان اور یورب دونوں جگہ مضامین چھاپے جائیں تاکہ ان نظریات کی اصلاح ہو سکے جو یورپ میں رواج پا رہے ہیں۔ اس کام کے لیے **1863ء میں سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام** عمل میں لایا گیا۔ جس کا اراکین میں ہندو، مسلم اور عیسائی شامل تھے۔ سوسائٹی کے مقاصد میں ان کتب کا ترجمہ کرنا شامل تھا جو یورپ میں انگریزی زبان میں شائع ہوئیں۔ اور غیر زبان ہونے کی وجہ سے برصغیر کے لوگوں کا انہیں سمجھنا مشکل تھا۔ ان کا ترجمہ کرنا تاکہ وہ عام لوگوں کے استعمال میں آسکیں"۔[1]

اگر مقصدی اعتبار سے دیکھا جائے تو بات واضح ہوتی ہے۔ کہ سائنٹیفک سوسائٹی کے زریعے سے سید احمد خان ان علوم وفنون کی کتب کو اس قدر آسان اور بہم پہنچا دینا چاہتے تھے تاکہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم وتربیت کا بندوست ہو سکے۔ یہ کتب معاشیات، سیاسیات، تاریخ، جغرافیہ، زراعت اور منطق اور فلسفہ کے موضوعات پر مشتمل تھیں۔ سوسائٹی کا سب سے منفرد اور اہم کارنامہ "**علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ**" کا اجراء تھا۔ جو ہفتہ وار اخبار تھا جس کا اداریہ خود سر سید احمد خان لکھا کرتے تھے۔ یہ اخبار تقریباً 32 سال تک جاری رہا۔ اردو اور انگریزی دونوں متوازی کالموں

---

1 صدیقی، اقتدار حسین، **سر سید احمد خان کا تاریخی شعور**، ص155

میں یہ اخبار چھپتا تھا۔ تاکہ عوام اور حکام ایک دوسرے کے خیالات سے آگاہ ہوتے رہیں۔ اِس سوسائٹی کے زیرِ اہتمام سر سید احمد خان کی درجنوں نام انجمنوں کی رودادیں شائع ہوتیں جو بعد میں اس تحریک کا سنگ میل ثابت ہوئیں۔

انجمن ترقی مسلمانانِ ہند؛ سید احمد خان مسلمانوں کی تہذیبی اور سماجی حالت میں بہتری لانے کے لیے "انجمن ترقی مسلمانانِ ہند" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اسی ادارہ کے تحت ایک فنڈ محمڈن ایجوکیشنل فنڈ کمیٹی کا اجراء ہوا جس نے چندہ جمع کرنے کے کے لیے لوگوں سے امداد کی اپیل کی اور ساتھ ہی حکومت سے بھی امداد کی درخواست کی۔ "محمڈن اینگلو اورینٹل فنڈ کمیٹی" کا قیام 1865ء میں عمل میں آیا۔ کمیٹی نے یہ طے کیا ایک ایسا دارلعلوم قائم کیا جائے جس میں علوم مشرقی کی تعلیم پر زور دیا گیا ہو۔

> "**مدرستہ العلوم**" جس نے برصغیر کے مسلمانوں کے تاریخی ارتقاء میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کا افتتاح 1875ء میں ہوا۔ یہ سکول جو ابتدائی طور پر میٹرک اور پھر انٹر کی پڑھائی کے لیے کھولا گیا۔ 1878ء تک بی۔ اے، ایم۔ اے اور ایل ایل بی کے درجہ تک ترقی کر گیا اور اس کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی سے ہوا"۔[1]

برصغیر ہند میں یہ پہلی درس گاہ قائم ہوئی۔ جو ایک خاص اصول اور اسلوب پر قوم کی دلچسپی اور گورنمنٹ کی امداد پر قائم ہوئی۔ جن کو محبان وطن اور غیر اقوام کے اصحاب کی مالی اور اخلاقی معاونت حاصل رہی۔ 1920ء میں اس دارلعلوم کو نواب وقار الملک کی سرپرستی میں "**مسلم یونیورسٹی**" کا درجہ حاصل ہوا۔

> "**محمڈن اینگلو اورینٹل کالج** مع اپنے سرمایہ اور اقسام کے مسلم یونیورسٹی قلب میں ضم ہو گیا۔ لیکچر رر ومز نے لٹن لائبریری، اولڈ بوائز لاج، آرنلڈ ہاؤس اور دیگر عمارتیں تھیں جو طلبا کے لیے مخصوص ہوئیں۔ 105 اسکالرز جس میں 12 عربی کے لیے مختص کئے، 10 دینیات کے لیے، 12 سائنس وغیرہ کے لیے اس طرح "انجمن الفرض" کے وظائف بطور قرض حسنہ مختص کئے گئے۔ ایم۔ اے اور ایم۔ ایس۔ سی کے لیے معقول لیبارٹری بھی موجود تھی۔ اس کے علاوہ تفسیر اور انتظام تجوید اور دینیات کے نصاب کے درجات کا اہتمام بھی کیا گیا تھا"۔[2]

"**طبیہ کالج**" کا قیام 1927ء میں یوپی بورڈ آف میڈیکل کے الحاق سے عمل میں آیا۔ جہاں ایکس ریز، پیتھالوجیکل وکیمیکل لیبارٹریز، ریڈیو گرافک ورک اور میڈیکل ہال وغیرہ موجود تھا، ڈاکٹری اور طب کے ماہرین کو چھ روپے ماہانہ وظیفہ بھی ملتا تھا۔ اس کے علاوہ طلبا کے اشتراک سے "طبیہ کالج میگزین" بھی شائع ہونے لگا ہے۔ یہ تصاویر اور مضامین کے اعتبار سے ایک بہترین رسالہ تھا۔ "گنیش شارٹ ہینڈ" انسٹی ٹیوٹ کی ایک شاخ مسلم یونیورسٹی

---

1 زبیری، محمد امین، **مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مختصر تاریخ**، (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، 1933ء)، ص4

2 زبیری، محمد امین، **مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مختصر تاریخ**، ص15

میں قائم کی گئی جس میں کامرس ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جاتا رہا۔

"مسلم گرلز انٹر میڈیٹ کالج "1904ء میں یہ مدرسہ ایک کرایہ کی عمارت لے کر قائم کیا گیا۔ جہاں سب سے پہلے 9 لڑکیوں کا داخلہ ہوا لیکن آہستہ آہستہ اس میں اضافہ ہوتا گیا اور طالبات کی تعداد دو سو تک تجاوز کر گئی۔ 1913ء میں پہلے بورڈنگ ہاؤس کا افتتاح ہوا۔ اس سال نہ صرف ہندوستان سے طالبات نے داخلے لیے بلکہ عدن، بصرہ اور جنوبی اور شمالی پافریقہ سے بھی طالبات اس بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہوئیں۔ اس طرح خواتین کی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام وجود میں آیا"۔[1]

مسلمانوں کی سماجی اور ثقافتی اصلاح اور بیداری کے سفر میں سر سید احمد خان کی تحریک علی گڑھ نے دورس نتائج مرتب کئے۔ جس کے اثرات نے آنے والے زمانہ میں واضح طور پر نظر آئے۔ تجرباتی طور پر اگر سر سید احمد خان تحریک کو دیکھا جائے تو کامیابی کے درج ذیل اسباب واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

* انھوں معقول منصوبہ بندی کی اور ایسے طریقے جو قابل عمل تھے۔ پھر مستقل مزاجی اور مکمل جان سوزی سے اپنی منزل کی طرف گامزن رہے۔

* سید احمد خان کا یہ تہذیبی اور ثقافتی ترقی کا منصوبہ ترقی یافتہ ممالک کے اعلیٰ تجربات کا نتیجہ تھا۔ اور یونیورسٹیوں کے گہرے مطالعے کا سبب بھی تھا۔

* انہوں نے اعلیٰ تعلیم یافتہ اذہان کی خدمات کو حاصل کیا۔ *سائنٹیفک سوسائٹی قائم کر کے تالیف و تدوین اور مختلف تصانیف کے تراجم کے کام کا آغاز کیا جس سے اہل علم اور دانشوروں کی جماعت تیار ہو گئی جو عصری اور جدید خیالات سے بھرپور مضامین اردو اور انگریزی میں منتقل کرنے اور لکھنے لگے۔ اور بعد میں یہی جماعت سید احمد خان کے لیے ابلاغ و تبلیغ میں معاون ثابت ہوئی۔

* تحریک کے نشر و اشاعت کے لیے انہوں نے وسیع النظر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اثر ورسوخ رکھنے والے افرادس روابط قائم کئے۔ جو اس کی تہذیب و تنظیم میں بہترین مددگار ثابت ہوئے۔

* سید احمد خان نے تعلیم و تحقیق کی طرف قوم کو ابھارا، عزت نفس پیدا کی، غلط رسم ورواجوں کی بیخ کنی کی، مُسلمانوں میں جدوجہد کے جذبات کو ابھارا اور سچی لگن کا جذبہ بیدار کیا۔ امراء اور غرباء میں فرق مٹانے کی حتی المقدور کوشش کی۔

تحریک ریشمی رومال کے سماجی و تہذیبی اثرات

انگریز تسلط کے خاتمہ کے لیے مسلمان حریت پسند راہنماؤں نے انیسویں صدی میں غلامی کی زنجیریں کاٹنے

---

1 صدیقی، اقتدار حسین، **سرسید احمد خان کا تاریخی شعور**، ص97

میں جو کردار ادا کیا۔ اس کے اثرات برصغیر پر نمایاں ہوئے۔ تحریک ریشمی رومال کا ان میں ایک نمایاں کردار ہے۔ جو اپنے عوامل و عواقب اور نوعیت کے لحاظ سے ایک بے حد منفرد تحریک ہے۔ جسے "ریشمی رومال" سازش کا نام دیا گیا۔ اگر اختصار کے ساتھ اس کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے تو درجہ ذیل معاشرتی اور سماجی اثرات کی وضاحت ہوتی ہے۔ جو برصغیر کے مسلمانوں پر واضح طور پر مرتب ہوئے۔

* اسلامی دنیا کے مسلمان نمائندوں کے آپس میں روابط کی ابتدا۔
* ایک دوسرے سے اخلاقی تعاون اور برصغیر ہند کے حالات وواقعات سے آگاہی۔
* اسلام مخالف اور دشمنوں کی جاسوسی۔
* انگریز اداروں اور پالیسیوں کی سراغ رسانی۔
* تربیتی کیمپ اور امدادی مراکز کا قیام۔
* حکومتی حکمت عملی کی ترتیب۔

ان تمام پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تحریک کا مطالعہ کیا تو ان تمام عوامل کو پرکھنے کا موقع ملتا جس کے سبب علمائے برصغیر نے کانگریس کا ساتھ دیا لیکن آخر میں کانگریس میں ہندوؤں کی تنگ نظری اور مسلمانوں سے بے وفائی کے بعد ان سے الگ ہوئے۔ اس تحریک کے اسباب کا تذکرہ مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی کتاب "تحریک ریشمی رومال" میں کیا۔

1857ء کے بعد مسلمانوں کی بے کسی اور مظلومیت نے علمائے ہند کو جھنجھوڑا غدر کے ہولناک واقعے سے وہ پہلے ہی بہت آزردہ تھے۔ اور انگریزوں کے خون کے پیاسے تھے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ مدرسہ رحیمیہ جو شاہ عبدالعزیز کی تحریک کا مرکز تھا انگریزوں نے اسے مسمار کروادیا۔ اسی مدرسہ سے مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا احمد نو نگی، اور مولانا فضل الحق خیر آبادی، جیسے اہل علم اسی مدرسے سے فارغ التحصیل تھے۔

اس جدوجہد میں وہ راہنما ہیں جو جید اور جری نظر آتے ہیں۔ اور سید احمد شہید کی تحریک سے متاثر ہو کر اپنی قوم میں ایک نئی روح بیدار کی۔ اسی جرم کی سزا میں انہیں قید بامشقت اور پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ مولانا فضل الحق خیر آبادی کو کالے پانی کی سزا سنائی گئی اور وہاں ہی ان کا انتقال ہوا۔ علماء سے نمٹنے کے بعد انگریز حکومت نے مسلمان حریت پسندوں اور مسلمان ریاستوں کے خاتمے کی طرف پیش قدمی کی۔ اور چترال پر قبضہ کے بعد کابل پر حملہ کیا۔ اور اس طرح مسلمان ریاستوں کو آپس میں لڑوا کر ایک سازش کے تحت نہر سوئز پر قبضہ کیا۔ اسکندریہ پر حملہ کرنے مصر اور سوڈان کو ایک صوبہ بنالیا گیا۔

ایران کے خلاف بھی سازش کی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شمالی ایران روس جبکہ جنوبی ایران انگریزوں کے ماتحت چلا گیا۔ پھر سوریا، بلغاریہ اور مونٹی نیگرون وغیرہ نے روس کے کہنے پر بلقان پر حملہ کیا۔ جس میں ہندوستان نے

بلقان کی مدد کی۔ اس طرح مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر انصاری ایک وفد سمیت ترکی اور اسلامی دنیا سے روابط میں اضافہ ہوا۔[1]

تحریک ریشمی رومال کے آغاز کی بات کی جائے تو یہی وہ وقت تھا جب مولانا محمود الحسن کی سربراہی میں اس تحریک کا آغاز کیا گیا۔ اور ان کا منصوبہ کئی اہم حصوں پر مشتمل تھا۔ مولانا محمود الحسن نے اقوامِ عالم کی اخلاقی امداد اور انھیں ہندوستان کے حالات سے آگاہ کرنے کے لیے پانچ سفارشیں تیار کیں۔ اس مشن کے تحت مولانا حبیب الرحمٰن کو چین اور برما بھیجا۔ اور انگریزی مترجم کے حیثیت سے مولانا شوکت علی جن کا تعلق بنگال سے تھا ان کا انتخاب کیا گیا۔ ایک وفد پروفیسر برکت بھوپالی کی سربراہی میں جاپان بھیجا گیا۔ یہ جاپانی اور جرمن زبان پر عبور رکھتے تھے۔ اور چودھری رحمت علی کی قیادت میں ایک مشن فرانس بھیجا گیا۔

جبکہ ایک منصوبہ یہ بھی رہا کہ دشمن کی جاسوسی اور ان کی فوج میں جاسوس مقرر کرنا اور جنگی نقشہ تیار کیا جائے تاکہ اس کے مطابق جنگ کی تیاری کی جاسکے۔ مولانا عبید اللہ کا انتخاب اس کام کے لیے کیا گیا اور شیخ محمد ابراہیم جو انگریزی میں بی۔ اے تھے انہیں بھی اس کام کے لیے مولانا عبید اللہ سندھی کے لیے ساتھ منتخب کیا گیا۔ ڈاکٹر انصاری نے کئی افراد کو فوج میں بھرتی کروایا۔ مولانا عبید اللہ سندھی کی قیادت میں ایک کورس کا انعقاد کیا گیا۔ جن میں 80 افراد میں سے صرف 19 افراد فرج میں بھرتی کے اہل قرار پائے۔[2]

عارضی حکومت کا اجمالی خاکہ

مولانا محمد میاں لکھتے ہیں کہ ایک عارضی حکومت کا اجمالی نقشہ بھی تیار کیا گیا۔ اور اس کے تحت اراکین اور عہدہ داروں کا تعین بھی کیا گیا۔

> "ان عہدہ داروں میں ہندو اور مسلم اراکین شامل ہوں گے۔ جس میں وزیر اعظم کے لیے مولانا برکت اللہ اور چیف کمانڈر مولانا محمود الحسن اور ان کے ماتحت کمیٹی میں مولانا عبید اللہ سندھی اور دیگر اراکین کی کابینہ ہو گی۔ اسی طرح ملک میں دیگر مقامات پر "بغاوت مراکز" قائم کیے گئے۔ اور رضاکار بھرتی کیے گئے۔ اور عوام میں انقلاب کی خفیہ تحریک چلائی گئی۔ کراچی، قلات، مس بیلا، دین پور اور بہاولپور ریاست کا مرکز تھا۔ اسی طرح بنگال میں اسی طرح کے کئی مراکز قائم کیے گئے۔ جن کا مقام نامعلوم رہا"۔[3]

"بیرون ملک" امدادی مراکز کام کیے۔ انقرہ، استنبول، برلن اور قسطنطنیہ میں یہ مراکز قائم کیے گئے اور وہاں لوگ کام کرتے رہے۔ امیر حبیب اللہ خان نے بظاہر مسلمانوں کی مدد کی لیکن پس پردہ وہ انگریزوں سے مل گئے

---

1 مدنی، حسین احمد، مولانا، **تحریک ریشمی رومال**، (مکتبہ محمودیہ کریم پارک، لاہور، 1993ء)، ص 217

2 مدنی، حسین احمد، **تحریک ریشمی رومال**، (مکتبہ محمودیہ کریم پارک، لاہور) ص 153-154

3 سید محمد میاں، مولانا، **تحریک شیخ الہند**، (مکتبہ رشیدیہ، 2001ء)، ص 94

اور مخبری کی۔ اپنوں کی غداری کی وجہ سے وہاں یہ تحریک ناکام ہوئی۔ لیکن اس کے باموجود نصر اللہ خان اور نادر خان اور امان اللہ خان اس بات سے آزردہ نہ ہوئے اور امیر حبیب اللہ کے قتل کے بعد مولانا عبید اللہ سندھی کو مشیر بنانا گیا۔ اور شدید مذمت کے باوجود 1919ء میں افغانستان کو انگریز حکومت آزاد کرایا گیا۔ مولانا محمد علی جوہر نے کراچی میں حسین احمد مدنی سے ملاقات کی اور انہیں اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ امریکہ کو ترکی کا حمایتی بنایا جائے۔ لیکن شیخ الہند محمود الحسن نے اس بات سے اختلاف کیا کہ امریکہ ہر حال میں برطانیہ کا ساتھ دے گا۔ اور بعد میں یہی ہوا۔[1]

ہندوستانی اندرون محاذ پر بغاوت ہندوستانی انقلابیوں کے ذریعے سے متوقع ہوئی تھی افغان حکومت سے جو معاہدہ ہوا اور جس تاریخ کو افغانستان سے حملہ ہونا تھا اس تاریخ کا تعین اور اطلاع اور حملے کی تیاری یہ سب ایک بڑے رومال جس کی لمبائی تقریباً ایک گز کے قریب تھی اس پر یہ عبارت بن دی گئی تھی۔ امیر حبیب اللہ اور اس کے بیٹوں کے دستخط بھی موجود تھے۔ یہ خط "محمود الحسن" کو مدینہ منورہ میں ملنا تھا اور اسی کے مطابق ترکی حکومت سے بات چیت کو آخری شکل دے کر 1917ء میں کابل کے ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دینی تھی۔ 19 فروری تک ہندوستان کے ہر محاذ سے بغاوت کا علم بلند ہونا تھا۔ کہ ریشمی خط پکڑا گیا اور انگریزی انگریزوں نے افغانستان کے تمام راستے بند کر دیئے۔ شیخ الہند مدینہ منورہ میں ہی ٹھہر گئے یہ تمام اسکیم فیل ہو اور وہ حجاز سے ہی گرفتار ہوئے۔ اس کی تفصیل حسین احمد مدنی نے لکھی ہے۔

> "ہندوستان کی آزادی کے لیے ایک مرکزی جماعت اور تحریک کا آغاز کیا گیا جس کے امیر "شیخ الہند محمود الحسن" کو مقرر کیا گیا اس کا پہلا نام "ثمر التربیہ" اور پھر جمعیت الانصار رکھا گیا۔ یہی تحریک آگے جاکر تحریک ریشمی رومال ہوئی۔ جس کے نائب مشیر مولانا عبید اللہ سندھی مقرر ہوئے"۔[2]

تلخیص بحث

سید احمد خان کی تحریک علی گڑھ نے تعلیم و تحقیق کی طرف قوم کو ابھارا، عزت نفس پیدا کی، غلط رسم و رواجوں کی بیخ کنی کی، مُسلمانوں میں جدوجہد کے جذبات کو ابھارا اور سچی لگن کا جذبہ بیدار کیا۔ امراء اور غرباء میں فرق مٹانے کی حتی المقدور کوشش کی۔ تحریک ریشمی رومال کی تفصیل کا ذکر اس لیے بھی کہ گیا کیا کہ اس کے اثرات مسلمانوں کی ثقافتی اور سماجی اور سیاسی زندگی پر مرتب ہوئے۔

تحریک پاکستان پر بھی اس تحریک کا گہرا اثر رہا۔ ایک خود مختار مملکت اور آزاد علاقے ہر جگہ اس تحریک کے

---

1 مدنی، حسین احمد، مولانا، **نقش حیات**، (جلد دوم)، ص199

2 مدنی، حسین احمد، مولانا، **تحریک ریشمی رومال**، ص192

مجاہدوں کی یاد دلاتے ہیں۔ "جمعیت علمائے ہند" کی جدوجہد بھی اسی تحریک کا نتیجہ ہے۔ اسی تحریک کے نتیجہ "تحریک احرار" وجود میں آئی۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی اس جہت میں مسلمان راہنماؤں کی ایک طویل فہرست میں جنہوں نے مسلمانوں کی سماجی اور ثقافتی مذہبی اور سیاسی حالات میں بہتری پیدا کرنے کے لیے نمایاں کردار ادا کیے۔ مولانا عبداللہ سندھی کی ڈائری کے مطالعہ سے ایک اہم نقطہ کی وضاحت ہوتی ہے۔

یہ تحریک ہندوؤں کی سازش اور تعصب کا شکار ہوئی۔ جو تمام کاروائیوں کا احوال انگریز حکومت کو پہچانتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر ترکوں کے حملے سے انگریز یہاں سے چلے گئے تو اگلے حکمران مسلمان ہی ہوں گے۔ اگر اس پہلو پر نظر رکھی جاتی تو ہندوستان میں آج مسلمان نمایاں اور الگ حیثیت سے زندگی گزار رہے ہوتے۔ اور ایک قومی حیثیت سے نمائندگی کرتے۔ اس ضمن میں علامہ اقبال، مولانا جوہر علی خان، مولانا ظفر علی خان اَبوالکلام آزاد اور دیگر رفقاء اپنی اپنی سمتوں میں نمایاں کرداروں کے ساتھ نظر آتے ہیں جنہوں نے اصلاح معاشرہ میں اپنی خدمات سرانجام دیں۔

فصل دوم

سیاسی فکر پر اثرات

اسلام نے حصول علم کی جو ترغیب دی اور اس کے حصول کو جس طرح مومنین کی معراج قرار دیا اور ترقی و تربیت کا انحصار حصول علم کو قرار دیا۔ اس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ علم حاصل کرنے کے دو اہم ذرائع ہیں۔ ایک عالم فطرت اور استفادہ کے دوسرے طریقے پر نگاہ ڈالی جائے تو دوسرا عالم تاریخ ہے۔ چنانچہ ان دونوں سے بہرامند ہو کر ہی اسلام کی بہترین روح کا اظہار ہوا۔ اور قران حکیم نے بھی اسی طریقہ تحقیق اور مطالعہ پر زور دیا۔

﴿اھ◌ْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَــقِيْمَOصِرَاطَ الَّذِي◌ْنَ اَن◌ْعَم◌ْتَ عَلَي◌ْهِم◌ْOغَي◌ْرِ
ال◌ْمَغ◌ْضُو◌ْبِ عَلَي◌ْهِم◌ْ وَلَا الضَّا◌ّلِّي◌ْنَ﴾1

(ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے احسان کیا نہ کہ ان کا راستہ جن پر غضب ہوا اور نہ بھکے ہوؤں کا)۔

ان آیات سے اس بات کا بھرپور عکاس ہوتا ہے کہ دنیا میں دو ہی طرح کے لوگ ہیں۔ ایک قسم کا تعلق سیدھی راہ پر چلنے والے اور دوسرے وہ لوگ جو ظالم اور گمراہ ہو گئے۔ اور انہیں ذلت اور مصائب اٹھانے پڑے مطالعہ سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے جنہوں نے انسانوں کی فلاح اور خدمت کی راہ اختیار کی ان کا نام اور مقام روشن ہوا اور جنہوں نے غلط راستہ کا انتخاب کیا وہ گمراہ رہے۔ امم اور اقوام عالم کی بات کی جائے تو ان کا محاسبہ انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح سے کیا جاتا ہے۔ اور قران حکیم نے بار بار اس جانب توجہ مبزول کروائی ہے۔

﴿قَد◌ْ خَلَت◌ْ مِن◌ْ قَب◌ْلِكُم◌ْ سُنَنٌ فَسِي◌ْرُو◌ْا فِي ال◌ْاَر◌ْضِ فَان◌ْظُرُو◌ْا
كَي◌ْفَ كَانَ عَاقِبَةُ ال◌ْمُكَذِّبِي◌ْنَ O هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَو◌ْعِظَةٌ
لِّل◌ْمُتَّقِي◌ْنَ﴾2

(تم سے پہلے کچھ طریقے برتاؤ میں آچکے ہیں تو زمین میں چل کر دیکھو کیسا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا۔ یہ لوگوں کو بتانا اور راہ دکھانا اور پرہیز گاروں کو نصیحت ہے)۔

طرز فکر اور طرز سیاست میں تبدیلی

اس آیت میں بے حد خوبصورت انداز میں اس بات کی نشاندہی کی گئی کہ تاریخ کا مطالعہ جب کیا جائے علمی نہج پر کیا جائے۔ کتاب اللہ مسلمانوں کے لیے فلسفہ، تاریخ کا سرچشمہ ہے اور تاریخ ہی کسی قوم کا اصل رخ متعارف

---

1 الفاتحہ 1:5-7

2 آل عمران 3:137-138

کرواتی ہے۔ تاریخ اسلامی اور اس میں خاص طور پر برصغیر پر ہونے والی سیاسی اثرات اور اس کی تاریخ کی بات کی جائے تو نمایاں شخصیت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ کی ہے۔ جن کی تحریک تجدید برصغیر کے آنے والے وقت میں روشن تعبیر ثابت ہوئی اور انیسویں بیسویں صدی کی ایک لمبی فہرست جنہوں نے مختلف جہات میں اپنے افکار و نظریات کا اظہار کیا اور آنے والے زمانہ پر جس کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ان میں مولانا عبید اللہ سندھی برصغیر کی سیاسی فکری تحریک میں حضرت مجدد کی اولیت کا اعتراف کرتے ہیں۔

"غرض یہ کہ امام ربانی شاہ ولی اللہ کے طریقہ کے ارپاص اور اسی روشنی میں ہم اپ کے اس ارشاد کو حل کرتے ہیں اور مجھے ایک عظیم کارخانہ حوالہ کیا گیا اور مجھے میری مریدی کے لیے متعین نہیں کیا گیا میری تخلیق کا مقصد خلقت کی محض تکمیل و ارشاد نہیں بلکہ کوئی اور معاملہ مقصود ہے اور کوئی دوسرا کارخانہ مطلوب ہے۔ تکمیل و ارشاد کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جیسے رستے کی کوئی پڑی ہوئی چیز"۔[1]

مسلم ہندوستان نے فکری، سیاسی اور تحریکی تاریخ میں مجدد الف ثانی، خواجہ معین الدین چشتی، شیخ عبد الحق سید محمد مہری جونپوری، شاہ ولی اللہ اور علامہ اقبال جیسے مفکرین ملت پیدا کیے۔ جو صرف برصغیر میں ہی مقبول نہ تھے بلکہ اقوام عالم میں مشہور ہوئے۔ جنہوں نے خود اعتمادی اور خودی کی عظمت کی فکر کو بیدار کیا۔

جسے بقول (Brown) مجدد الف ثانی کے افکار کی اشاعت ہی کی بدولت مسلمانوں کے اندر فکری، سیاسی افکار کی روح بیدار ہوئی۔ ان کی تحریک بڑی جامع اور وسیع تھی جس کی وجہ سے مسلمان ہند اس وقت کی خرابیوں اور گمراہیوں کے سیاسی اور اقتصادی خطرات سے اگاہ ہوئے۔[2]

حضرت مجدد نے اپنی تحریک میں سب سے پہلے علمی اصلاح کی اور اس کے بعد حکومتی اصلاح کے لیے قدم اٹھائے۔ معاشرتی اصلاح کے سلسلہ میں صوفیا نے جو ہندو فلسفہ اور مبالغہ انگریزی کو شامل کر لیا تھا۔ اور شریعت اسلامیہ کو پس پشت ڈال رکھا تھا۔ حضرت مجدد نے اس کی طرف توجہ ملوکیت میں مسلمان بادشاہوں نے خود کو فاتح اور حاکم وقت کی حیثیت سے محدود رکھا لیکن قلو میں اسلامیہ اور شریعتی اقدار کو فروغ دینے کے لیے کوئی خاص توجہ نہیں دی بڑے تعلیمی اداروں اور درسگاہوں کی جانب کبھی توجہ نہ رہی اسی جمود میں کبھی کسی گوشہ سے اصلاح احوال کی کوئی آواز بلند ہو جاتی تھی۔ لیکن اس میں سب سے بااثر آواز مجدد الف ثانی اور اس کے بعد اسی تحریک کو شاہ ولی اللہ نے اگے بڑھایا۔[3]

سید ابوالحسن ندوی نے شاہ ولی اللہ کی شخصیت کے حوالہ سے لکھا۔

---

1 احمد سرہندی، **مکتوبات امام ربانی**، دفتر دوم، مکتوب ششم

2Brown, The Darvashes, **In Islam's Muslim Rules in India**, Muqtadira Islamrabad, 1997, P, 300

3 عبید اللہ سندھی، **شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک**، ص42

> "The reformatory work undertaken by Shah Wliullah was bot wide & varied in nature, it predominant was intellectual and acdemic it comprised instruction, penmanship, propagation of the scripture in addition sunnah. The shah explained the wisdom of the religion's teaching showed the compatibility of transmitted knowledge with intellection as well as interrelation of different juristic schools, which provided guidance to the coming generations. Realizing significance of the changing political scene in India and making a realistic estimate of the then decent trends, his make efforts to conserve the power of Islam and identity of Muslims. He tried to revive Islamic disciplines for the benefit of coming gestations".[1]

اگر دنیا کے چند بڑے مفکرین جنہوں نے اسباب و علل کا جائزہ لے کر اپنے افکار کی روشنی میں سیاست اور حکومتی معاملات اور حکومتی نظریات پر بحث کی ہے۔ اور انسانی اقدار کو آگے بڑھایا ہے۔ اور اسلامی افکار کا دیگر افکار سے تقابلی جائزہ پیش کیا۔ اور اسلامی تشکیل جدید کے جو سیاسی افکار و نظریات میں ان پر مباحث پیش کی ان میں ابن رشد، ابن تیمیہ اور امام غزالی ہیں۔ اور بقول مولانا شبلی نعمانی شاہ ولی اللہ نے سیاسی افکار کی ترویج کو نئے اسلوب کے تحت فروغ دیا۔[2]

اسلام کے سیاسی افکار کے حوالہ سے برصغیر میں شاہ ولی اللہ کو سیاسی افکار کا امین کہا جاسکتا ہے کیوں کیونکہ انہوں نے اس وقت مسلمانان ہند کی سیاسی شان و شوکت کو رخصت ہوتے اور سلطنت عثمانیہ کو اپنی آخری سانسیں لیتے دیکھا۔ عرب سب الگ ہو چکے تھے اور دوسری جانب فرانس برطانیہ اور برطانیہ کی حدود سے نکل کر استعمار برصغیر کے دروازے پر دستک دے رہے تھے ان کا تعلق ایک ایسے دور سے ہے جب پوری امت مسلمہ علمی و فکری طور پر ایک خاص دوراہے پر کھڑی تھی۔ جس کے ایک جانب ماضی تھا تو دوسری جانب قوم کا مستقبل تھا اس حوالہ سے شاہ ولی اللہ کی سیاسی فکر ایک معیار تصور کی جاسکتی ہے۔ جنہوں نے اسلام کے سیاسی افکار کو آنے والے زمانوں میں منتقل کیا۔ جس کو سیاسی و ملی تناظر میں ولی الہی تحریک عمل تواتر سے جانچا اور دیکھا جاسکتا ہے۔ سیاسی تناظر میں ان کے علمی کام کو بنیادی طور پر تین مصادر میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

حجۃ البالغہ میں شاہ ولی اللہ نے سماجی اور ثقافتی علوم کے تناظر میں ایک خاص اصطلاح " ارتقاقات " کی کے تحت گفتگو کی ہے۔ جس سے مراد آسانی اور آسائش سے زندگی گزارنے کی مفید اور جامع تدابیر ہیں۔ جب کہ

---

1 Abul Hassan Nadvi, **Saviors of Islamic Spirit**, Volume, iv, Hakim-ul-Islam Shah Waliullah (Academy of Islamic Research & PublicityNadw: India), P 178

2 نعمانی، شبلی، مولانا، **علم الکلام**، (مسعود پبلشنگ ہاؤس: کراچی، 1976ء)، ص87

مکتوبات دہلوی اپنے دور کے سیاسی حالات سے واقفیت، سیاسی بصیرت، جہادی و انقلابی فکر اور عملی حکمت عملی کے اعتبار سے اسلام کے ایک نمونہ مکتوب ہیں۔ جن میں انہوں نے بادشاہ وقت کو مخاطب کر کے اسلام کی جدوجہد اور شوکت اسلام کو ابھارا ہے۔ انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا۔

"اس زمانے میں ایک ایسا بادشاہ ہو جو مخالفین کے لشکر کو شکست دینا جانتا ہو جو دور اندیش ہو اور صاحب اقتدار ہو اور اس وقت سوائے جناب کے اور کوئی موجود نہیں۔ یقینی طور پر اپ جناب پر یہ فرض ہے مرہٹوں کا تسلط توڑنا اور ہندوستان کا قصد کرنا اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے تسلط سے ازاد کروانا"۔[1]

شاہ ولی اللہ نہ صرف ایک مذہبی مصلح بلکہ سیاسی طور پر ایک مبلغ اور رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جنہوں نے اس بات کو ابھارا کے معاشرتی نظام کے تحت اسلام کا نصب العین ہی ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس کے بغیر تمام مسلمانوں کی زندگیاں بے ضابطہ ہیں۔

اسی طرح "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" کی نفسیات کو دیکھا جائے تو اسلام نے جو سیاست کے اصول و مبادی دیے انہی اصولوں کو خاص طور پر خلافت کبری کو خلافت راشدہ کی روشنی میں واضح کیا۔

"Caliphate "Aam" is the caliphate where Islamic rules and regulations should be called against established should be and regu jihad ation enemies establishment of Bait-ul-Mall judical system should be intact and department of "Amr Bi.d-Marula & Nahi-un-al Munkar Should be there".[2]

فکریات اسلام کے تناظر میں شاہ ولی اللہ نے متعدد بار اس عنوان کو مفصل ذکر کیا۔ اور اس بات کی وضاحت کی کہ اصلاح عالم کے لیے اگر تم سن سکتے ہو تو اس باریک نکتہ کو سنو کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو نیکی کی ترغیب اور برائی سے دور کرنے کے لیے کوئی اصلاح مقرر کر دیتا ہے۔ اور اصلاح امم کو ترک نہیں کیا جا سکتا اسی فکر کو برصغیر میں انے والے زمانہ میں فروغ حاصل ہوا جس کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ اقبال نے لکھا کہ:

"اسلام ہی مذہبی نصب العین کے تحت ایک معاشرتی نظام ہے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے۔ اگر مذہبی نصب العین کو ترک کیا جائے تو دوسرے کا ترک ہونا لازم ہے۔ اس لیے کوئی بھی مسلمان کسی ایسے نظام معاشرت پر غور کرنے کو امادہ نہیں ہو سکتا جو وطنی اور قومی پر مبنی ہو اور اس اسلامی اصول و ضوابط کی نفی کرتا ہو"۔[3]

برصغیر میں شاہ ولی اللہ کی ملی و سیاسی تحریک کہ عملی تواتر میں برصغیر ہند انیسویں اور بیسویں صدی کے لیے اسلامی نشاۃ ثانیہ کا دور رہا ہے۔ جنگ آزادی کے بعد ایسے حالات پیدا ہوئے جس میں اس بات کو شدت سے محسوس کیا گیا اصلاح فکر اور تطہیر فکر کی عملی صورت درکار ہے۔ اس کے لیے علماء فقہاء نے اپنی زندگیاں اس کام میں صرف

---

1 نظامی، خلیق احمد، **مکتوبات: شاہ ولی اللہ**، (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 1978ء)، ص97

2Shah Wiliullah Dehlvi, **Izalat-ul-khufa** (Qadimi Kutbkhana : Karachi), 2005, P, 13

3 محمد اقبال، **اسلام کے سیاسی تصورات**، (نفیس اکیڈمی، حیدرآباد: دکن، 1998ء)، ص230

کر دیں۔ اور انسانیت کی فلاح کے لیے مختلف جہات کی صورت اپنی اپنی خدمات کو پیش کیا جن کا تذکرہ مذکورہ بالا باب میں کیا گیا ہے۔ جنہوں نے فکر اسلامی کی تشکیل جدید میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انہیں اشخاص کی فکر سے اٹھنے والی تحاریک کے اثرات برصغیر ہند پر مذہبی، سیاسی اور ثقافتی انداز میں اثر انداز ہوئے۔ مسلمانوں نے کئی صدیوں تک برصغیر پر حکومت کی۔ اور 1857ء کی جنگ ازادی کے بعد اسلامی اقدار کو ہر طرح سے ٹھیس پہنچائی گئی لیکن علماء و مفکرین ہر طرح کے فکری وار کاڈٹ کر مقابلہ کیا۔

متحدہ ہندوستان کے اخری دور میں یہ تحریک اسلام کے مذہبی، ثقافتی اور سیاسی غلبہ اور مسلم حکومت کے قیام کے لیے میدان عمل میں آئیں تاکہ مسلمانوں کو ہر طرح کے استحصال سے بچایا جاسکے۔ ان نمایاں تحاریک میں تحریک مجاہدین، تحریک علمائے دیوبند، تحریک علی گڑھ، تحریک خلافت، تحریک ریشمی رومال، تحریک تبلیغ اور تحریک جماعت اسلامی ہیں۔ ان تحاریک کے مقاصد میں اللہ تعالی کی حاکمیت اعلی کا قیام قران وسنت کی بالادستی مجلس شوری کا قیام امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ترویج اور عدل وانصاف کی فراہمی بدعات کارد وغیرہ شامل تھا۔ انہی مقاصد کے تحت ان تحریک نے کام کیا۔

سیاسی شعور اور تحریک جہاد

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے خاندان نے برصغیر ہند میں اسلامی حکومت کے اجراء اور احیائے مذہب کا علم ہمیشہ بلند رکھا۔ اور انہی کے خاندان سے شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد بریلوی نے فکری اصلاح اور تطہیر کو سیکھا۔ اس تحریک کے برصغیر پر واضح اثرات مرتب ہوئے اور مسلمانوں نے دوبارہ حکومت اسلامیہ کے قیام کی جدوجہد کا اغاز کیا۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

> "تحریک مجاہدین درحقیقت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے مساعی کا ایک سلسلہ ہے۔ جنہوں نے معاشرتی اصلاح کا بیڑا اٹھایا"۔[1]

سید ابو الحسن ندوی نے استدلال کیا ہے کہ سید صاحب کی اس تحریک کا مقصد کوئی نفسانی خواہش یا غرض نہ تھا بلکہ افراد انسانی کے درمیان رب العالمین کے احکامات کو جاری کرنا تھا۔ سید احمد شہید نے بخارا کے بادشاہ کو خط لکھا کہ اس تحریک کا مقصد یہ ہے جب اسلامی خطوں پر غیر مسلم مسلط ہو جائیں تو مسلمان حکمرانوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے خلاف جدوجہد کا علم بلند کیا جائے نہیں تو مسلمان گنہگار ہوں گے اور ان کے اعمال صالح بھی اللہ کے ہاں مقبول نہ ہوں گے۔[2]

---

1 مودودی، سید ابو الاعلی، **تجدید احیائے دین**، ص114

2 ندوی، ابو الحسن، **سیرت سید شہید**، (مکتبہ اسلام لکھنؤ، 1968ء)، ص116

مسعود عالم ندوی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا سید اسماعیل جب دہلی کے لوگوں سے مخاطب ہوتے تھے تو اپ کی تقریر سے مسلمان اس طرح اللہ کی راہ میں سر گرم عمل ہوا دیکھ کے بے اختیار ان کا دل چاہنے لگا تھا کہ وہ اپنا سر اللہ کی راہ میں قربان کر دیں مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں کہ سید اسماعیل کے دوروں کا یہ اثر رہا کہ بنگال کی سر زمین 30 سے 40 سال تک مجاہدین کے لیے روپے اور آدمیوں سے مدد ہوتی رہی۔[1]

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا کہ:

"اس کا اثر یہ ہوا کہ پٹنہ کے انگریز حکمرانوں کو تباہ کرنے اور نقصان پہنچانے میں سید احمد شہید ان کے لیے اور ان کی جماعت کے لیے ایک نمونہ تھے اور یہ انہی کا کام تھا کہ انہوں نے اپنے ہزاروں ہم وطنوں کو اللہ تعالی کے متعلق بہترین تصور پیدا کرنے کی تربیت فراہم کی"۔[2]

اس تحریک نے جان ومال کی بے شمار قربانیاں دیں اور اس سفر میں ایک طویل مسافت کو طے کیا اور باقاعدہ طور پر پشاور کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اور اس آزاد علاقہ میں پہلی اسلامی حکومت قائم کی۔ شہر میں داخل ہوتے ہی امن کا اعلان کیا۔ اور اس بات کا اعلان کر دیا گیا کہ کوئی بھی چیز بلا قیمت نہ خریدی جائے۔ شہر کی دوکانیں کھل گئیں شراب کی دوکانوں کو بند کر دیا گیا۔ شریعت اسلامی کے احکامات جاری ہوئے۔ عشر اور زکوٰۃ کا نظام قائم ہوا۔ اور نماز کی ادائیگی نہ کرنے والوں پر تعزیر مقرر ہوئی۔ بالا کوٹ میں آپ کی شہادت کے ساتھ یہ حکومت ختم ہوئی لیکن مسلمانوں کے اندر اصلاح فکر اور ایک نئے عزم کو بیدار کر گئی۔

بر صغیر میں سید احمد خان کی شخصیت ایسی رہی کہ انہوں نے ہمیشہ حقیقت پسندی سے کام لیا۔ اشتعال انگیزی ہنگامہ خیزی اور جذباتیت سے ہمیشہ دور زندگی گزاری۔ متانت استقلال غور و فکر اور تدبر جیسے طرز فکر کے حامی رہے رومانوی طرز فکر کی ہمیشہ مخالفت کی۔ حقائق کا غیر جانبداری سے مطالعہ اور پھر برسوں کے غور و فکر اور تدبر کے بعد کہے نتائج ہی ان کی زندگی کا اعتبار رہا۔ اور ان کی تدبرانا شخصیت نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ اب انے والا وقت انگریز حکومت کا ہے اور مغلیہ حکومت کا خاتمہ یقینی ہے انہوں نے دہلی کی پرانی عمارتوں میں "آثار الصنادید تھا" کبھی تو اس میں اس کی مکمل وضاحت پیش کی۔

"اور اس بات سے استدلال کیا کہ جب سپہ سالار انگلش نے ہندوستان کی سلطنت میں شایان شان انگلستان قائم کیا تمام مسلمان نانے ہند یہ بات جان لیں کہ اب مغلیہ سلطنت کا اقتدار ختم ہوا اور اب بادشاہت انگلستان کی ہے۔ اس لیے تمام رعایا کو اپنے بادشاہ کی خیر خواہی کرنی ہے"۔[3]

---

1 ندوی، مسعود عالم، **ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک**، (مکتبہ ملیہ اردو بازار: راولپنڈی)، ص 22

2 ڈبلیو ڈبلیو ہنر، مترجم صدیق حسن مکی، **ہمارے ہندوستانی مسلمان**، (دار الکتب: لاہور)، ص 43

3 سر سید احمد، خان لال محمڈن، **رسالہ خیر خواہان مسلمان**، (سر سید اکیڈمی: علی گڑھ، 1998ء)، ج 1، ص 13

1857ء کی تحریک بغاوت کے بارے میں انہوں نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا یہ کوئی منظم تحریک بغاوت نہیں ہے بلکہ ان جمع شدہ شکایات کا اظہار ہے جو انگریزوں کے خلاف جمع ہوتی ہیں جس میں حکومتی انتظامات میں ہندوستانیوں کو شامل نہ کرنا تہذیبی اور مذہبی معاملات میں عیسائی پادریوں اور مشینریوں کی دخل اندازی عام ہندوستانی لوگوں کی توہین مذہبی احکامات کے خلاف نام موزوں قوانین کا اجراء انگریزی حکومتی احکام کی تند مزاجی یہ وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے برصغیر کے لوگوں نے بے زاری اور تنفر کا اظہار کیا۔ اس لیے کہ ایسی بہت سی باتیں تھیں جو لوگوں کے دلوں میں جمع ہو گئی تھیں اور فوجی بغاوت نے اس میں مزید اضافہ کیا۔[1]

> "سر سید احمد خان نے 1859ء میں اسباب بغاوت ہند لکھی کر اس بات کو دلائل کے ذریعے سے ثابت کیا کہ 1857ء کی تحریک بغاوت کوئی ایک سوچی سمجھی یا منظم سازش نہ تھی بلکہ ان تمام زیادتیوں کا رد عمل تھا جو ہندوستانی باشندوں کے ساتھ کی گئی یہ نہ کوئی مذہبی جہاد تھا کیونکہ مسلمان انگریزوں کی عمل داری رہ کر جہاد نہیں کر سکتے اور نہ اس کی ذمہ داری برصغیر کے لوگوں پر ڈالی جا سکتی ہے"۔[2]

سید احمد خان کی یہ تصنیف ان کی سیاسی بصیرت کو نمایاں کرتی ہے اس میں ان انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ مسلسل غلطیاں ہوتی رہی ہیں اور انگریز سرکار نے اپنی نااہلی اور لاپرواہی کا مظاہرہ کیا۔ اور ان کا کوئی سدباب نہ کیا گیا چنانچہ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برصغیر کے لوگوں میں حکومتی احکامات کے خلاف انتشار پیدا ہوا۔ کیونکہ ان شکوک و شبہات کی کوئی تدبیر نہیں کی انہوں نے یہ کتاب طبع کی اور حکومت ہند اور پارلیمنٹ کو بھیج دی۔ نور الحسن نقوی لکھتے ہیں کہ:

> "گویا مصنف نے بے خوف وخطر قومی ہمدردی کے لیے آواز بلند کی کتاب پر سخت رد عمل کا اظہار رہا لیکن جب یہ دیکھا گیا کہ یہ کتاب قومی انتشار کے لیے لوگوں میں تقسیم نہیں کی گئی تو حکومتی حکام نے ان اسباب پر غور کرنا شروع کیا"۔[3]

تحریک بغاوت ہند تو ختم ہو گی لیکن زیر اعتاب مسلمان آئے کیونکہ انہیں مورد الزام ٹھہرایا گیا۔ سیتارام نے رسالہ سیاسی سے صوبیدار لکھ کر اس بغاوت میں پہل کرنے والوں میں مسلمانوں کا نام لکھا کہ پہل ان کی طرف سے ہوئی اور ہندو بھی ان کے پیچھے چل پڑے لیکن سر سید نے مسلمانوں کے وکیل کی حیثیت سے رسالہ محمڈنز اف انڈیا (خیر خواہان مسلمان) جاری کیا اور مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کا حال کھل کر بیان کیا۔ اور لکھا:

---

1 سر سید احمد خان، **اسباب بغاوت ہند، (مرثیہ) فوق کریمی** (سر سید اکیڈمی: علی گڑھ، 1971ء)، ص86

2 سر سید احمد خان، **اسباب بغاوت ہند**، ص92

3 نقوی، سید نور الحسن، ڈاکٹر، **سر سید اور ہندوستانی مسلمان**، (ایجوکیشنل بک ہاؤس: علی گڑھ، 1989ء)، ص51

"جو کتابیں اس تحریک کے بغاوت پر لکھی گئی وہ بھی میں نے دیکھی ہیں ہر کتاب کا یہی حال ہے کہ ہندوستان میں کوئی کانٹوں والا درخت ایسا نہیں اگا جس سے مسلمانوں نے نہ اگایا ہو"۔[1]

اس رسالہ میں سید احمد خان نے ان مسلمانوں کے حالات تحریر کیے جو برطانوی حکومت کے خیر خواہ تھے۔ سرسید نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے اور انہیں ایک دوسرے سے مفاہمت اور صلح جوئی کے لیے رسالہ "احکام طعام اہل کتاب" جس میں عیسائیوں کے ساتھ کھانا کھانے کی وضاحت کی اور اسے جائز قرار دیا۔ اسی طرح انہوں نے قران حکیم اور انجیل کے تقابلی مطالعہ پر اور باہمی مشابہت کے تحت مختلف پہلوؤں پر اپنی کتاب تبین الکلام فی تفسیر التورات والا نجیل لکھی۔ سر سید کی عیسائی اور مسلمانوں کے درمیان تحمل کی ایک منفرد کوشش تھی۔ سید احمد خان اس بات سے استدلال کرتے ہیں:

"تورات، زبور اور انجیل جو حضرت موسی علیہ السلام حضرت عیسی علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی اور جس کی تصدیق قران حکیم کرتا ہے۔ اس لیے اس غلط فہمی کو دور ہونا چاہیے کہ قران موجودہ انجیل اور عہد عتیق کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس میں کوئی تعریف یا نقص ہے تو وہ عہد رسالت میں بھی موجود تھا اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے مختلف مواقع پر استنادی حیثیت سے انہیں قبول کیا"۔[2]

سید احمد خان نے بائبل کی تفسیر کرتے ہوئے کچھ ہم معنی آیات مبارکہ اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو بھی نقل کیا اور عیسائیت اور مسلمانوں کے عقائد میں مماثلت اور مذہبی ہم آہنگی کا سراغ لگایا ہے۔ مثال کے طور پر کتاب پیدائش سے نقل کرتے ہیں:

سرے میں پیدا کیا خدا نے اسمان اور زمین کو" اور پھر اس کی تائید میں سورۃ الانعام کی آیت کو لائے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ۬ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ﴾[3]

(سب خوبیاں اللہ کو جس نے آسمان اور زمین بنائے اور اندھیریاں اور روشنی پیدا کیا اس پر کافر لوگ اپنے رب کے برابر ٹھہراتے ہیں)۔

اسی طرح سورۃ الزمر کی آیت کو لائے:

﴿اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ٘ وَّ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌo لَهٗ٘ مَقَالِیْدُ السَّمٰوٰتِ وَ

---

1 سر سید احمد خان، **لائل محمڈن اف انڈیا خیر خواہان مسلمانانِ ہند**، ص 13

2 سر سید احمد خان، **تبین الکلام فی تفسیر التورات والا نجیل علی ملۃ السلام**، ص 23

3 الانعام 1:6

الْاَرْضِؕ وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾[1]

(اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔ آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اسی کی ملکیت میں ہیں اور جنہوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کیا وہی نقصان اٹھانے والے ہیں)۔

سر سید احمد خان ان عبارتوں سے استدلال پیش کرتے ہیں اور قران حکیم اور بائبل مقدس میں تقابل پیش کرتے ہیں اور اس کی فکری وحدت کو نمایاں کرتے ہیں۔ حدیث عمل اور آزادی فکر کے علم برداروں کی بات کی جائے تو سر سید احمد خان کی شخصیت ایک جداگانہ حیثیت سے منفرد نظر آتی ہے۔ ساری زندگی وہ اس بات کا اظہار کرتے رہے کہ ہر شخص فکر و نظر کی آزادی اور خود مختاری کا حق رکھتا ہے خواہ ایسا کیوں نہ ہو کہ اس کی رائے اکثریت کی رائے کے خلاف ہو وہ اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ رائے کی غلطی آدمیوں کی تعداد یا ان کی کمی بیشی پر انحصار نہیں کرتی بلکہ قوت فکر اور استدلال پر منحصر ہوتی ہے۔[2]

ان کی نظر میں آزادی رائے پر پابندی خواہ اس کا تعلق مذہبی خوف سے، سیاسی دباؤ سے ہو یا قوی اور بدنامی کے اندیشہ سے ہو اس کی ہر صورت ناپسندیدہ ہے کیونکہ اس سے انسانوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ جو کسی صورت قابل قبول نہیں انہوں نے حدیث فکر کے حجابات کا تذکرہ بھی کیا۔ وہ اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ سماجی سطح پر مروجہ رسومات اور رواج آزادی فکر اور ازاد اظہار رائے پر سب سے بڑا حجاب ہیں۔ کیونکہ ان کے خلاف بولنا یا بات کرنا قومی عزائم قومی مزاحم سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر دوسرے حجاب کی بات کی جائے تو مذہبی عقائد اور خیالات میں جو آزادانہ اظہار رائے کی راہ میں بڑی رکاوٹ بنتے ہیں ان کے نزدیک تیسرا بڑا حجاب مصلحت عام ہے یعنی حکومت بھی لوگوں کی آزادی رائے پر پابندی کی طرف مائل کرتی ہے کیونکہ وہ عقیدہ کی سچائی یا صحت پر بحث کرنے سے اس لیے روکتی ہے کہ اس سے کوئی فتنہ یا فساد برپا نہ ہو۔ حالانکہ سر سید احمد خان کے مطابق کسی عقیدہ کا مسئلہ عامہ کا حامل ہونا مطالعہ اور بحث کا محتاج ہوتا ہے اور سید احمد خان چوتھا بڑا حجاب عوام کا اپنی آراء کو بے وزن اور بے توقیر ماننا ہے اور ان کا یہ تصور کر لینا ہے کہ ملکی رائے عامہ کی تشکیل میں ان کا کوئی وقار یا اہمیت نہیں ہے۔[3]

یہ وہ حجابات ہیں جن کا تذکرہ خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب میں کیا اور سر سید احمد خان کی سیاسی بصیرت اور سیاسی شعور کی وضاحت کی کہ معاشرہ میں رائج رسوم و رواج، مذہبی عقائد حکومتی حکام کا آزادی رائے پر پابندی لگانا اور عوام کا اپنی بات اور اظہار رائے کو کم ہمت سمجھنا ہی حریت راہ کی فکر میں سب سے بڑی رکاوٹیں ہیں۔ سر سید احمد خان بر صغیر میں رائج تصور تقلید کی بھرپور مذمت کرتے رہے۔ ان کے نزدیک اس سے آزادی فکر اور غور و فکر کا راستہ بند

---

1 الزمر 39:62-63

2 پانی پتی، محمد اسماعیل، **مقالات سر سید** (حصہ پنجم)، ص 214

3 نظامی، خلیق احمد، **سر سید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے**، (انجمن ترقی اردو نئی دہلی، 1993ء)، ص 140

ہو جاتا ہے۔ اس بات کو بطور استدلال پیش کرتے ہیں کہ تقلید اور روایت پسندی سے آزادی فکر کو جس طرح گھن لگا ہے اس سے اجتہاد کو جو زوال آیا علوم وفنون کے مبادین میں کاری ضرب ہے ان کے نزدیک فقہ کی کتابوں کو صحیح یا غلط معلوم کرنے کے لیے نہیں پڑھا جاتا محض اس لیے پڑھا جاتا ہے کہ اس کے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکیں خواہ وہ صحیح ہے غلط ہے اسے جان لیا جائے۔[1]

"حکومتی حکام اور قانون ساز ادارے ہدایت اور نمائندگی" کی بات کی جائے تو اس حوالے سے سر سید احمد خان کی فکر ایک منفرد حیثیت کی حامل نظر آتی ہے وہ اس بات سے استدلال کرتے نظر آتے ہیں کہ اگر تاریخ کو دیکھا جائے تو یہ سبق ملتا ہے کہ کسی بھی ملک کے فلاح و بہبود اور قومی یکجہتی کو اگر مسمار کرنا ہو حاکم اور محکوم کے درمیان پھوٹ قائم کر دی جائے اس بات پر یقین کامل ہے کہ جب تک قومی امتیازات قائم رہے گا اس وقت تک دوستانہ خیالات کا تبادلہ ناممکن رہے گا"۔[2]

غیر مسلموں سے دوستی اور موالات میں سر سید احمد خان دنیاوی اور سیاسی معاملات میں دوستی کو درست قرار دیتے ہیں جبکہ مذہبی اور تہذیبی معاملات، اس کے روادار نہ تھے۔[3]

اور دلیل کے طور پر قران حکیم کی اس آیت کو رکھتے تھے۔

﴿لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ○اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ اَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَ ظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾[4]

(اللہ تمہیں ان لوگوں سے احسان کرنے اور انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جنہوں نے تم سے دین میں لڑائی نہیں کی اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔ اللہ تمہیں صرف ان لوگوں سے دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جو تم سے دین میں لڑے اور انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے پر (تمہارے مخالفین کی) مدد کی اور جو ان سے دوستی کرے تو وہی ظالم ہیں)۔

اس سے سید احمد خان کی بصیرت افروز شخصیت ابھر کر واضح ہوتی ہے کہ کفار کے ساتھ دوستی اور تعاون منع فی دین ہے۔ جب کہ اس کے علاوہ معاشرت محبت وفا اور امداد کے لیے اسلام کی رو سے یہ سب منع نہیں ہے۔ مسلم

---

1 پانی پتی، محمد اسماعیل، **مقالات سید** (حصہ پنجم) ص 215

2 نظامی، خلیق احمد، **سر سید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے**، 195

3 صدیقی، عتیق، **سر سید احمد خان ایک سیاسی مطالعہ**، (مکتبہ جامعہ دہلی، 1977ء)، ص 259

4 الممتحنہ 60:8-9

مفادات اور انڈین نیشنل کانگرس کے حوالے سے ان کی سیاسی بصیرت کو دیکھا جائے تو شروع سے ہی انہوں نے شکوک و شبہات کا اظہار کیا۔ اور انڈین نیشنل کانگریس کو مسلم مفادات کے مخالف قرار دیا۔ سر سید احمد خان کے نزدیک یہ جماعت ہندوؤں کے مفادات کے لیے قائم کی گئی ہے۔ اس لیے اس جماعت کی حمایت اور ستائش نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ اس کے مقابلہ میں انہوں نے 1886ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی۔ اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کو ہی سیاسی کامیابی قرار دیا۔ اور محمدن ایجوکیشنل کانگرس کے پہلے جلسہ کے موقع پر کہا:

"جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ پولیٹیکل امور پر بحث و مباحثہ سے ہماری قوم ترقی کر سکتی ہے تو میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا بلکہ صرف اور صرف تعلیم ہی کے ذریعے سے قومی ترقی سمجھتا ہوں"۔[1]

سر سید کے "تصور قومیت" کو لیا جائے تو بہت سارے لوگوں نے انہیں متحدہ قومیت کا علم بردار جانا ہے۔ لیکن اگر ان کے تصور قومیت کو دیکھا جائے تو دو نکاتی پہلو سامنے آتے ہیں۔

* تمدنی، ثقافتی اور دنیاوی اعتبار سے ایک پہلو واضح ہوتا ہے۔
* جب کہ دوسرا پہلو مذہبی اور خالص تہذیبی اعتبار رکھتا ہے۔

سر سید احمد خان کے واحد قومیت کے تصور کو دیکھا جائے جہاں وہ غیر مسلموں کو بھی مسلم قوم میں شمار کرتے ہیں تو وہ دنیاوی اور تمدنی حیثیت سے قرار دیتے ہیں۔ لاہور انڈین ایسوسی ایشن میں تقریر کرتے ہوئے سر سید احمد خان نے کہا تھا۔

"قوم لفظ میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں میں لفظ نیشن (Nation) سے میں تعبیر کرتا ہوں کہ ان کے قومی مفادات ایک ہیں اس بات سے چنداں فرق نہیں پڑتا کہ ان کا مذہب کیا ہے ہندو، مسلمان اور سکھ ملکی فوائد، قاعدے اور قوانین کے مطابق ایک قوم ہیں یعنی ہندوستانی قوم"۔[2]

سر سید احمد خان کی سیاسی فکر کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبد اللہ کی رائے خاصی جاندار ہے کہ:

"سر سید احمد خان کے پاس سیاست اور دین دو الگ شعبے نہیں تھے۔ بلکہ انہوں نے اپنے وقت کے سیاسی مسائل کو نپٹانے میں دین سے ہی مدد لی ہے۔ سیاسی مغائرتوں کو رفع کرنے کے لیے مذہب ہی کو سند بنایا۔ انہوں نے تمدنی، جغرافیائی، اقتصادی اور عقلی معیاروں کو مد نظر رکھا اور زمانہ کے حالات کے پیش نظر ان کا ماتم نظر دینی اور مذہبی زیادہ رہا جبکہ ملکی اور جغرافیائی کم تھا"۔[3]

ان تمام دلائل سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ سید احمد خان برصغیر میں دعوت و اصلاح کے سلسلہ کی ایک مضبوط کڑی ہے۔ جس نے ہر طرح سے برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی، مذہبی، ثقافتی اور سماجی افکار و نظریات کی

---

1 گجراتی، امام دین، **مجموعہ لیکچرز سر سید احمد خان**، (سر سید اکیڈمی: علی گڑھ، 1993ء)، ص349

2 صدیقی، عتیق، **سر سید احمد خان ایک سیاسی مطالعہ**، ص299

3 سید عبد اللہ، ڈاکٹر، **سر سید احمد خان اور ان کے رفقاء کا اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ**، (ایجوکیشنل بک ہاؤس: علی گڑھ، 1994ء)، ص34

افزائش میں رہنمائی کی۔ وقت اور ضرورت کے پیش نظر ایک علم کلام کے ذریعے سے فکری چیلنجز کا مقابلہ کرتے ہوئے سیاسی اور مذہبی دفاع کا فریضہ انجام دیا مجموعی حیثیت سے اخلاص کی دولت سے پر ایک باوقار شخصیت تھے جنہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک نئی راہ کا پتہ دیا اور ان کی اصلاح ور ہنمائی میں نمایاں کردار ادا کیا۔

انیسویں اور بیسویں صدی کے برصغیر میں احیائے فکر کے سیاسی اثرات میں تصور قومیت اور مفید امامت پر بے حد غور وفکر رہا۔ اور اس کے اثرات آنے والے وقت میں بھرپور نمایاں رہے۔ اس سے پہلے شاہ عبد العزیز کا فتویٰ جس کی روشنی میں یہ کہا گیا کہ مسلمانوں کے لیے ہندوستان کی سرزمین مسلمانوں کے لیے دارالحرب کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو کہ برصغیر کے تمام انقلابی تحاریک کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اور اسی سے تحریک کا اغاز ہوا۔ سید اسماعیل شہید نے امامت کو دو بڑی اقسام میں بیان کیا ہے۔ اول امامت حکمیہ اور دوم امامت حقیقیہ ظاہری اعتبار سے شریعت کے بنیادی اصولوں پر مبنی ریاست اور اس کے حاکم کو امامت حکمیہ کا درجہ دیتے ہیں جبکہ امامت حقیقی یا میں وہ نسبت نبوی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو مقدم رکھتے ہیں۔

تحریک علمائے ہند کے سیاسی اثرات

علمائے ہند میں سید محمود الحسن کی سیاسی جدوجہد ایک تحریک بن کر ابھری جس نے پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مسلم ممالک سے اتحاد کی کوشش اور ایک مرکزی قومیت کا تصور اور پھر اس کے لیے اعلی سطح پر اقدامات جن کو برصغیر کی تاریخ میں ریشمی رومال کی تحریک سے جانا جاتا ہے۔

مولانا محمود الحسن کی شخصیت کو اگر تحریک ریشمی رومال کے تناظر میں دیکھا جائے تو ایک عالمی سیاسی تحریک کا تصور واضح ہوتا ہے جسے مولانا شیخ الہند نے پیش کیا۔ برصغیر میں ایک متوازی حکومت کا قیام تھا جس میں مسلمان سربراہ ہوں جس کی بنا پر حکومت برطانیہ کو ملک بدر کر دیا جائے۔ انہوں نے عالمی سطح پر خط وکتابت کی اور سیاسی قوتوں کو اپنے ساتھ ملایا۔ دراصل تحریک ریشمی رومال کا اجراء ایک بڑا پس منظر رکھتا ہے۔

مسلمانوں کی سیاسی حالت جسے مولا محمود الحسن نے اپنی انکھوں سے ملاحظہ فرمایا اور مولانا حسین مدنی نے نقش حیات میں اس کے تاریخی اسباب کا مفصل ذکر کیا ہے۔ وہ کون سے اسباب تھے جن سے یہ عالمی تحریک رونما ہوئی۔ انگریزی دور اور سماجی بربادی پر سید مدنی تبصرہ کرتے ہیں کہ جب انگریزی راج تھا تو ہندوستانیوں کی وطنی امتیاز، نسلی اور رنگت، طاقت اور قوت کے بے دریغ استعمال برصغیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک انگریزوں کا پسندیدہ مشغلہ رہا۔

> "ہر وہ عہدہ، عزت اور منصب جس کو قبول کرنے کے لیے ادنی سے ادنی انگریز بھی گریزاں ہوں ہندوستانیوں کے لیے اسے بھی بند کر دیا گیا۔ چھوٹے اور کم تنخواہ والے عہدوں پر بھی ہندوؤں کا تقرر کیا گیا۔ ان سے بھی مسلمانوں کو نکال دیا گیا۔ یونیورسٹیوں اور انگلونڈینوں کو ان کے عہدوں پر کئی گنا زیادہ تنخواہوں سے نوازہ گیا۔

فوجی عہدوں سے مسلمانوں کو بالکل خارج کیا گیا۔ ہندوستانیوں کی ذاتوں کی تذلیل کی شادی بیاہ کے قاعدوں کو بدل دیا۔ مذہبی رسوم ورواج کی توہین کی۔ عبادت خانوں اور جاگیروں کو ضبط کیا حکومتی اور سرکاری سطح پر کافر لکھا گیا۔ جاگیروں پر قبضہ کر لیا گیا امراء کی ریاستیں قبضے میں لی گئیں اس طرح لوٹ کھسوٹ سے ملک کو تباہ و برباد کیا گیا۔ بات بات پر حتف لگ جاتے تھے۔ شرفاء کے زنان خانہ میں مردوں کا گھس جانا اور عورتوں کو بے پردہ کرنا جو ناقابل برداشت ظلم تھا۔ ہندوستانی شرفاء کو جو بڑے عزت والے مانے جاتے تھے قید کر کے کلکتہ لائے گئے اور قید خانوں میں رکھا گیا"۔[1]

اسباب بغاوت ہند میں سید احمد خان نے اس بات کی تصدیق کی کہ:

"بے عزتی ایسی بدچیز جو سید ھا دل پر زخم کرتی ہے گورنمنٹ آف برطانیہ نے ہندوستانیوں کو بڑا بے توقیر کر دیا تھا۔ دراصل انگریز اور ہندوستانیوں کا رشتہ آگ اور سوکھی گھاس کا رہا اور پتھر کے دو ٹکڑوں جیسا ایک کالا اور ایک سفید جن میں دن بدن فاصلہ زیادہ ہوتا جاتا ہے"۔[2]

خلاصہ یہ ہے کہ انگریزوں نے برصغیر کے لوگوں کے ساتھ ایسی زیادتیاں کیں جس کی مثال تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔ توہین آمیز عبارتیں لکھی گئیں۔ ریل کے ڈبوں میں تمیز کی گئی جلسوں کی نشستوں میں تمیز کی گئی جس کو گوارانہ کرتے ہوئے سید احمد خان آگرہ میں ہونے والے جلسہ سے ایسے ہی واپس آ گئے۔ 1857ء میں وہ مظالم برصغیر کے لوگوں پر ڈھائے گئے جو جانوروں پر بھی نہیں کیے جا سکتے۔ ابو سلیمان اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

"برصغیر کے لوگوں کی تذلیل و توہین کی انہیں جاہل اور غیر مذہب مشہور کیا گیا۔ انہیں مذہبی دیوانے کنگلے، نا اہل دور نالائق بتایا گیا۔ امریکہ، کینیڈا، نیوزی لینڈ اور دیگر یورپی ممالک میں انہیں شہریت سے منع کیا گیا"۔[3]

گویا یہ سب وجوہات تھیں جن کی بنا پر رد عمل کا اظہار کیا گیا۔ اسلامائزیشن کی ایک تحریک جس کی مذہبی اور سیاسی ضرورت ابھر کر سامنے آتی ہے اس میں علمائے ہند کی کاوشیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ بین الاقوامی سیاسی تحریک کا تصور جس کو مولانا محمود الحسن نے اپنی تحریک ریشمی رومال کے ذریعے سے ابھارا اور کہا کہ:

"اسلام صرف عبادات کا مذہب نہیں ہے بلکہ سیاسی، مذہبی، تمدنی اور ثقافتی سطح پر ایک مکمل نظام حیات رکھتا ہے۔ جو لوگ موجودہ زمانے کی کشمکش میں حصہ لینے سے گریزاں ہیں اور صرف فرائض کی ادائیگی کو اپنے لیے کافی گردانتے ہیں وہ اسلام کے صحیح تصور سے نابلد ہیں"۔[4]

اس تحریک کے ذریعے سے مختلف منصوبے بنائے گئے کہ اقوام عالم کی اخلاقی امداد کی جائے۔ اصل دشمن

---

1 مدنی، حسین احمد، مولانا، **نقش حیات**، ص126

2 سر سید احمد خان، **اسباب بغاوت ہند**، ص246

3 شاہ جہان پوری، ابو سلیمان، **مولانا حسین احمد مدنی ایک سیاسی مطالعہ**، ص163

4 عبید اللہ سندھی، مولانا، **برصغیر میں تجدید دین کی تاریخ**، (رحیمیہ مطبوعات: لاہور، 2016ء)، ص90

کی جاسوسی کی جائے۔ اجمالی خاکہ تیار کیا گیا جس میں عارضی حکومت کا منصوبہ شامل تھا۔ اندرون ملک مراکز بغاوت کا قیام اور رضاکار بھرتی کیے گئے۔ بیرون ملک امداد کے مراکز کا قیام راستوں کا تعین اور تحفظ کا حملے کی صورت میں انتظام وغیرہ اس تحریک کے نمایاں منصوبوں میں شامل تھا۔ یہ سب باتیں آپ کی سیاسی بصیرت کا عکاس ہیں۔[1]

تصور خلافت کا احیاء و تحریک

"الہلال" بطور تجزیاتی مطالعہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا آزاد اسلام اور نیشنلزم کے عنوان سے جو مضمون لکھا اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا کے نزدیک اسلام اور نیشنلزم دو الگ الگ باتیں نہیں ان میں کوئی تضاد نہیں۔ انہوں نے اس بات کی وضاحت کی اور ہمیشہ برصغیر کے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ان کے لیے ملک و قوم کی خدمت اور ان کی فلاح و بہبود کی کوششیں ہی اسلام کا حکم ہے۔ میرے نزدیک وطنیت اور اسلامیت کے درمیان ایسا کوئی تضاد موجود نہیں جس پر بحث کی جا سکے۔ ایک مسلمان اپنی اسلامیت اور ہندوستانی ہونے پر فخر محسوس کر سکتا ہے۔[2]

تصور خلافت کو دیکھا جائے تو تحریک خلافت کی تاریخی حیثیت واضح ہوتی ہے۔ ابو الکلام آزاد اس بات سے استدلال کرتے ہیں۔ قران کریم کے نزدیک اگر جو ایک چیز خلافت ہے وہ خلافۃ الارض ہے۔ یعنی زمین پر حکومت و تسلط کوئی بھی صحیح معنوں میں اسلام کا خلیفہ ثابت نہیں ہو سکتا جب تک اسے کامل اختیارات حاصل نہ ہو جائیں نہیں تو اس کی حیثیت اسی پوپ کی جس کے لیے پیشانیوں کا سجدہ کافی ہو۔[3]

انہوں نے رام گڑھ کے خطبہ صدارت میں اس بات پر زور دیا کہ اسلام استبداد کو ناپسند کرتا ہے۔ وہ کسی ایسے اقتدار کو پسند نہیں کر سکتا جس میں اس کے بندے غلام ہوں اور وہ آزادی کی نعمت سے محروم زندگی گزاریں۔

عہد فاروقی میں بھی کبھی کسی حاکم پر بے جا سختی نہیں کی اور نہ اپنے ماتحتوں کو کبھی تکلیف پہنچائی۔ اور اگر ایسا ہوا تو حضرت عمر فاروق نے انہیں تنبیہ کرتے ہوئے کہا: "اللہ نے لوگوں کو آزاد پیدا کیا ہے۔ تم نے انہیں کب سے غلام بنالیا" یہ حدیث اخر میں ابو الکلام ہمیشہ دہرایا کرتے اور ظلم و زیادتی کے خلاف ہمیشہ لکھتے اور آواز بلند کرتے۔ اور جہاں کہیں انسانیت کے ساتھ ظلم دیکھتے بے چین ہو جاتے۔ وہ جس طرح ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے تھے اسی طرح دنیا پر ملک و قوم کی ازادی کے خواہاں رہے۔[4]

---

1 تحریک ریشمی رومال حالات وواقعات کی تفصیل کے لیے "نقش حیات جلد اول" (سید حسین احمد مدنی ملاحظہ ہو) جس میں تمام منصوبہ جات، پس منظر، مسلمانوں کی ناقدری کے واقعات اور حالات ذکر کیے گئے ہیں

2 شاہ جہان پوری، ابو سلیمان، **ابو الکلام آزاد ایک مطالعہ**، ص90

3 آزاد، ابو الکلام، **مسئلہ خلافت**، (مکتبہ جمال حسن مارکیٹ: لاہور، 2006ء)، ص23

4 قاضی، جاوید احمد، **سر سید سے اقبال تک**، ص173

سید محمود الحسن کے ساتھ انہوں نے تحریک نظم جماعت کا منصوبہ بھی دیا جس میں وہ ایک ایسے خلیفہ کے خواہاں تھے جو تمام عالم اسلام کا خلیفہ ہو اور جس کا حکم تمام لوگوں کے لیے ضروری ہو۔ اس کام کے لیے انہوں نے سید محمود الحسن کا انتخاب کیا۔ تجزیاتی طور پر دیکھا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں کوئی بھی فرق یا تضاد نظر نہیں آتا شروع سے اخر تک ایک ہی رنگ نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں دین، دنیا، سیاست اور مذہب کے الگ الگ خانے نہ تھے۔ انہوں نے ملکی آزادی کی اس لیے کوششیں کی کیونکہ ان کے نزدیک سیاست بھی مذہب ہی کے راہ میں آتی ہے۔ اور یہی اسلام کی تعلیم کا منشا اور تقاضہ ہے۔ انہوں نے مذہب اور سیاست کو ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر ادا کیا۔

تحریک احرار اور جمعیت علمائے ہند

متحدہ قومیت کے خواہاں احرار کے ممبران نے یہ منصوبہ بنایا کہ ترک افواج کی مدد سے انگریز سے حکومت چھین لی جائے۔ اور ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد پر ایک ازاد ریاست قائم کی جائے۔ دیوبند علماء انگریز دشمنی سے واقف تھے اس لیے انہوں نے کانگریس کا ساتھ دیا۔[1] لیکن نہرو رپورٹ کے بعد مولانا شوکت علی نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ اکثر علماء کانگریس سے الگ ہو گئے لیکن مولانا حسین احمد مدنی کانگریس کے ساتھ رہے۔ جبکہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا اشرف علی تھانوی اپنی الگ رائے رکھتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر کی ہر ممکن کوشش تھی کہ علماء متحدہ طور پر مسلمانوں کی جمعیت میں شامل رہیں۔

> ''مولانا حبیب الرحمن کی زیر صدارت 1931ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں پہلی احرار کانفرنس منعقد ہوئی۔ استقبالیہ خطبہ مظہر علی اظہر نے پڑھا اور ہندوؤں کی تنگ نظری کا تذکرہ کیا۔ کہ ہم نے ہندوؤں اور سکھوں سے ہمیشہ سمجھوتہ کرنے کی کوشش ہی کی ہے لیکن اس کوشش میں ہندوؤں اور سکھوں کی تائید میں ہم نے اپنے مسلمان بھائیوں سے کسی حد تک زیادتی بھی کی۔ دوستی کو دشمنی میں بدلتے دیکھا۔ محض اس لیے کہ ہم متحدہ قومیت کی بنیاد کو برقرار و استوار رکھنا چاہتے تھے۔ سرمایہ داری اور برطانوی ملوکیت سے نجات کو ہی ہم اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے رہے ہیں۔ لیکن سکھوں اور ہندوؤں نے اپنے عہد کی پاسداری نہیں کی"۔[2]

اس اجلاس میں مولانا عطا اللہ شاہ بخاری، چوہدری افضل حق اور مولانا داؤد جیسے جید اور سرگرم احراری شریک ہوئے۔

1920ء میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن جب مالٹا سے رہا ہو کر لاہور تشریف لائے تو یہی طے ہوا تھا اسلامی

---

1 تحریک احرار (1924ء) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے، حیات امیر شریعت (جانباز مرزا) اور رئیس الاحرار (عزیز الرحمن) تحریک احرار پس منظر و جوہات ذکر کی گئی ہیں۔

2 شورش کاشمیری، **خطبات احرار**، (مکتبہ احرار: لاہور، 1944ء)، ص 116

حکومت کا قیام اکیلے ناممکن ہے اس لیے کانگریس کے ساتھ شمولیت اختیار کی جائے تب سے تمام احرار کا یہی عقیدہ رہا۔ مولانا عطا اللہ شاہ نے واضح طور پر کہا خواہ ہمیں قتل کر دیا جائے لیکن پنجاب میں بھی اسی طرح حکومت قائم کرنے کی کوشش کریں گے جس طرح دیگر صوبوں میں کی۔

احرار نے تحریک ختم نبوت اور تحریک کشمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ کشمیری مسلمانوں کو جائز حقوق کی فراہمی کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔[1]

تجزیاتی طور پر دیکھا جائے تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری، چوہدری فضل الحق، شیخ حسام الدین اور حبیب الرحمن لدھیانوی سب بڑے جید اور دلیر لیڈر تھے۔ اگر دنیا کی تمام سیاسی جماعتوں کو دیکھا جائے تو ہمیشہ ان کی پشت پر نڈر اور دلیر گروہ ہوتا ہے۔ برصغیر کی پشت پر بھی احرار کو یہی اہمیت حاصل رہی۔

علماء کی معاشرتی تحریک کے سیاسی اثرات

مولانا کی سیاسی زندگی، جدوجہد، مالٹا اور مصر میں ان کی بہادرانہ اور مجاہدانہ سرگرمیاں انہوں نے اپنی زندگی کے بہت ابتدائی سالوں میں اس سیاسی مسلک کے منشور کو حاصل کیا جس پر انہوں نے اپنی باقی زندگی گزاری۔ نقش حیات کے مطالعہ سے بعض اوقات ایسا محسوس ہوا کہ انہوں نے اپنی من منکسرانہ فطرت کے باعث اپنے کارناموں کی تفصیل بیان نہیں کی۔ انہوں نے جتنے خطوط جمع کیے جو برطانوی اقتصادی بدحالی کے متعلق تھے۔ سید محمد میاں لکھتے ہیں:

> "مولانا مدنی کا یہ محکم خیال تھا مسلمانوں اور ہندوؤں کو شانہ بشانہ کام کرنا چاہیے کیونکہ استخلاص وطن کے لیے برادران وطن سے اشتراک میں کوئی گمراہی نہیں بشرط یہ کہ مذہبی حقوق کی ادائیگی میں کسی قسم کا رشتہ رخنہ واقع نہ ہو"۔[2]

مولانا حسین احمد مدنی نے لوگوں کو مدرسوں اور خانقاہوں سے کھینچ کر ایک جامع تصور کے گرد جمع کیا۔ اور میدان میں عمل کی جدوجہد ساری زندگی جاری رکھی۔ آپ کا یہی نظریہ رہا علم کو سیاست کے میدان میں رہنما اور نمونہ عمل ہونا چاہیے اسی بات پر اسلام کا مذہب کی حیثیت سے اور ملت کی حیثیت سے مسلمانوں کا وقار قائم رہ سکتا ہے۔[3]

یہی وجہ تھی کہ اس تحریک استخلاص میں لوگوں نے بھرپور حصہ لیا کیونکہ ان کے لیے اس تحریک میں شرکت ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ حب الوطنی ان کے نزدیک ایک دینی فریضہ تھا۔ چنانچہ مولانا حسین

---

1 جانباز مرزا، **حیات امیر شریعت**، (مکتبہ جمال حسین: لاہور، 1996ء)، ص157

2 سید محمد میاں، **علمائے حق**، ص291

3 شاہ جہاں پوری، ابو سلیمان، **شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی ایک سیاسی مطالعہ**، ص106

احمد مدنی نے جس سر فروشی سے اسے نبھایا اس کی مثال ناممکن ہے۔ مولانا نے خلافت کانفرنس میں ایک تاریخ ساز ریزولیوشن پیش کی جس کا لب لباب یہ تھا۔ اعلائے دین سے دوستی اور محبت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ موالات حرام ہے۔ انگریزی حکومت کے استحکام میں شرکت نہیں کی جاسکتی۔ انہوں نے خلافت کانفرنس سے مسلمانوں کو ایک عالمگیر اخوت کا پیغام دیا۔ اور محدود قوم پرستی کے تصور کو توڑا۔ ان کا سیاسی منشور وحدت کا تصور تھا جس کے لیے انہوں نے بھرپور کوششیں کیں اور قوم کو انہیں جذبات کے ساتھ متحد ہونے کی دعوت دی۔

مولانا بریلوی نے معاشرتی اصلاح و تربیت میں جو کردار نبھایا وہ الگ لیکن سیاسی افکار و نظریات کو بھی ایک نئے رنگ سے متعارف کروایا۔ ان کے سیاسی افکار و نظریات کو سمجھنے کے لیے ان کی کتب کا جائزہ ضروری ہے۔ "انفس الفکر فی قربان البقرہ" اعلام الاعلام بان ہندوستان دار السلام "المطاری الداری لصفوات الباری" نیز تدبیر فلاح و نجات اور اصلاح ان کے سیاسی افکار کی عکاس ہیں۔ "انفس الفکر فی قربان البقرہ" میں گائے کی قربانی پر کیے جانے والے سوال و جوابات ذکر ہیں۔

"جب گائے کی قربانی پر سوال کیا گیا تو آپ نے جواب دیا کہ گائے کی قربانی کو ختم کر دینا ہرگز جائز نہیں"۔[1]

ہندوستان میں ہندو بکثرت موجود ہیں۔ گو کہ بظاہر گائے کی قربانی کا سیاست سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن برصغیر کی سیاسی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو اس کا جواز سامنے آتا ہے۔ کہ دور اکبری میں اس پر پابندی عائد کی گئی۔ اس کے بعد حضرت مجدد کی کوششوں سے یہ پابندی ختم ہوئی۔ اور جہانگیر نے گائے ذبح کروائی پھر تحریک خلافت اور ترک موالات کے زمانہ میں ہنود نے گائے کی قربانی کو ترک کرنے کا مطالبہ کیا۔ جس کی تائید مسلمان عمائدین نے سیاسی سطح پر کی۔ مولانا کی سیاسی بصیرت نے روز اول سے ہی ان عزائم کو بھانپ لیا تھا اس طرح جمہور اسلامیہ کے لیے راستہ ہموار ہوا۔[2]

دیگر علماء کے فتویٰ سے مختلف مولانا بریلوی نے برصغیر کو دار السلام قرار دیا۔ کیونکہ تحریک آزادی ہند میں جب علماء نے لوگوں کو ہجرت کرنے کا فتویٰ دیا اور برصغیر کو دار الحرب قرار دیا تو انہوں نے اس کی سخت مزاحمت کی۔ کیونکہ ان کے خیال میں جس طرح حکمت عملی کے تحت گاؤکشی ترک کرنے پر اصرار ہے اسی طرح ہجرت کرنے پر اکسایا جا رہا ہے۔ کیونکہ ان دونوں طرح سے فائدہ ہنود کو ہے۔ اور برصغیر کے مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے جب کہ صورتحال ایسی ہے کہ قوم اس نقصان کی متحمل نہیں ہے۔ انہوں نے ہجرت کو برصغیر کے مسلمانوں کی معاشی اور سیاسی زندگی دونوں کے لیے مضر قرار دیا۔[3]

---

1 بریلوی، احمد رضا خان، **انفس الفکر فی قربان البقرہ**، (مکتبہ النور: بریلی، 1962ء)، ص9

2 خدا بخش، **مسلم لیگ**، (دار السلام: لاہور، 1986ء)، ص24

3 منور حسین، **ملفوظات امیر ملت**، (مکتبہ اسلامیہ: لاہور، 1976ء)، ص181

برصغیر میں جب 1919ء میں تحریک خلافت کی آوازیں اٹھنا بلند ہوئیں اور پھر اس تحریک کا باقاعدہ آغاز کیا گیا تو اس تحریک کی عمومی مقبولیت اور مضبوطی کے لیے کچھ علماء نے مسئلہ خلافت پر بحث کرتے ہوئے قرشیت کی قید کو خلافت کے لیے ختم کرنے کا اعلان کیا۔ اور سلطان عبد الحمید کو اسلام کا خلیفہ اور اس کی سلطنت کو خلافت کا درجہ دیا۔ جبکہ شریعت اسلام میں سلطان وقت اور خلیفہ اسلام کے لیے اتباع اور حمایت کے احکامات الگ الگ ہیں۔ انہیں ترکیہ کی حمایت و تائید یا سلطان سے کوئی اختلاف نہ تھا جبکہ سلطنت کو خلافت اور سلطان کو خلیفۃ الاسلام ماننے سے اختلاف تھا۔ کیونکہ ان کے نزدیک خلیفہ کے لیے شرعاً "قریشی" ہونا ضروری ہے۔

مولانا احمد رضا بریلوی تحریک خلافت سے الگ اس لیے رہے کہ ان کے نزدیک اس کی بنیاد شریعت اسلامیہ پر قائم نہیں۔ انہوں نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی روشنی میں یہ فتویٰ دیا۔ بادشاہ غیر قریشی کو سلطان کہیں گے یا امیر یا ولی اور ہر بادشاہ قریشی کو بھی خلیفۃ المسلمین نہیں کہا جا سکتا سوائے اس کے جس میں سات شرائط موجود ہوں۔ خلافت اسلام، حریت، عقل، بلوغ، ذکورت، قدرت، قریشیت ان سب کا جامع ہو۔ اسی طرح خلیفہ اور سلطان کی بحث الگ فرمائی۔ آج تک کسی نے خلیفہ کے لیے سلطان کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ کیونکہ سلطان کا درجہ خلیفہ سے بہت کم ہے۔ کسی نے کبھی سلطان ابو بکر یا سلطان علی المرتضی یا سلطان عمر بن عبد العزیز یا سلطان ہارون الرشید نہ سنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ سلطان کے نام کے ساتھ خلیفہ نہیں لگایا جا سکتا۔ یہی وہ خلافت مصطلحہ شرعیہ ہے اس کے لیے قریشیت غیر یا سات شرائط ضروری ہیں۔ اور اگر مدح میں کسی کو یہ ذکر کر جائیں تو یہ حکم شرح کے منافی اور نہ اصطلاح شرع کے۔[1]

اس سے دعویٰ خلافت کی حقیقت برصغیر کے مسلمانوں کے سامنے مکمل طور پر واضح ہوئی۔ سید احمد رضا بریلوی برصغیر میں مسلمانوں کے سیاسی استحکام کے لیے معاشی استحکام کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اقتصادی حالت کی بہتری اور معاشرتی فلاح و بہبود کے لیے اُنہوں نے چند اہم تجاویز پیش کیں۔[2]

تحریک خلافت کے زمانہ میں برصغیر میں جو ہندو مسلم اتحاد کا شور تھا وہ اب جڑ پکڑ چکا تھا۔ اور اس بات سے ہندو بے پناہ فائدے اٹھا رہے تھے۔ مولانا بریلوی نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا اگر مسلمان اس بات سے باز نہ آئے تو بھاری نقصان اٹھانا پڑے گا۔ "الحجۃ المؤ تمنہ فی اتبۃ الممتحنہ" انہوں نے ایک مکمل رسالہ لکھا جس میں مسلمانوں کو تنبیہ کی اور انہوں نے عوام کو مخالفین کے عزائم سے خبردار کیا۔ یہ بات ان کی مذہبی اور سیاسی افکار و

---

1 بریلوی، امام احمد رضا خان، **فتاویٰ رضویہ**، (رضا فاؤنڈیشن جامعہ نظامیہ: لاہور)، ج14، ص21

2 محمد رفیع الدین صدیقی نے ان تجاویز کا محققانہ جائزہ لیا۔ (اور ایم۔ ایس کو سنز یونیورسٹی کینیڈا) سے انہوں نے "فاضل بریلوی کے معاشی نکات" کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کیا جو 1973ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

نظریات کی عکاس ہے۔ مولانا بریلوی استدلال کرتے ہیں کہ یہودی، عیسائی، ہندو، بت پرست یا آتش پرست کبھی بھی مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے اور انہیں دوست تصور کرنا ایک بڑی سیاسی غلطی ہے۔ ممکن ہے یہ بات 1920ء میں سمجھ میں نہ آئی ہو لیکن اب جب کہ ملت اسلامیہ متعدد نشیب و فراز سے گزر چکی ہے۔[1]

حریت آزادی اور آزادی فکر کی جو راہ مولانا احمد رضا بریلوی نے متعین کی اس پر آل انڈیا سنی کانفرنس کی تحریک کا اغاز کیا جس نے آنے والے وقت میں تحریک پاکستان کے لیے گراں قدر خدمات سر انجام دی۔ انہوں نے اپنے جلسہ میں اس بات کا اعلان کیا آل انڈیا سنی کانفرنس مطالبہ پاکستان کی حمایت کر کرتا ہے۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے علماء ایسی حکومت جو قران و سنت کی روشنی فقہی اصول و ضوابط کے مطابق اپنی راہ کا تعین کرے اس کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔ مولانا بریلوی کی فقہی بصیرت اور سیاسی افکار احیائے مذہب اور اساسی فکر و فن میں اپنا معیار آپ ہیں۔

فکر اقبال پر مبنی تحریک ملت اور پاکستان

علامہ اقبال ایک ایسی ریاست جس سے پورا عالمی اسلامی معاشرہ منسلک ہو سکے اس کے خواہاں تھے۔ اقبال نے حتی الامکان اپنے کلام میں اس بات کی کوشش کی کہ موجودہ زمانہ میں انہی مقامی معیارات کے مطابق جو جو معیارات دینا چاہتا ہے وہ ایک ایسی ہی مثالی ریاست متعارف کروائی جائے۔ جدید جمہوریت اور اس کے افکار کارد اس بنا پر کرتے ہیں کہ یہ بنیادی طور پر امراء کی حکومت ہے۔ جو کہ عام طور پر نسل پرستی کی بنیاد اور کمزور کے استحصال کرنے پر وجود میں آتی ہے۔

اسلام کے تصور مساوات پر استدلال کرتے ہوئے وہ تصور جو اسلام دیتا ہے جس میں نسلی امتیاز سے نکار اور نفرت پائی جاتی ہے۔ وہ اشتراکیت کی حکومت کی ایک مثالی ہیت مانتے ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ وہ اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ "لا الہ الا اللہ" اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان کی شہادت فکری تاویل پر ہے۔ اس میں ایک ایسا مثبت پہلو کار فرما ہے جو تائیدی اور تعمیری ہے۔ لہذا ایک مثالی ریاست کا تصور اسی صورت میں ابھر کر واضح ہو سکتا ہے جب اسلام کے دائرہ کار کو اختیار کرتے ہوئے اس کی بنیاد رکھی جائے۔ نہ کہ کسی دوسرے عصری نظام کی مشابہت پر یہ ممکن ہے۔[2]

علامہ محمد اقبال کے نزدیک اسلام ایک ایسے واحد نظام کا نام ہے جو انسان کے لیے راہ ہدایت متعین کرتا ہے۔ ان کے ہاں ملت و امت کا ایک مخصوص تصور موجود ہے جس کا اظہار وہ اپنے کلام میں کرتے ہیں۔

---

1 محمد مصطفی رضا خان، **الطاری الداری لھفوات عبد الباری**، (رضا اکیڈمی: دہلی)، ص 99

2 عزیز احمد، **برصغیر میں اسلامی جدیدیت**، ص 231

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی[1]

1930ء کے خطبہ صدارت میں انہوں نے ایک الگ ریاست کے تصور کو ابھارتے ہوئے اس کی اہمیت کو واضح کیا۔ کہ اسلام ایک ایسے نظام اخلاق کو متعارف کرواتا ہے جس کا نظام سیاست قانونی نظام کے تحت چلایا جاتا ہے۔ یہ ایک سماجی ڈھانچہ ایک خاص نصب العین رکھتا ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کو اسلام کے لیے ان کے بنیادی جذبات متحد کرتے ہیں۔ اس لیے اس بات کی اشد ضرورت ہے۔ ایسے نظام سیاست جس میں مذہبی رجحان کو حصہ لینے کا کوئی حق نہ ہو رد کر دیا جائے۔ کیونکہ اسلام کا معاشرتی نظام ایسے سلسلہ سے پیوستہ ہے جو اپنے خدائے وحدہ لاشریک سے جوڑتا ہے۔[2]

برصغیر کے معاشی اور سیاسی بدحالی کے پیش نظر علامہ اقبال طبقاتی تقسیم کو اس بدحالی کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ روشن خیالی عقلیت پسندی مغربی جمہوریت یہ وہ لاعلاج مرض ہیں جو اس نظام کے خاتمے کے بغیر ممکن نہیں۔ انہوں نے ہمیشہ اس بات سے استدلال کیا اور اس تصور کو ابھارا اور قومیت کے تصور کو ہمیشہ سیاست سے الگ رکھا۔ اور اس کوشش میں رہے کہ مذہب اور ثقافت کو اپس میں جوڑا جائے۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر انہوں نے کہا کہ اگر آپ اس تصور سے کسی ریاست کی ابتدا چاہتے ہیں کہ مذہب مکمل طور پر ایک الگ اور دوسری دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ تو جو عیسائیت پر گزری ہے عین فطری ہے اور ممکن ہے اسلام کو اس سے دوچار ہونا پڑے۔ کیونکہ انہوں نے عیسی علیہ السلام کے آفاقی اخلاق کی جگہ خود ساختہ نظام اخلاق اور حکمت عملی کو دی۔ بالاخر اس نتیجے پر پہنچنے کے مذہب انسان کا ذاتی مسئلہ ہے۔ جبکہ اسلام انسان کی وحدت کو تقسیم نہیں کرتا۔ اسلام میں کائنات، خدا، روح ومادہ اور ریاست ایک دوسرے کے لازمی جز ہیں۔[3]

تصور پاکستان اور اقبال کے سیاسی مسلک پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ واضح ہے کہ ان کی سیاست کا دارومدار اخلاقی نصب العین کے تابع ہونے پر ہے۔ ان کے نزدیک انسان کی روحانی زندگی میں سیاست کی جڑ ہوتی ہے۔ ہندی مسلمانوں کی تہذیب اور اخلاقی اقدار کا تحفظ ہی اقبال کی قومی خود مختاری کا حصول ہے۔ انہوں نے قومی وجود کو مٹانے کی بجائے اس کے استحکام اور بقاء کی بات کی اور ہندوستانی نیشنل ازم کی بجائے مسلمان نیشنلزم کا نظریہ پیش کیا۔ مسلمان قومیت کے تصور کا اظہار کیا کہ مسلمان جہاں جہاں اقلیت میں ہیں ہجرت کر کے ایک سرزمین سے وابستہ ہو جائیں۔

---

1 محمد اقبال، علامہ، **بانگ درا**، (اکبر بک سیلرز: لاہور، 2015ء)، حصہ سوم

2 چوہدری محمد علی، ظہور پاکستان، (مکتبہ کاروان: لاہور، 1988ء)، ص209

3 ثاقب رزمی، **اقبال ایک نیا مطالعہ**، (طفیل آرٹ پرنٹرز سرکلر روڈ: لاہور، 1984ء)، ص230

اس لیے انہوں نے بجا طور پر یہ بات واضح کی کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت زندہ رہے تو ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کرنا نہایت ضروری ہے۔[1]

تلخیص بحث

اس بحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ برصغیر کے مسلمان ایک ایسی سر زمین کی طرف ہجرت چاہتے تھے جسے ایک مقدس مرکز کی حیثیت حاصل ہو اور تحریک پاکستان کے تصور واضح ہوا برصغیر ہند کے مسلمانوں نے ایسی سر زمین سے ہجرت ہجرت کی جس سے وابستگی بہت گہری تھی اور سر زمین پاکستان کو مرکز مقدس مانا۔

اس کے ساتھ ہی علمائے دیوبند کی وطنیت اور قومیت کی بحث جو اقبال کے ساتھ شروع تھی وہ ختم ہو گئی۔ کیونکہ اقبال کے نقطہ نظر کے مطابق اسلام مسلمان اکثریت سے قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے۔ اور جہاں قوم پرستی اور اسلام پرستی ہم آہنگ ہو گی۔ کیونکہ وطن سے محبت ہی اسلام سے محبت کا نام ہے۔

یہی وجہ تھی کہ مذہبی اور ثقافتی وحدت کی بنا پر کانگریس کے مقابلہ مسلم لیگ ایک مضبوط جماعت کے طور پر ابھری۔ برصغیر پر فکری انقلابی اور تجدیدی اثرات میں سید احمد شہید کی تحریک، علی گڑھ کی تحریک، خلافت کی تحریک، مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ آزادی کی تحریک جو پاکستان کے قیام کا سبب بنی یہ وہ سیاسی فکری اور تجدیدی انقلابی کردار تھا جس کی بنا پر مسلمان اپنا الگ وطن حاصل کر سکے۔ س

یاسی افکار و اثرات پر نگاہ دوڑائی جائے تو تحریک احرار، ریشمی رومال کی تحریک، حاجی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک، عبید اللہ سندھی کی جنود اللہ الربانیہ، احمد رضا بریلوی کی آل انڈیا سنی کانفرنس، جمہور اسلامیہ اور تصور پاکستان مسلم لیگ علامہ محمد اقبال، جماعت اسلامی سید مودودی یہ وہ سیاسی اور مذہبی تحاریک ہیں جنہوں نے اپنی اپنی نہج پر برصغیر میں احیائے فکر کی کوششیں انجام دیں۔

---

1 فتح محمد ملک، **اقبال کا فکری نظام اور تصور پاکستان** (سنگ میل پبلشرز: لاہور، 1997ء) ص 57

فصل سوم

دینی فکر پر اثرات

سید شہید کے افکار و نظریات اور تدبر و تدابیر میں اتباع نبوی کی حیثیت بہت واضح نظر آتی ہے۔ اسی وجہ سے ان کا مقام احیائے دین کی کوشش کرنے والے مشائخ میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اللہ کے ہزاروں بندوں نے بلاشبہ اسلام کے لیے گراں قدر کام لیا مصلحین اور مشائخ آئے لیکن ان کے عمل کے دائرے محدود نظر آتے ہیں۔ سید احمد شہید نے اس نقطہ کو۔ بہت اچھی طرح سمجھ لیا۔ کہ شریعت اسلامیہ کا قیام اور اسلامی نظام حیات کا اجراء اور ماحول تبدیلی کے بغیر یہ سب کوشش بیکار ثابت ہوں گی۔ اس لیے فضا تبدیل کرنے اور جڑ مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔

"سید شہید اسی نقشہ پر کام کرنا چاہتے تھے جس پر آپ ﷺ اور آپ خلفائے نے کام کیا تجربہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ سب زیادہ تعبداری اسی میں اور قیامت تک اسلام کی ترقی کے لئے وہی نظام عمل ہے۔"[1]

اسلام کے عملاً نفاذ کا لازمی نتیجہ صاحب اقتدار جماعت کے کردار، اخلاق اور اعمال کی اشاعت ہے

﴿الَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ﴾[2]

(وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دیں)

یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ شرعی حکومت کے نفاذ کے بغیر شریعت اور شارع کے احکام پر پوری طرح عمل نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اسلام کے نظام عمل کا ایک پورا حصہ ہے جو کہ حکومتی احکامات پر موصوف ہے۔ اسلام دیگر مذاہب رسوم و رواج اور محض عقائد کا نام بلکہ یہ پورے نظام زندگی کا نام ہے۔

سید شہید اس بات سے استدلال کرتے ہیں عقائد کے ساتھ زاویہ نظر اور دل و ماغ کا اللہ کے احکام کو قبول کر لینے کے ساتھ یہ تجدید ممکن ہے۔ اور اسلام کی حفاظت بھی قوت کے بغیر ممکن ہے۔ اس لیے اسلام مسلمانوں سے غلبہ و عزت احترام اور اقتدار حصول کے پر زور دیتا ہے۔ برائیوں کو روکا جاسکے اور کلمہ حق بلند کیا جاسکے امت مسلمہ بہترین قوم کہلانے کی حق دار اسی صورت میں جب وہ برائی کو روکنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

اصلاح فکر و عمل

تعبیر اور تبدل کے لیے ہمیشہ قوت و اختیار کی ضرورت ہوتی ہے اس تحریک کے بانی کے افکار کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ عمل کی بالیدگی کے لئے قوت و اختیار کے حصول کے خواہاں تھے۔ تاکہ غیر اللہ سے نجات ممکن ہو سکے۔ احیائے خلافت اسلامیہ ان کی جدوجہد کا مرکز رہی۔ اگر تاریخ کے اوراق اٹھا کر دیکھے جائیں تو ایسے

---

1 ندوی، ابوالحسن، سید، **سیرت سید احمد شہید**، (مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنو: 1432ھ) ص54

2 الحج22:41

مجاہدین موجود ہیں جنہوں نے عظیم الشان سلطنتیں قائم کیں۔ لیکن سید شہید نے اللہ کے نام کی سر بلندی کے لئے اور اللہ سبحان کی خوشنودی اور رضا کے لئے کام کیا۔

"سید شہید نے مسلمان قوم کے غلبہ کے لئے نہیں بلکہ "اسلام" ایک مکمل دین، عقیدہ و عمل اور مسلک زندگی کو قائم کرنے کے لے رسول کی شریعت مطہرہ کی خاطر اپنے خون کا آخری قطرہ بہایا[1]"

سید شہید نے سیرت نبوی کی اس خصوصیت کو نمایاں کرنے میں ایک جاندار کوشش کا اظہار کیا اور اللہ کے حکم کی سر بلندی کے لیے ہمیشہ کھڑے رہے۔ بر صغیر پاک وہند کی فضا معاشرتی اور اخلاقی انحطاط کا شکار تھی۔ انیسویں صدی کے ہندوستان میں ایسی کوئی منظم تحریک نظر نہیں آتی۔ جنہوں نے احیائے سنت کی کوئی ایسی اصلاحی کوشش کی ہو۔ اس کی ایک وجہ یہ کہ اسلام جب ہندوستان کے حصہ میں آیا تو ایران اور افغانستان سے گزر کے آیا۔ اس میں بھی وہ خرابیاں موجود تھیں جو ہندو مذہب اور اس کی تہذیب و تمدن سے پیدا ہو چکی تھیں۔ سید شہید نے دعوت و تبلیغ کا آغاز ایسی خرابیوں کے خاتمہ کے لیے کیا۔ کیونکہ اگر "شرک جلی" کی کوئی صورت دیکھی جائے تو وہ سب اس وقت کے مسلمانوں میں موجود تھا۔

آباد شاہ پوری لکھتے ہیں:

"سید احمد شہید نے انیسویں صدی کے آغاز میں ایک ایسی دینی فضا قائم کی اور ایک ایسی جماعت سامنے آئی جو اس صدی میں سیرت صحابہ کا نمونہ تھی متقی اور عبادت گزار اخلاق و کمال سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے والے اور جوش وجہاد اور یقین و خصوص کی ایسی ہوا اس سر زمین پر صدیوں بعد آئی اور اگر یہ بات اصلاح و تربیت میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔"[2]

سید احمد شہید نے شاہ ولی اللہ کی تحریک تجدید احیائے دین کو ایک بار پھر تقویت بخشی اور اس بات کا اظہار اپنے اعمال و افکار سے کیا کہ اگر زندگی کا صحیح استعمال نہ ہو سب رائیگاں ہوتا ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی زندگی کی درست قوتوں کا استعمال اور اس کا مصرف درست نہ ہو تو شجاعت و دلیری اکثر حریفانہ مقابلوں اور کاموں میں ضائع ہو جاتی ہے۔ سید احمد شہید نے اپنی قوم اس بات کی دعوت دی کہ شجاعت و بہادری کا دیکھانے کا اصل میدان اور قوت کا درست استعمال برائی کے خلاف استعمال ہے۔ انہوں نے اس بات کو شدت محسوس کیا کہ مسلمانوں میں بہترین صلاحیتیں اور جوہر موجود تو ہیں لیکن جماعتی فقدان کے باعث وہ کارآمد نہیں۔ دینی فقدان کے باعث کوئی مفید حرکت نظر نہ آرہی تھی۔ سفر حج کے دوران ایک کنواں پر جب آپ کی ملاقات چند خواتین سے ہوئی جنہیں زبردستی سکھ بنایا گیا تھا ان کی پکار پر سکھوں کے خلاف جہاد کا ارادہ کیا گیا۔ اِس

---

1 ندوی، ابوالحسن سید، **سیرت سید شہید**،،، ص57

2 آباد شاہ پوری، **سید بادشاہ کا قافلہ**، (البدر پبلیکیشنز: لاہور، 1998ء)، ص111

پورے واقعہ کو سوانح احمد میں مولوی محمد جعفر نے ذکر کیا ہے۔ سید صاحب نے جہاد فی سبیل اللہ کا آغاز کیا۔ فریضہ حج کے بعد عام بیعت کا سلسلہ شروع ہوا۔

"30 جولائی 1861ء چار سو مردوں عورتوں اور بچوں رائے بریلی سے کلکتہ روانہ ہوئے اور راستے میں پٹنہ مونگیر بنارس اور آلہ آباد کے ہزاروں آدمیوں کو ہدایت دی۔"[1]

سید احمد شہید کی زندگی پر غور کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ شاہ عبد العزیز کے خواب کی زندہ تعبیر ہے۔ جو انہوں نے دیکھا کہ:

"رسول جامع مسجد دہلی میں تشریف فرماہیں اور دور دور سے لوگ زیارت کے لیے آرہے ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں ایک عصا مبارک دے کر کہا کہ دروازے پر بیٹھ جاؤ اور جو آنا چاہے اُسے اپنا حال بیان کرنے کے لیے اندر آنے دو۔ جب انہوں نے اس خواب کا ذکر مظہر جاناں سے کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ سے آپ کے کسی مرید سے رسول اللہ ﷺ کے دین کی ہدایت کا سلسلہ شروع ہو گا۔"[2]

شاہ عبد العزیز کے مریدین پورے برصغیر میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے بعد ان کے خاندان نے بھی سید احمد کی بیعت کی۔ شاہ عبد العزیز نے سید احمد کے خواب کو اشارہ غیبی تصور کیا۔ مولانا عبد الحئی اور شاہ محمد اسماعیل نے سید احمد شہید کی بیعت کی۔ اور اس کے بعد شاہ اسحاق صاحب بھی سید احمد کے حلقہ میں شریک ہوئے۔ یہ حضرات علم و عمل میں مشہور اور شاہ عبد العزیز کے بعد برصغیر میں اہل علم لوگ مشہور تھے۔ ان کی بیعت سے مجلس شوریٰ مکمل ہوئی اور شاہ صاحب کے خاندان نے سید احمد کی بیعت کی۔ سید احمد اپنے کردار اور گفتار میں اخلاص کا نمونہ تھے۔ عبد الحئی اور شاہ محمد اسماعیل کی وجہ سے پورے ہندوستان سے لوگ آپ کی بیعت کے لیے آنے لگے۔ شاہ اسماعیل اسلامی موضوعات پر مدلل تقریر کرتے جس سے لوگ بے حد متاثر تھے۔ برصغیر میں یہ دور شدت پسندوں کا تھا۔ جس میں سکھ اور انگریز دہلی تک چھائے ہوئے تھے۔ ان کی عملداری میں رہتے ہوئے ان کے خلاف بغاوت اور جہاد کی بنیاد جہاد فی سبیل اللہ کی بجائے ایک بغاوت تصور کی جاتی۔ وہاں رہتے ہوئے ان سے مقابلہ کرنا ایک طرح کی ناکام کوشش ہوتی اور مسلمانوں کی جگ ہنسائی ہوتی۔ اس لیے سید احمد شہید کی سرکردگی میں پورے برصغیر کے دورے کیے۔

سماجی و معاشرتی اصلاحات

وقت کی ضرورت کے پیش نظر سید شہید اپنے قافلے کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ اور مختلف علاقوں میں دعوت و تبلیغ کا کام کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ گوالیار، ٹونک، سندھ، کوئٹہ، پشاور، قندھار، چارسدہ اور نوشہرہ ان علاقوں میں آپ نے اپنے مراکز قائم کیے۔ اور سکھوں کے خلاف باقاعدہ طور پر جہاد کا اعلان کیا۔ اور سید احمد شہید امیر

1 محمد اکرم، شیخ، **موج کوثر**، ص22

2 مہر، غلام رسول، **سید احمد شہید**، ص114

جماعت مقرر ہوئے۔ ان علاقوں کے سردار اس اتحاد میں شریک ہوئے اور اپنے علاقوں میں شرعی احکام کے کا نفاذ کا اعلان کیا۔ لیکن شاور کے سرداروں کی غداری کی وجہ سے تحریک کو بعض مقامات پر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

درجہ بالا بحث کا مقصد ان پہلوؤں سے پردہ اٹھانا ہے۔ جو اس تحریک کے مقاصد کا حصہ اس تحریک کی تعبیر و تفہیم کے لیے یہ ضروری ہے ولی اللہی فکر سے جوڑا جائے۔ اور اس کی مکمل جامعیت کو زیر نظر رکھا جائے۔ جو ولی اللہی جماعت کا طرہ امتیاز رہا تھا۔ سید احمد شہید اور شاہ اسحق کی امامت و امارت میں اس تحریک نے اپنے کام اور جامعیت کو ہمیشہ قائم رکھا۔ حقیقت وطریقت، فقہ، حدیث، شریعت وتصوف کے ساتھ دعوت وجہاد کا عمل جاری رہا۔ اسی طرح انہوں نے سنت مستقیم اور تصوف وطریقت سے وابستگی کو برقرار رکھا۔ کیونکہ شریعت الہیہ ان شخصیات میں جذب ہو چکی تھی۔ اور یہ لوگ شاہ ولی اللہ کی جماعت کے بہترین اور سچے جانشین ثابت ہوئے۔

اسی طرح اس تحریک کی فکر کو شوکانی کی فکر سے جوڑا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ امام شوکانی زیدی تھے۔ اور "ارشاد الفحول" کا مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ امام ولی اللہ اور ان کی جماعت اجماع کو شرعی حجت تسلیم کرتے ہیں۔ مولانا حسین مدنی نے آپ کے خطوط جو آپ نے گوالیار کے سردار کو لکھے ان سے یہ نتائج اخذ کرتے ہیں۔ کہ آپ ہندوستان کو اپنی زمین اور ملک تصور کرتے تھے آپ نے ہمیشہ انگریز قوم کو پردیسی یعنی "بیگانگان بعید الوطن" سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ لڑائی کا عزم رکھتے تھے۔ جہاد سے آپ کا مطلب و مراد نہیں تھا کہ آپ برصغیر پر اپنی پر حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ شریعت الہیہ کے نفاذ ہے آپ نے یہ ساری کوششیں کیں۔

> "ہندو اور مسلمان دونوں انگریز کے ہاتھوں پامالی کا شکار تھے۔ آپ کی عرض اجنبی اقتدار سے نجات تھی۔ آپ نے ہندو راجپوت کو توپ خانہ کا امیر مقرر کیا۔ اس سے یہ واضح ہے آپ ہندوؤں کو اپنا محکوم نہیں سمجھتے تھے۔"[1]

سید احمد شہید نے ایک ایسی جماعت کی بنیاد رکھی جس کا محور و مقصود عوام تھی۔ جن کا سربراہ آورہ لوگوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لہذا یہ بات بلاتردد کہی جاسکتی ہے۔ کہ سید شہید نے برصغیر میں ایک عوامی رہنما کا خطاب حاصل کیا۔ انہوں نے پرزور انداز میں مسلمانانِ ہند کے عقائد میں شامل بدعات کا خاتمہ کے لئے جہاد کیا۔

ایک مسلم انداز فکر ہے کہ ہمارے ہاں برصغیر کی تمام تاریخوں صرف ہندو مسلم تضاد و فساد کے ضمن میں دیکھا جاتا ہے۔ ہر ایک بات کو ضرورت سے زیادہ آسان اور اور حقیقی طور پر قبول کیا جاتا ہے۔ تحقیق کے لئے جس ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اکثر ناپید ہے۔ سیرت سید احمد شہید کے فکری پہلوؤں کو سمجھنے اور تاریخ سیرت کا

---

1 مدنی، حسین محمد، مولانا، **نقش حیات**، ج2، ص11

مطالعہ کرنے کے بعد اس بارے میں درجہ ذیل امور واضح کرنا ضروری ہے۔سید شہید کی تحریک ولی الٰہی تحریک کا شعبہ تھی۔ جن کا اولین پہلو دعوت وتربیت کے شعبہ میں کام کرنا تھا۔ تجدید اور اتباع سنت کا موقف ایک رہا۔

جس طرح ولی اللٰہی جماعت نے فرقے اور مسلک کے فروغ سے اجتناب کیا اسی طرح سید احمد کی جماعت نے دین الٰہیہ کے نفاذ کی بھرپور کوشش کی۔جماعت ہمیشہ مسلمانوں کو ہر طرح کے جبر اور ظلم وستم سے بچانے کے لیے کوشاں رہی۔سید احمد شہید فکر اسلامی کی تشکیل نو اور اس کے مؤیدین میں انیسویں صدی کے اوائل کے مفکرین میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

مولانا قاسم نانوتوی اور ان کے رفیق ومعاون مولانا رشید احمد گنگوہی نے دیوبند کے مقاصد میں اس بات کی وضاحت کہ اس مدرسہ کے قیام کا مقصد عالم اور ایک عام مسلمان کے درمیان از سر نو ایک تعلق وربط پیدا کرنا ہے۔ تاکہ از سر نو ملت اسلامیہ کی مذہبی وثقافتی شناخت کو تعمیر کیا جائے۔جدید علوم کی جگہ روایاتی نصاب تعلیم کو مرتب کرنے کا مقصد یہ تھا کہ جدید طبعیاتی علوم تو باآسانی سرکاری سکول اور کالجوں میں میسر ہیں جبکہ روایاتی علوم غیر محسوس طرح سے مفقود ہوتے جارہے ہیں مسلم قوم اور امت کی تشکیل کا انحصار ودارومدار اسی بات پر ہے کہ اپنے رواتی ورثہ کو محفوظ کیا جائے۔[1]

قدیم اور روایاتی اسلامی نصاب تعلیم کو عام کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا تاکہ یہ نصاب اسلامی اور مغربی عقلیت پسندی کے درمیان ایک پل کا کام سرانجام دے سکے۔اور اگر مدرسہ سے فارغ التحصیل کوئی طالب علم چاہے تو وہ اپنی دینی تعلیم مکمل کرنے کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ لے سکے اور علوم جدیدہ اور روایات اسلامیہ کو مکمل طور پر سمجھنے کے قابل ہو۔مولانا قاسم نانوتوی کی تصانیف کی روشنی میں ایک جانب توجہ شخصیت اور علم وعمل میں ایک کامل اور دانشمند آدمی تھی۔ آپ نے برصغیر میں بدلتے حالات کے پیش نظر معاشرتی اصطلاح کے لیے بہترین اقدامات اٹھائے۔

مولانا قاسم نانوتوی اور ان کے رفقاء کے ساتھ سے دارالعلوم روایتی دینی درس گاہ اور اعلیٰ درجہ کا امتیازی مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔اس نے مجموعی طور پر خیر آباد، دہلی اور لکھنو کی روایات اور اسلوب اپنے اندر سمویا۔دینی نصاب میں علم الکلام، یونانی فلسفہ، اقلیدس، علم فلکیات، طب، عربی وفارسی قواعد، اصول فقہ اور حدیث وتفاسیر شامل رہے۔اول اس نصاب کی مدت تکمیل دس سال تھی جس کو بعد میں چھ تبدیل کر دیا گیا۔

پورا تعلیمی نصاب ایک سوچھ کتابوں اور متون پر مشتمل تھا۔ عوام کے مسائل کے لیے 1893ء ایک شعبہ "افتاء" قائم کیا گیا جو معاشرتی وسیاسی نیز گھریلو مسائل کا فقہی حل، پنچائتوں اور سرکاری عدالتوں کے

1 گیلانی، مناظر احسن، **سوانح قاسمی** (مکتبہ دارالعلوم، دیوبند، 1955ء)، ص292

دیئے گئے فیصلوں پر نظر ثانی کے حق پر محیط تھا۔[1]

مولانا نانوتوی ایک اور بہترین معلم ماہر تعلیم تھے۔ انہوں نے شاہ ولی اللہ کے رائج کردہ تفاسیر اور احادیث کی کتب کو نصاب کا حصہ بنایا اور دیگر چہ علوم کو مناسب انداز میں نصاب کا حصہ بنایا اس طرح یہ نصاب مولانا نانوتوی کا مرتب کردہ نصاب ایک منفرد انداز اختیار کر گیا۔ جو اس وقت کا رائج تمام نصابوں کا جامع تھا۔ اِس سے مولانا قاسم نانوتوی کے فکری اور اساسی نظریہ تعلیم کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی جن کو شارح اور ترجمان قاسمی بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے حضرت قاسم نانوتوی کے عصری علوم سے تعلق کو واضح کرتے ہوئے لکھا:

"ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس نصاب کو پڑھ کر فارغ ہونے والوں میں علوم جدیدہ حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے گویا علوم جدیدہ کی تعلیم مقدمہ بھی دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نصاب بن سکتا ہے اور چاہا جائے تو اس سے بھی کام لیا جاسکتا ہے۔"[2]

اس یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا نانوتوی عصری تعلیم کے مخالف نہ تھے بلکہ وہ اس بات کے قائل رہے کہ روایت کی پاسداری سے طلبا میں یہ شعور پیدا ہو گا صاف اور سیدھا کھرا کیا ہے۔ روایتی علوم کی تحصیل ایک مسلمان طالب علم کے اندر اچھائی اور برائی میں تمیز پیدا کر دے۔

"مولانا نانوتوی عصری علوم کی اہمیت سے بھی غافل نہ تھے وہ اس بات کے قائل رہے عصری اور روایتی تعلیمی مخلوط نصاب تعلیم کا نتیجہ گا کہ طلبا کسی علم و فن میں مہارت حاصل نہ کر سکے گا اور نہ اسے جدید علوم حاصل ہو سکیں گے اور نہ نہیں وہ روایتی علوم میں فاضل ہو سکے گا۔"[3]

روایتی علوم اور عصری علوم کی ترویج

مولانا نانوتوی اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ مدارس کی قدیم تاریخ اٹھا کر دیکھی جائے تو قدیم و جدید کا امتزاج نظر آتا ہے۔ جب عصری اور روایتی علوم الگ الگ نہ تھے۔ ادارے الگ الگ نہیں تھے امام غزالی ہوں یا ہوں یا بو علی سیناسب کا رہن سہن اور لباس ایک جیسا تھا مید ان الگ الگ تھے۔

"انہیں مدارس سے فارغ التحصیل سرکاری ملازمتوں پر فائز ہوتے تھے۔ اس ہے یہ ضروری ہے کہ یکسو ہو کر دینی تعلیم کو حاصل کیا جائے۔ مولانا اسیر ادروی نے لکھا کہ مولانا نانوتوی نے سر سید احمد خان کی کوششوں کی جفاکشی کی تعریف کی اور سراہا۔"[4]

مولانا نے کبھی انگریزی سکولوں کے قیام کو ناپسند نہیں فرمایا۔ بلکہ ان کا یہ نظریہ رہا کہ جن لوگوں پڑھنا ہیں وہ مدرسہ

---

1 محبوب رضوی، **تاریخ دیوبند**، ص120

2 گیلانی، مناظر احسن، مولانا، **سوانح قاسمی**، ص280

3 اسیر ادروی، مولانا، **مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے**، ص162

4 اسیر ادروی، رح مولانا، **یات وکارنامے**، ص219

کی تکمیل کے بعد دیگر علوم میں مہارت حاصل کریں۔ اور آپ نے ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی کی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے بڑے احسن انداز میں مولانانانوتوی کے فلسفہ تعلیم کو پیش کیا۔

"کہ مولانا اس بات کے قائل تھے کہ دانش مندی سے پہلے اسلامی علوم و نصاب کو ختم کر لیا جائے کیونکہ ان کے بغیر تفسیر، شرح احادیث فقہ کی کتب کو با آسانی سمجھنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی اور بڑے واضح انداز میں اپنی تجویز کو پیش کیا کہ دینی علوم کی تعلیم بعد مسلمان بچوں کو علوم جدیدہ کی تحصیل کے لیے سرکاری مدارس میں داخل کیا جائے۔"[1]

زبان ولسان کے حوالے سے آپ کا موقف بڑا واضح رہا کیونکہ اگر مولانانانوتوی کی زندگی پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آپ کی زندگی کا بڑا حصہ حق و باطل میں فرق واضح کرنے میں گزرا۔ آپ کی زندگی اشاعت دین اور دعوت و تبلیغ میں صرف ہوئی دیوبند کی تاریخ آپ کو ایک متکلم کے طور پر متعارف کرواتی ہے۔

کیونکہ آپ نے عیسائی پادریوں پنڈتوں کے ساتھ خوب مناظرے کیے وہ مخالفین کے ادب سے کافی حد تک واقفیت رکھتے تھے۔ مولانا ادروی نے جس واقعہ کو ذکر کیا اس سے اس بات کی اہمیت سمجھا جا سکتا ہے کہ مولانا جب آخری حج کے سفر پر روانہ ہوئے تو جہاز کے کپتان نے لوگوں کا رجحان مولانا کی طرف محسوس کیا کپتان جو خود اٹالوی تھا اُس نے جو لوگ انگریزی جانتے تھے ان سے مولانا کے متعلق سوال کیا تو معلوم ہوا کہ مولانا صاحت کی وجہ شہرت کیا ہے اسے شوق ہوا کہ مولانا سے مذہبی موضوعات پر بحث کرے اور ملنے کی خواہش کو ظاہر کیا مولانا صاحب نے ترجمان کی مدد سے اُس سے گفتگو کی۔ اس واقعہ کا مولانا پر گہرا اثر ہوا انہوں نے اس خواہش اظہار کیا کہ واپسی پر انگریزی زبان سیکھیں گے۔ کیونکہ جو بات آپ براہ راست سمجھا سکتے ہیں اور دلائل سے قائل کر سکتے ہیں وہ فوائد کسی ترجمان کے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد دیوبند میں مطالعہ ادیان کو خصوصی توجہ حاصل ہوئی اور تمام مذاہب کی بنیادی باتوں کو پڑھنا سیکھنا وقت کا اہم تقاضہ سمجھا گیا۔[2]

مولانا قاسم نانوتوی کی زندگی کا شاندار پہلو ہندوستان میں مدارس کے قیام کی تحریک کا آغاز ہے۔ اس تحریک نے پورے برصغیر میں دینی علوم کے حوالے سے بیداری کی ایک شاندار لہر پیدا کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا پورے ہند میں سینکڑوں کی تعداد میں مدارس کا قیام عمل پذیر ہوا یہ کہنا درست ہو گا کے دینی علوم کی ایک طرح سے نشاۃ ثانیہ ہوئی۔ مدرسہ مراد آباد، رامپور اور دارالعلوم دیوبند کی ابتداء مسلمانوں کو علوم دینہ سے شریعیت اسلامیہ سے جوڑنے کے لیے ہوئی۔ مدارس کے قیام کی اس تحریک نے برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا شریعت سنت کی تابعداری، اصلاح و تربیت حکومتی اور سیاسی معاملات تذکیر و تصانیف علم الکلام علوم اسلامیہ کی خدمت،

---

1 گیلانی، مناظر احسن مولانا، **سوانح قاسمی**، ج2، ص285

2 اسیر ادروی، مولانا، **مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے**، ص284

ارشادودعوت یعنی ملت اسلامیہ کی تاریخ میں خطہ برصغیر کے حوالہ سے عمومی زندگی اور شعوری زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس سے اس کثیر الجہت تحریک جس کا آغاز مولانا نانوتوی نے متاثر نہ کیا ہو۔[1]

اس دور میں خصوصاً ہندوؤں اور عیسائیوں کی ایک نئی جماعت آریہ سماج اسلام کے خلاف محاذ کھول رکھا تھا۔ مولانا قاسم نانوتوی نے ہر ممکنہ طور پر ان کے گھڑے گئے الزامات کا رد کیا۔ خواہ وہ میدان وعظ و اصلاح کا ہو یا تعلیمات و تصانیف مولانا قاسم نانوتوی وقت کی ضرورت کے پیش نظر ویسا ہی جواب دیا اور شریعہ اسلامیہ پر ہونے والے اعتراضات کا مکمل دفاع کیا۔

مولانا احمد رضا بریلوی برصغیر کی ایک نامور شخصیت رہے۔ جنہوں نے تقدیس الہی، رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام کی عظمت عظمت و تقدس، مقام اولیا اللہ، فلسفہ کے خلاف اسلامی افکار و نظریات، جھوٹے اور فریبی صوفیوں کی شرع کے خلاف حرکات و سکنات اور بدعات کا رد کیا۔

سرفراز خان صفدر لکھتے ہیں:

> مولانا احمد رضا بریلوی نے اسلام کے بنیادی عقائد، توحید، رسالت و نبوت، حیات بعد الموت، فرشتوں، یوم القیامہ اور خیر و شر کی تقدیر ایمان، ادب واحترام اور تعلیم ان کی فکر کا بنیادی عنصر رہا۔ تمام صحابہ اکرام اور ازواج مطہرات کی عظمت اور مصلحین امت کو اللہ کی بارگاہ سے ملنے والے اعزازات کو تسلیم کرنا اور علم کو اللہ کی رضا ماننا۔ بیسوی صدی میں انہوں نے جس فکر کو ابھارا اور برصغیر ہند میں بے حد مقبول رہے۔ اس کا زیادہ تر تعلق فروعی اور ثانوی مسائل سے ہے۔ جن میں سے تصور شیخ، قیام میلاد مصطفی، رسول اللہ کی موجودگی کا تصور، فاتحہ خوانی، چہلم برسی وغیرہ کے تصور۔[2]

انہوں نے اس بات سے استدلال کیا کہ رسول اللہ ﷺ پر جب درود پڑھا جاتا ہے تو وہ درود کا جواب دیتے ہیں۔ آپ مسلم امہ کے حالات اور اعمال سے واقف ہیں۔ ختم نبوت سے انکار کرنے والے دائرہ اسلام سے خارج ہیں اور اہل بیت اور صحابہ اکرام کی محبت کو ایمان کا جزو قرار دیتے ہیں۔

شیخ محمد اکرم لکھتے ہیں:

> "مولانا احمد رضا بریلوی نے بے حد شدت سے حنفی طریقوں کی حمایت کی اور انہوں نے ہمیشہ امام ابو حنیفہ کے مقلد کی حیثیت سے ہی فتوی دیا۔ اور حنفی مذہب کی تائید میں ہی عرس، تصوف، گیارہویں، میلاد اور نماز میں ہاتھوں کا زیر ناف باندھنا جیسے اعمال کو اپنایا۔ اور اس فکر کی ترغیب دی۔ ان کے نزدیک کسی بھی کلمہ گو مسلمان کو مشرک یا بدعتی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کسی نئے اچھے کام کو بدعت حسنہ سمجھتے ہیں۔ جبکہ اگر کوئی کام دین کی

---

1 کاندھلوی، نور الحسن راشد، **حالات طیبب قاسم نانوتوی**، (کاندھلہ: انڈیا، 2009ء)، ص 65

2 محمد سرفراز خان صفدر، ***تفریح الخواطر رد تنویر الخواطر***، (ادارہ نشر و اشاعت نفرۃ العلوم، 1977ء)، ص 58

تعلیمات کے خلاف یا اس کے متصادم ہو تا تو اسے بدعت سیئہ قرار دیتے ہیں"۔[1]

عقائد اور افکار میں احمد رضا بریلوی سلف صالحین اور متقدمین کے مقلد نظر آتے ہیں۔ انہوں نے سیاسی اور مذہبی امور میں احیائے فکر اور تجدید تطہیر کے فرائض سر انجام دیتے۔ مولانا بریلوی کلمہ گو کو مسلمان قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس قول و عمل میں روح اسلام کو جیتا جاگتا دیکھنے کے قائل ہیں۔ کسی بھی فعل میں خواہ وہ تاریخی ہو، تہذیبی ہو، یا تمدنی و سماجی اس حد تک چھوٹ کے قائل رہے کہ اس قول و عمل سے شریعت متصادم نہ ہوں۔ وہ اس شخص کو "بدعتی" قرار دیتے ہیں۔ جو دین میں نئی نئی باتوں کو داخل کرے۔ اور اس شخص کا تعاقب کرتے تھے جو تجدید کے بہانے جو بے راہ روی اختیار کرتا تھا۔ انہوں نے معاشرہ کے رسوم و رواج جو خلاف شرع تھے تنقید کی ہے۔[2]

فکر اسلامی کی تجدید و تطہیر

احمد رضا خان اس بات سے استدلال کرتے ہیں۔ کہ اگر کوئی شخص فرایض و سنت کو چھوڑ کر مستحبات اور مباحات کے پیچھے لگا رہے۔ تو سید بریلوی کے ہاں ایسے لوگوں کی نیکیاں مردود ہیں۔ وہ اس تقسیم کو بھی ناپسند اور رد کرتے ہیں کہ شریعت اور طریقت کو الگ الگ قرار دیا جائے۔ کیونکہ عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ جس کا کوئی پیر و مرشد نہیں اس کا پیر ابلیس ہے۔ احمد رضا بریلوی اس کا رد کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:

> " انجام کار راستگاری کے لیے صرف نبی محمد کو مرشد جاننا کافی ہے لیکن وہ بیت اور مریدی کے خلاف نہیں اصلاح باطن کے لیے اسے مفید قرار دیتے ہیں۔ اس بات سے بھی استدلال کرتے ہوئے۔ اس کا رد پیش کیا ہے۔ کہ مزارت پر سجدہ تعظیمی کفر و شرک کے سوا کچھ نہیں"۔[3]

انہوں سجدہ تعظیمی کے خلاف ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور لکھتے ہیں:

> "سجدہ حضرت عزت عز جلالہ کے سوا کسی کے لیے نہیں۔ اس کے غیر کو سجدہ عبادت تو یقینا اجماعا شرک و کفر مبین ہے۔ اور سجدہ تحیت حرام گناہ کبیرہ بالقین گناہ ہے"۔[4]

تبرکا بھی مجسمے اور تصویریں گھروں میں لگانے کی ممانعت کرتے ہیں۔ البتہ نعلین مبارک اور قبہ شریف کے عکس جائز احسن قرار دیتے ہیں۔ مرنے کے بعد کی رسومات فاتحہ چہلم اور برسی وغیرہ کی روح کو جائز قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی غیر ضروری لوازمات بے اصل قرار دیتے ہیں اور غلط تصور کرتے ہیں۔ اسی طرح ثواب

---

1 محمد اکرم، شیخ، **موج کوثر**، ص16

2 بریلوی، احمد رضا خان، **اعلام الاعلام**، (مطبوعہ بریلی، 1304ھ)، ص15

3 بریلوی، احمد رضا خان، **الزبدۃ التزکیہ لتحریم سجود التحیہ**، (مرکز اہل سنت، برکات رضا: احمد رضا روز فور بند ابھند، 1998ء)، ص6

4 بریلوی، احمد رضا خان، فتاوی افریقہ السنیۃ الانیقہ (مکتبہ قصہ ملت، دہلی)، ص124

کی نیت سے اس رسم کی تائید نہیں کرتے کہ کھانا سامنے رکھا جائے البتہ اگر کوئی رکھ لے اور اسے بعد میں تقسیم کر دیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ میت کی فاتحہ اور ایصال ثواب کے لیے غرباء اور مساکین کو امراء اور رشتہ داروں پر فوقیت دیتے ہیں۔[1]

اسی طرح انہوں نے زیارت قبور کے مسئلہ پر عورتوں کے قبرستان جانے کی سختی سے ممانعت کی اور رسالہ لکھا۔ "جمل النور فی نہی النساء عن زیارۃ القبور" مگر رسول اللہ ﷺ کی قبر کی زیارت کو اس سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ اور ان کے قبر کی زیارت احادیث صحیحہ سے ثابت قرار دیتے ہیں۔ البتہ بزرگان کی قبور کی زیارت اور مزاروں پر جانے سے روکتے ہیں۔ اس بات سے استدلال کرتے ہیں۔ قبروں پر چراغ جلانا بدعت ہے اور مال کا ضیاع کرنا ہے۔ البتہ یہ دلیل دیتے ہیں۔ کہ اگر مزار نمازیوں کے راستہ میں ہو تو چراغ جلانے سے فائدہ ہو اس صورت میں مستحب ہے۔ ان کے نزدیک وہ کام جس سے دینی فائدہ اور دنیوی نفع حاصل نہ ہو وہ بے کار ہے۔ اور ایسے کاموں میں مال خرچ کرنا اسراف ہے اور اسراف اسلام میں حرام ہے۔[2]

چونکہ برصغیر میں خانقاہوں اور مقابر پر عرس اور قوالیوں کا رواج تھا۔ اور اعراس کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا تھا۔ سید احمد رضا اس قوالیوں کا رد کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایسے اعراس وغیرہ میں شرکت کی ممانعت کرتے ہیں۔ جہاں مزار پر قوالی کا اہتمام ہو انہوں عرس کے جواز کا فتویٰ دیا لیکن اس کو شرعی قیود سے مقید کر دیا ہے۔ کہ اگر دور جدید میں ہونے والے اعراس کو دیکھا جائے تو ان میں کوئی نہ کوئی شرط معدوم نظر آتی ہے۔[3]

سید احمد رضا بریلوی نے ملت اسلامیہ کو ہر طرح کے اسراف سے پرہیز گاری کی تلقین کی۔ وہ بدعات کو مذہب اور معاشرت دنوں کے لیے خراب تصور کرتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس سے نیکی کی رغبت ختم ہو جاتی ہے کیونکہ جب تک دل صاف ہے خیر کی خبر دیتا ہے اور اسی کی دعوت بھی دیتا ہے۔ اور بدعات کی کثرت اسے اندھا کر دیتی ہے۔ اصلاح معاشرہ میں سید احمد رضا بریلوی نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اگر ان کے علوم فنون کی بات کی جائے تو انہوں نے 55 سے زائد علوم پر عبور حاصل کیا۔ جس میں قرآت، تجوید، علوم القرآن، علم حدیث، علم تفسیر، اصول حدیث، علم العقائد والکلام، علم مناظرہ، علم حساب، اصول فقہ، علم حیاۃ، علم ہندسہ، اسماء الرجال، سیر تاریخ، ادب، تصوف اور سلوک وغیرہ۔[4]

مولانا کے جن علوم کا تذکرہ کیا ہے ان پر انہیں تجر حاصل تھا۔ جس کا اندازہ ان کی علوم فنون پر مطبوعہ اور

---

1 محمد حسین، مولوی، **الملفوظ**، (حسینی پریس بریلی، 1956ء)، ص 45

2 بریلوی، احمد رضا خان، **البریق المنار بشموع المزار**، (مکتبہ اعلیٰ حضرت: بریلی)، ص 97

3 بریلوی، احمد رضا خان، **مواہب ارواح القدس کشف حکم العرس**، (نوری کتب خانہ: لاہور، 1324ھ)، ص 14

4 شاہجہان پوری، عبد الحکیم اختر، **الاجازۃ الرضویہ لمبجل مکۃ البھیہ**، (مکتبہ اعلی حضرت: بریلی، 1327ھ)، ص 24

غیر مطبوعہ کتب سے لگایا جا سکتا ہے اردو زبان میں قرآن حکیم کا ترجمہ "کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن " ایک امتیازی، شان کا حامل ہے۔

"اپ کے ہم عصر علماء میں کوئی اپ کا ثانی نہیں خصوصاً فقہ حنفی میں کیوں کہ فقہ حنفی اور اس کے اصولوں کی تمام جزئیات پر ان کی گہری نظر ہوتی ہے۔ ان کے فتاوی اور ان کے رسالہ "کفل الفقه الفاهم فی احکام قرطاس الد را هم "دونوں اس پر کوی دلیل ہیں"۔

مولانا احمد رضا خان اپنے ہم عصر اور بعد میں آنے والوں میں دین ادب اور سیاست اور دینی معاملات کے میدان میں عالم اور مفکرین اسلام کے طور پر دائمی تسلیم کیا ہے۔ اور بر صغیر میں کتب و تصانیف میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔[1] سید احمد رضا بریلوی کے علمی، فقہی مناہج و اُسلوب کی بات کی جائے تو بر صغیر میں جن علماء نے فقہ و فتاوی کے ذریعہ لوگوں کی دینی راہنمائی کے سلسلہ کا آغا کیا ان میں سید احمد رضا بریلوی کا نام سر فہرست ہے۔ آپ موسس پر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ آپ کی کتاب فتاوی رضویہ ایک انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ حریت آزادی اور آزادی فکر کی جو راہ مولانا احمد رضا بریلوی نے متعین کی اور آل انڈیا سنی کانفرنس کی تحریک کا آغاز کیا۔ مولانا بریلوی کی فقہی بصیرت اور مذہبی افکار احیائے مذہب اور تجدد و تطہیر میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

بر صغیر کے مسلمانوں میں مسلمانوں میں علمی اور فکری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں جمیعۃ الأنصار اور تحریک ریشمی رومال نے نمایاں کردار ادا کیا۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی علمی شخصیت کی وجہ سے دارالعلوم میں طلباء کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

"آپ کے تلامذہ میں مولانا انور شاہ کاشمیری، عبید اللہ سندھی، مولانا حسین مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور دیگر نمایاں شخصیات شامل ہیں۔ جنھوں نے علمی و فکری اور دین میں نامور جماعتیں تیار کیں۔"[2]

مولانا محمود الحسن اپنے علمی حلقہ میں ایک مشہور و معروف مدرس کی حیثیت رکھتے تھے۔

خیر اور شر میں فرق اللہ نے انسان کے اندر فطری طور پر رکھا ہے اور اسے یہ صلاحیت بخشی ہے کہ وہ اس میں فرق کرنے کی استعداد رکھے سلوک و تصوف اسی آئینہ کا نام ہے جو اس دھند کو واضح کر دیتا ہے اور اچھائی برائی پر غالب آنے لگتی ہے۔ مولانا کی شخصیت سلوک و تصوف کی آئینہ دار تھی۔ آپ کے مسلمان کی حیثیت سے قلبی اطمینان کے لیے اسے ہر مسلمان کی ضرورت قرار دیا۔

"مولانا عبد القادر رائے پوری نے تصوف کو سمجھنے کے لیے جس بات سے استدلال وہ قلب مطمعنہ اور اخلاص کی

---

1 لطیفی، اعجاز انجم، ڈاکٹر، **ڈاکٹر مسعود احمد کی ادبی اور علمی خدمات**، (ضیاء الاسلام: کراچی، 2002ء)، ص 155

2 محبوب رضوی، سید، **تاریخ دار العلوم دیوبند**، (ادارہ اہتمام دار العلوم، دیوبند، 1993ء)، ج2، ص 33

سعی ہے۔ اور کہا کہ تصوف تو عشق خداوندی اور اخلاص پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور اللہ کے احکام کی پیروی ان دونوں باتوں کے بغیر ممکن نہیں۔"[1]

اس میں کوئی شک والی بات نہیں اخلاص کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ دل میں نیک نیتی ڈال دیتا ہے۔ جو انسان کو ایمان کے اعلیٰ درجہ تک لے جاتی ہے۔ بدعات اور تصوف کے نام پر غلط رسوم ورواج جنہوں نے مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ مولانا اس بات سے استدلال کرتے ہیں تصوف اصلاح اور ہدایت و کامیابی کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔

"مولانا محمود الحسن اکثر فرمایا کرتے تھے جیسے جیسے برصغیر کے رہنے والوں ان سے منہ موڑا یہاں بدعات نے گھر کر لیا۔ دار العلوم کی یہ ذمہ داری ہے کہ روایت سے اپنا رشتہ برقرار رکھے۔ کیونکہ اتباع قرآن و سنہ ہی وہ واحد راستہ ہے جو اصلاح و تزکیہ کے راستہ کی گرد کو صاف کر سکتا ہے۔ حضرت شیخ الہند بھی رسول سنت کی پیروی کا اہتمام کرتے وہ فرماتے کہ حقیقی منزل صرف اتباع رسول میں ہی مضمر ہے۔"[2]

جمعیۃ علمائے ہند کی تحریک کا آغاز دار لعلوم دیوبند سے ہوتا ہے جو صرف ایک دینی۔ تحریک ہی نہیں بلکہ یہ مسلم تہذیب اور اسلامی علوم وافکار کا ایک بین الاقوامی مرکز ہے۔ اس کے تہذیبی اور ثقافتی تعلق عالمی اداروں سے وابستہ ہیں۔ اور پوری دنیا میں بسنے والوں لوگوں تک اس کے اثرات شعوری اور غیر شعوری طور پر پہنچے ہیں۔ اور اس کا پھیلاؤ صرف ریسرچ سکالرز یا علمی شخصیات تک محدود نہیں رہا بلکہ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ افراد عرب و عجم حکومتی اہل کاروں اور میڈیا کے افراد بھی اس مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ بانیان دار لعلوم کی تقاہت زرف نگاہی اور دور بینی کی مکمل صورت درالعلوم دیوبند ہے۔ جس نے روایت کی حفاظت میں ہر ممکنہ کوشش کی اور بعد میں آنے والے لوگ اس تحریک کا واضح ثبوت ہیں۔

انیسویں صدی میں تحریک ازادی کے نتیجہ میں پوری استعماری طاقت کی زیادتیاں بڑھتی گئیں جس کے نتیجے میں پوری دنیا خصوصاً عالم اسلام پر قبضہ ہونے سے ایک عالمگیر سیاسی اور مذہبی وملی اور ثقافتی بحران پیدا ہوا اور اگر عالم اسلام پر نگاہ ڈالی جائے تو برصغیر کے مسلمانوں کی طاقت اور قوت غور وفکر بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ اس سارے ماحول میں دیوبند کی سر زمین سے اٹھنے والی تحریک نے احیائے مذہب کی اواز بلند کی جبکہ ہر طرف بد اعمالیوں، بدعات، خرافات عروج پا چکی تھی اور اسلام کے نام پر طرح طرح کی رسومات کا انعقاد کیا جاتا تھا لیکن علمائے ہند کی اس جماعت نے علمی روایت کو ابھارنے کا بھرپور اہتمام کیا جس کے اثرات بعد میں انے والے وقت کے لوگوں نے واضح طور پر محسوس کیے۔ صرف نصف صدی کے اندر ہی اس کی صدائے حق پورے برصغیر میں واضح طور پر سنائی دینے لگی۔

---

1 ندوی، سید ابوالحسن، **سوانح مولانا عبد القادر رائے پوری**، ص299

2 بجنوری، عزیز الرحمن، **تذکرہ شیخ الہند**، ص101

"دینی تحریک" کہ اغاز کے طور پر اگر دار العلوم کو دیکھا جائے تو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی نشاط ثانیہ میں دارالعلوم دیوبند کی مسلسل تبلیغی اور تعلیمی کوششوں کا بڑا کردار رہا ہے"۔[1]

دارالعلوم دیوبند نے جس مقاصد کے تحت اپنی ابتداء کی انتہائی ثابت قدمی سے ان کی تکمیل میں سرگرم رہا۔ مغربی استعماری طاقتوں کے حملوں کے باوجود فکر وخیال کے ہر عمل کو جاری رکھا۔ جو مسلمان جمود اور تعطل کا شکار تھے ان کی روشنی کی نوید ثابت ہوا۔ اصلاح خلق کا کوئی بھی حصہ یا پہلو خواہ اس کا تعلق ارشاد و تبلیغ سے ہو یا تذکیر و تعلیم یا تربیتی پہلوؤں سے ہو اسے تشنہ نہ چھوڑا۔ دارالعلوم دیوبند نے ملت اسلامیہ کی اصلاح و تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ دار العلوم نا صرف ایک تعلیمی بلکہ مستقل تحریک اور تجدد دین کا شاندار مرکز رہا ہے۔

احیائے اسلام کا مراکز

اگر اس کی حیثیت کو تمام وجود سے بالاتر ہو کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے برصغیر کہ مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں دارالعلوم دیوبند ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ یہ علوم دینیہ کی تبلیغ اور ذہنی نشوونما اور ملی وثقافتی جذبات کی حوصلہ مندیوں کا ایک مرکز ہے۔ جس پر مسلمانوں نے ہمیشہ بھروسہ کیا ہے جس طرح ایک دور میں یونانیوں کے علوم کو بچانے کی عربوں نے شاندار کوشش کی تھی اسی طرح چودویں صدی میں علمائے دیوبند نے نہ صرف علوم دینیہ اور اسلامی اقدار کے تحفظ اور بقا کی کوشش کی بلکہ معاشرتی سیاسی اور ثقافتی زندگی پر بھی نمایاں اثرات مرتب کیے۔

سیاسی مصالح کے پیش نظر انگریزوں نے اسلامی علوم وفنون اور اس کی درس و تدریس کی قدیم درسگاہوں کو عمومی طور پر ختم کر دیا۔ اسلامی حکومت ختم ہوگئی اس وقت اس بات کی ضرورت کو سختی سے محسوس کیا گیا نہ صرف اسلامی فنون اور تہذیبی عناصر کی بقا کے لیے بلکہ دین و ایمان کی بقا اور تحفظ کے لیے ایک ایسی تحریک کا اغاز کیا جائے جو مسلمانوں کو بے دینی کے درپیش فتنہ سے بچا سکے۔ دارالعلوم کا قیام اس سوچ کا پیش خیمہ تھا۔

جو لوگ دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے انہوں نے تزکیہ اخلاق تصانیف اور تالیف فتاوی خطابت مناظرہ حکمت و صحافت میں جو خدمات سر انجام دی وہ کسی خاص طبقہ کے لیے نہیں بلکہ اس سے پورے برصغیر کے لوگوں نے فوائد حاصل کیے۔ مولانا یوسف لدھیانوی نے دیوبند کی تحریک کو "تجدید دین" کی تحریک کا نام دیتے ہوئے تجزیہ کیا اور کہا کہ:

"تجدید احیائے دین کی جس تحریک کا اغاز شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور سرسید احمد شہید جس امانت کے اہل ٹھہرے دارالعلوم دیوبند اس امانت کا صحیح حقدار ثابت ہوا کوئی اس کو علوم دینیہ اور مسائل شریعہ کی یونیورسٹی قرار دیتا ہے اور کوئی اس کو مجاہدین کی تربیت سازی کی درسگاہ اور کسی کے پاس دارالعلوم کی تعریف ایک دعوت و تبلیغ اور سلوک و تصوف کے مرکز کی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مجددین کا سلسلہ

---

1 محبوب رضوی، **تاریخ دار العلوم**، ج1، ص98

چلا ارہا ہے۔ دارالعلوم اپنے دور کے مجددین کی درسگاہ ہے جہاں وہ تربیت پاتے ہیں۔ اسی سے دعوت و تبلیغ کی تحاریک کا اغاز ہوا جو پورے برصغیر کے علاوہ دنیا کے کونے کونے میں پھیل گئیں۔ مفسرین فقہاء اور محدثین کی ایک ایسی تعداد دارالعلوم دیوبند نے تیار کی جس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اس لیے دارالعلوم دیوبند کو تجدید احیائے مذہبی کی فکر تشکیل کی یونیورسٹی کا نام دیا جائے تو یہی اس کی خدمات کا عنوان ہے"۔[1]

دارالعلوم دیوبند سے ایسی تحریک کا اغاز ہوا کہ برصغیر میں اس طرز کے مدارس کی تعداد میں انے والے سالوں میں کئی گنا اضافہ ہوا۔ کیونکہ انگریزی سامراج کی حکومت کے بعد مدارس کا سابقہ نظام تقریبا ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ کہیں کہیں مدارس موجود تھے جن میں معقولہ علوم کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ اور احادیث مبارکہ اور تفسیر قران کی طرف توجہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ دارالعلوم دیوبند نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی اساسی فکر کو اجاگر کیا۔ اور علوم منقولہ قران و حدیث اور فقہی علوم کو متعارف کروایا۔ بعد میں قائم ہونے مدارس نے دیوبند کے نصاب کو جاری رکھا۔

خلاصہ بحث

اس مفصل بحث سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کے درجہ بالا ذکر کی گئی تمام تحاریک نے برصغیر پر شاندار مذہبی اثرات مرتب کیے ان سب حالات میں ابوالکلام آزاد نے جماعت کی کمی اور اس کی ضرورت کو محسوس کیا اور علمائے ہند کو اس کے قیام کی دعوت دی۔ نظم جماعت کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ برصغیر کے تمام مسلمان شریعہ کے نظام کے تحت ایک صاحب علم و عمل امیر قائد کی اطاعت کرے۔

برصغیر کے مسلمانوں میں مسلمانوں میں علمی اور فکری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں جمیعۃ الأنصار اور تحریک ریشمی رومال نے نمایاں کردار ادا کیا۔ احمد رضا بریلوی کے علمی، فقہی مناہج واُسلوب کی بات کی جائے تو برصغیر میں جن علماء نے فقہ و فتاوی کے ذریعہ لوگوں کی دینی راہنمائی کے سلسلہ کا آغا کیا ان میں سید احمد رضا بریلوی کا نام سر فہرست ہے۔ اسی طرح دارالعلوم دیوبند نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی اساسی فکر کو اجاگر کیا۔

---

1 الدھیانوی، یوسف، مولانا، **ماہنامہ الرشید لاہور**، (دار العلوم دیوبند نمبر، 1973ء)، ص667

نتائج تحقیق

برصغیر میں فکر اسلامی کی ترویج و اشاعت کے ارتقائی ذرائع میں عرب تجار کا برصغیر کے باشندوں سے باہمی ربط اور سامانِ تجارت کا لین دین رہا۔ مؤرخین ابن بطوطہ اور المسعودی کے سفر ناموں میں اس تجارتی رابطے کی تفصیلات موجود ہیں جو بتاتی ہیں کہ مالابار اور گجرات کے ساحلی علاقوں میں اسلامی تعلیمات مقامی لسانی اور ثقافتی فضا میں پھیل گئیں۔ جبکہ اہل ہند سے مسلمان عربوں کے مابین اولین باضابطہ تعلق حجاج بن یوسف کے فاتح سپہ سالار محمد بن قاسم کے لشکری تصادم سے ہوا، جس کی تفصیلات "چچ نامہ" میں درج ہیں۔

مسلمان فاتحین، شہاب الدین غوری، محمود غزنوی، قطب الدین ایبک نے زرعی محنت کشوں کی معاونت کی اور لوگوں کے لیے ایسا نظریہ حیات کا تصور دیا جس میں تخلیقی ترقی کی روح موجود تھی۔ تاریخی دستاویزات "تبقات ناصری" اور "تاریخ فیروز شاہی" میں ان حکمرانوں کے زرعی اصلاحات اور کسان دوست پالیسیوں کا ذکر ملتا ہے۔ جبر و تشدد کا خاتمہ، ذات پات کے غیر انسانی نظام میں پھنسے لوگوں کا اسلام میں پناہ لینا، اور معاشی بوجھ جو جزیہ کی صورت میں موجود تھا، دائرہ اسلام میں آنے کے وجہ سے اس سے نجات حاصل ہونا- یہ ساری باتیں حضرت نظام الدین اولیاء کے "فوائد الفواد" میں درج مکالموں اور واقعات سے ثابت ہوتی ہیں۔

سلطان الدین التمش نے عوامی اصلاحات کو متعارف کرایا، مساجد اور مدارس کی تعمیر کی، اور عام عوام کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ اختیار کیا۔ "مساجد التمش" اور "مدرسہ میر قمرالدین" جیسے ادارے ان کی تعلیمی اور مذہبی سرپرستی کی عملی مثالیں ہیں، جن کا ذکر "تاریخ فیروز شاہی" اور "تاریخ سلاطین دہلی" میں ملتا ہے۔

سلطان غیاث الدین بلبن نے برصغیر میں مرکزی حکومت قائم کی تو علماء ہر شام آتے اور علمی اجتماعات ہوتے جن کی صدارت امیر خسرو کرتے تھے۔ امیر خسرو کی تصانیف "قران السعدین" اور "خزائن الفتوح" میں ان علمی مجالس کا ذکر ملتا ہے۔ علماء، مفکرین اور صوفیاء کرام نے تحریر و تقریر کے ذریعہ سے لوگوں کو برصغیر کے مسلمانوں کو علم و عمل کی ایک نئی راہ دکھائی۔

شیخ ابوالحسن علی ہجویری نے "کشف المحجوب" کی تحریر کے ذریعہ سے خالص عبادات اور صحیح علم و عمل سے خالی ظاہری رسوم کے اختلافات کی وضاحت کی۔ کتاب میں موجود بابِ "المعرفۃ والجہل" میں معرفت کو جہالت کو جان لینے کا نام قرار دیا گیا ہے، جس نے فکر اسلامی کو مقامی خرافات سے نکال کر حقیقت پسندی کی طرف موڑا۔

خواجہ معین الدین چشتی نے ذات پات میں بٹے ہوئے معاشرہ میں انسان دوستی اور تکریم انسانیت کے پہلوؤں کو ابھارا اور اپنے مریدین کے ذریعہ سے اس کی ترویج کی۔ ان کے مریدوں کے درمیان ہندو اور مسلم دونوں طبقات کے لوگ موجود تھے، جیسا کہ "سیر الاولیاء" میں ملتا ہے۔ خواجہ بختیار کاکی کی تعلیمات میں اخلاق ترویج پہلو غالب رہا، جس کی عکاسی "فوائد السالکین" میں ان کے مکالموں سے ہوتی ہے۔ خواجہ نظام الدین اولیاء نے اپنی فکر کی

اساس محبت کے تصور پر رکھی اور گروہی تعصب سے آزاد سماجی انصاف کی بات کی، جس کی تفصیلات "فوائد الفواد" میں درج ہیں۔

مسلمان صوفیاء کرام کی اخلاقی اور روحانی قوت نے نمایاں کردار ادا کیا اور ان ذرائع سے اسلام، احسان اور اخلاق کے خوبصورت رشتے کی وضاحت ہوئی۔ جس کے اثرات آنے والے وقت پر مرتب ہوئے، جیسا کہ بعد کے دور کی کتب "سفینۃ الاولیاء" اور "اخبار الاخیار" میں ان تاثیرات کا ذکر ملتا ہے۔

برصغیر میں معاشرتی بگاڑ، روشن خیالی اور انحرافی نظریات کو فروغ حاصل ہوا تو برصغیر کی اہم شخصیات مفکرین کی جانب سے اصلاح و تجدید کا علم بلند ہوا۔ شرف الدین یحی منیری نے "مکتوبات صد گانہ" میں اور سید محمد جونپوری نے اپنے خطبات میں تبلیغی تحریک کی حکمت عملی اپناتے ہوئے معاشرتی اصلاح اور احیائے فکر کی بات کی، قرآن فہمی، اتباع سنت اور ظاہری شریعت کی حمایت کا بیڑا اٹھایا۔ ان کی تحریک میں سیاسی مقاصد نظر نہیں آتے بلکہ مکمل طور پر مذہبی اور سماجی محرکات کے زیر اثر عمل پیرا دکھائی دیتی ہے، جس کی دلیل ان کے پیروکاروں کے غیر سیاسی کردار سے ملتی ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے درس وتدریس اور تحریری حکمت عملی کے تحت حدیث و فقہ اور فلسفہ و ادب سے اپنے دور میں رونما ہونے والی روشن خیالی کا رد پیش کیا۔ ان کی تصانیف "اشعۃ اللمعات" اور "مدارج النبوۃ" میں اس موقف کی وضاحت ملتی ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے دینی علوم کے فروغ کو تہذیبی بدحالی سے نجات کا وسیلہ تصور کیا اور درس وتدریس میں مصروف رہے، جس کی تفصیلات "اخبار الاخیار" میں مذکور ہیں۔

شیخ احمد سرہندی نے اکبری دور میں پیدا ہونے والی خرابیوں کے تدارک کے لیے تبلیغ و اصلاح کے مختلف طریقے اور ذرائع استعمال کیے۔ "مکتوبات امام ربانی" میں انہوں نے واضح کیا کہ بادشاہ اور عوام اتباع شریعت سے فرار چاہتی ہے اور غیر مسلموں کے افکار سے متاثر ہے۔ انہوں نے معاشرتی اصلاح و تجدید کے لیے انقلاب سلطنت کی بجائے نظریات سلطنت کی تبدیلی کی بات کی، جس کا مقصد اکبر کے دین الٰہی جیسے تجربات کو رد کرنا تھا۔ رسالہ "اثبات النبوہ" لکھ کر آلہ پرستی کے رجحان کا رد کیا۔ آپ نے تبلیغی حکمت عملی کے تحت طبقہ اشرافیہ اور حکمران اعلیٰ پر اصلاحی کوششوں کو صرف کیا، کیونکہ ان کے نزدیک حکمران طبقہ کی اصلاح سے معاشرتی افکار و نظریات میں بڑی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ جہانگیر کے دور میں شرعی احکامات کی تنفیذ اس اصلاحی حکمت عملی کا عملی ثبوت ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا دور برصغیر کے معاشرتی انحطاط کا دور تھا۔ آپ نے "حجۃ اللہ البالغہ" لکھ کر تصوف اور علم کے امتزاج کو احیاء بخشا اور زوال پذیر مسلم معاشرہ کی اصلاح کو ممکن بنایا۔ آپ نے "التفہیمات الإلٰہیہ" میں مشرکانہ رسوم اور عقائد کا رد کیا، قرآن حکیم کے مطالعہ اور فہم کو اس کا علاج قرار دیا۔ اس کے لیے آپ قرآن حکیم کا فارسی ترجمہ "فتح الرحمن" کیا تاکہ اسے لوگوں کے لئے عام فہم بنایا جاسکے۔ اس حکمت عملی کے اظہار سے

لوگوں کے لئے قرآن سمجھنا آسان ہوا۔ آپ نے ان عوامل کی جانب توجہ کی جو ہندوانہ معاشرہ کی وجہ سے مسلمانوں میں ظہور پذیر ہو چکے تھے۔ آپ نے ان کے سدباب کے لئے باقاعدہ تحریک کا آغاز کیا اور تعلیمی نصاب کے مقاصد کا تعین کیا کہ تعلیم کا مقصد انسان کی فطری ادراک کی تربیت کرنا ہے، جیسا کہ "البدور البازغہ" میں واضح کیا گیا ہے۔ انہوں نے اجتہاد کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے دائرہ عمل کو وسیع کیا، جس کی عملی مثال ان کے شاگردوں کے علمی کاموں میں ملتی ہے۔ اس طرح ان تمام نمایاں شخصیات نے برصغیر میں اصلاح و تجدید کی ضروریات اور محرکات کا جائزہ لیتے ہوئے مختلف حکمت عملی کے تحت احیائے فکر کو مؤثر بنایا۔

انیسویں اور بیسویں صدی کے برصغیر میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی جہات کا احاطہ ممکن ہوا۔ اس ضمن میں برصغیر کے نامور مفکرین سید احمد شہید، سر سید احمد خان، مولوی چراغ علی، غلام احمد پرویز، عنایت اللہ مشرقی، عبد اللہ چکڑالوی، سید امیر علی، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا احمد رضا بریلوی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا محمود الحسن، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا حسین مدنی، مولانا ابو الکلام آزاد، علامہ محمد اقبال، سید ابو الاعلی مودودی، مولانا وحید الدین، جاوید احمد غامدی کے افکار و نظریات کے خصوصی مطالعہ کے بعد تین جہات (تجدد پسندی کی جہت، تجدید کی جہت اور روایت پسندی کی جہت) میں تقسیم کیا گیا۔ یہ تقسیم صرف تنظیمی نہیں بلکہ تاریخی شواہد پر مبنی ہے، جس کی تصدیق ان مفکرین کی تصانیف اور آثار سے ہوتی ہے۔

تجدد پسندی کی جہت میں سر سید احمد خان کے افکار و نظریات کے مطالعہ سے اس بات کا احاطہ ممکن ہوا کہ تجدد پسند ذہن چیزوں کے اظہار میں نئے کام اور نئے پن کو متعارف کرواتا ہے۔ سر سید احمد خان نے مسلمانوں کی معاشرتی اور تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کے لئے متعدد موضوعات پر کتب تحریر کیں جن میں قرآنیات، سیرت رسول، تصوف، فلسفہ، تاریخ وغیرہ جیسے موضوعات شامل ہیں۔ "آثار الصنادید" اور "خطبات احمدیہ" جیسی کتابیں ان کے فکری ارتقاء کی عملی مثالیں ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں میں قومیت کے تصور کو ابھارا جس کا اظہار ان کی تحاریر اور تقاریر سے واضح ہوتا ہے، خصوصاً "اسباب بغاوت ہند" میں۔ "تفسیر القرآن والهدى والفرقان" اور "تحریر فی اصول تفسیر" بے شک علماء کے ہاں معتبر نہ ٹھہری ہوں لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اس کے بعد تفاسیر میں عجوبہ پسندی کی شدت میں کافی کمی واقع ہوئی، جس کی مثال بعد کے دور میں لکھی گئی تفاسیر میں ملتی ہے۔ انہوں نے ولیم میور کے الزامات کا رد کرتے ہوئے "خطبات احمدیہ" لکھ کر ازدواج کی حیثیت تین مختلف پہلوؤں سے واضح کی: قانون فطرت کے حوالے سے، معاشرتی حیثیت کے حوالہ سے اور مذہبی حیثیت کے حوالہ سے، جس سے مستشرقین کی آراء کی حوصلہ شکنی ہوئی۔

مولوی چراغ علی نے اپنی تحاریر کے اسلوب سے عیسائی مبلغین جن میں اسپرنگر، جارج سیل اور ولیم میور وغیرہ شامل ہیں کے نظریات کا رد کیا، خصوصاً "تحفۃ الاسلام" میں۔ اس سے عیسائی حکمرانوں کے ماتحت باشندوں کی

سیاسی اور سماجی مساوات کے پہلو نمایاں ہوئے اور نسلی اور لسانی امتیازات کی حوصلہ شکنی ہوئی۔ مقید جدیدیت کے تحت ان کے افکار و نظریات تعمیری نوعیت کی حیثیت رکھتے ہیں، جس کی تصدیق ان کے پیروکاروں کے مابین مسلمانوں کی تعلیمی ترقی سے ہوتی ہے۔

اور غیر مقید جدیدیت کے تحت غلام احمد پرویز، عنایت اللہ مشرقی، عبد اللہ چکڑالوی، احمد دین کال، رفیع الدین ملتانی اور دیگر رفقا جنہوں نے آزاد رجحانات کی طرف سفر کیا اور کوئی بھی تخلیقی سمت قائم کرنے میں ناکام رہے۔ ان کی تصانیف میں "مقام حدیث"، "طلوع اسلام" اور "قرآنی قانون" جیسی کتابیں شامل ہیں جو روایتی اسلامی نظام فکر سے انحراف کی مثال ہیں۔

جبکہ تجدید پسندی کی جہت کے مطالعہ سے اس بات کو تجزیاتی طور پر سمجھا گیا کہ مجدد دین پر معاشرتی گرد و آلود کے پردوں کو ہٹاتا ہے اور تصورات دین کی صحیح وضاحت کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ علامہ محمد اقبال نے تحریری اسلوب کے تحت "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے تصور کو ابھارا جو اسلام کے متحرک اور ارتقاء پذیر ہونے کے کلیدی تصور کا اظہار ہے۔ انہوں نے خرد اور وجدان کو عقل کے مستند ذرائع قرار دیا اور تصور زمان و مکان کی وضاحت کرتے ہوئے آزاد تخلیقی حرکت کے لئے کائنات جنبش و حرکت کو واضح دلیل قرار دیا۔ اپنے خطبہ "اجتہاد" میں انہوں نے مسلم ثقافت و فکر کو بطور دلیل پیش کیا کہ قرآن حکیم کے مطابق کائنات اپنے اندر فروغ پذیری کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور "ہبوط آدم" کی تشریح میں واضح کیا کہ یہ کسی اخلاقی گراوٹ کا نام نہیں بلکہ یہ انسان کے سادہ شعور سے شعور خودی کی طرف پہلا سفر ہے، جو اس کے وجود کی کمزوری کے باعث اس کے اندر موجود ہے۔ یہ اس بیداری کے عمل کا نام ہے جو انسان اپنے اندر نجی علتوں کے باوجود محسوس کرتا ہے۔

تشکیل جدید کے مؤیدین مولانا شبلی نعمانی، سید امیر علی، ابو الکلام آزاد اور دیگر رفقاء نے نئے پیش آمدہ مسائل کو روایت کی روشنی میں حل کرنے کی تجویز کو پیش کیا اور زمانی اعتبار سے ان کے حل کے لیے اجتہاد کا راستہ دکھایا۔ مولانا شبلی کی "سیرۃ النعمان"، سید امیر علی کی "روح اسلام" اور ابو الکلام آزاد کی "ترجمان القرآن" میں ان تجاویز کی عملی مثالیں ملتی ہیں۔ سید مودودی احیائے فکر کی عصری اسلامی بیداری کی تحریک میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ نے اپنی تحاریر، تقاریر اور عملی تحریک سے عملی جدوجہد کا آغاز کیا، دلائل کی قوت اور عمدہ اسلوب سے جدید نظریات و افکار پر بحث کی، جیسا کہ "تفہیم القرآن"، "اسلامی ریاست" اور "اسلام اور جدید معاشی نظریات" میں ملتا ہے۔

روایت پسندی کی جہت کے تجزیاتی مطالعہ سے اسلوب کی وضاحت ہوتی ہے۔ روایت پسندی اس رویہ کا نام ہے جس پر کوئی گروہ صدیوں سے عمل پیرا ہو اور علمی روایت کو باحفاظت اگلی نسل تک منتقل کر دے۔ اس ضمن میں

انیسویں اور بیسویں صدی میں جن نمایاں شخصیات نے کردار ادا کیا، ان میں مولانا قاسم نانوتوی اور ان کے رفقاء مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمود الحسن، مولانا حسین مدنی نے مدارس کے قیام کی تحریک، علوم القرآن، علوم الحدیث اور علم فقہ کی درس و تدریس، تحاریر و تقاریر سے مسلمانوں کو علوم دینیہ سے جوڑے رکھنے کی بھرپور کوشش کی اور عمومی اور شعوری زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر انداز ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور جیسے ادارے اس کوشش کے عملی ثمرات ہیں۔ اسی طرح مولانا احمد رضا بریلوی نے مختلف رسائل اور کتب "فتاوی رضویہ"، "حدائق بخشش" اور "السرع المؤبد" جیسی تصانیف سے کثیر الجہت انداز فکر کو متعارف کروایا اور پوری امت کو جوڑے رکھنے کے لیے علوم دینیہ کو فلاح کا ضامن قرار دیا۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی ان تینوں جہات کے تجزیاتی مطالعہ سے اس بات کی نشاندہی ہوئی کہ ان جہات نے برصغیر پر سیاسی، ثقافتی و سماجی اور مذہبی اثرات مرتب کیے۔ جس کے نتیجہ میں مختلف تحریکوں کا آغاز ہوا: تحریک سید شہید، تحریک علی گڑھ، تحریک خلافت، تحریک ریشمی رومال، ادبی و صحافتی تحریکیں، تحریک جمعیت العلماء ہند، آل انڈیا سنی تحریک، مدرسہ دیوبند کا قیام، ندوۃ العلماء کا قیام، انجمن ترقی مسلمانان ہند، تحریک نسائی، تحریک قیام پاکستان، تحریک جماعت اسلامی و دیگر، جن سے معاشرہ پر دوررس نتائج مرتب ہوئے۔ ان تحریکوں کی عملی کامیابی اور ناکامی کا تفصیلی تجزیہ تاریخی ریکارڈ اور دستاویزات میں موجود ہے۔

سفارشات

مختلف ادوار میں اسلامی فکر کی تشکیل جدید کا تقابلی مطالعہ

بر صغیر میں اسلامی فکر کی تشکیل جدید کے مختلف ادوار کا تقابلی مطالعہ کرنا اہم ہو گا۔ اس مطالعے کے ذریعے یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ کس دور میں کون سے عوامل اور شخصیات اسلامی فکر کی تشکیل جدید میں اہم رہے اور کیسے ان کے نظریات اور اقدامات نے مختلف ادوار میں اسلامی فکر پر اثرات مرتب کیے۔

2۔ بر صغیر کی مختلف تحریکات اور مدارس کا کردار

تحقیق کے دوران بر صغیر کی مختلف اسلامی تحریکات، جیسے دیوبند، بریلوی، اہلحدیث، اور دیگر مدارس کا کردار اور ان کے اثرات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ان تحریکات کے فکری اور نظریاتی پہلوؤں کا تجزیہ کر کے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ کس طرح ان تحریکات نے اسلامی فکر کی تشکیل جدید میں حصہ لیا۔

3۔ جدید تعلیم یافتہ مسلم مفکرین اور ان کے نظریات کا مطالعہ

بر صغیر کے جدید تعلیم یافتہ مسلم مفکرین، جیسے علامہ اقبال، مولانا مودودی، اور دیگر، کے نظریات اور ان کے تشکیل جدید کے عمل میں کردار کا مطالعہ کرنا اہم ہے۔ ان مفکرین کے خیالات اور ان کے اثرات کا جائزہ لے کر موجودہ دور کے چیلنجز کا بہتر طور پر تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔

4۔ سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں کا اسلامی فکر پر اثر

بر صغیر میں سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں کا اسلامی فکر پر کیا اثر ہوا، اس کا تفصیلی مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ یہ تحقیق مختلف سماجی تبدیلیوں، جیسے جدیدیت، مغربی تعلیم، اور سیاسی تبدیلیوں، کے اثرات کا تجزیہ کرے گی اور یہ معلوم کرے گی کہ ان تبدیلیوں نے اسلامی فکر کو کس طرح متاثر کیا۔

5۔ اسلامی فکر کی تشکیل جدید کے نتائج اور مستقبل کے امکانات

بر صغیر میں اسلامی فکر کی تشکیل جدید کے نتائج اور ان کے مستقبل کے امکانات کا تجزیہ کرنا بھی ضروری ہے۔ اس تحقیق کے ذریعے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی فکر کی تشکیل جدید کے عمل نے بر صغیر کے معاشرتی، ثقافتی، اور سیاسی ماحول کو کس طرح تبدیل کیا اور مستقبل میں اس کے کیا اثرات ہو سکتے ہیں۔

فہرست آیات

نمبر شمار	آیات مبارکہ	سورۃ	آیت	صفحہ
1.	اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ	الفاتحہ	4	67
2.	اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ o صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ---	الفاتحہ	7-5	267
3.	وَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ	البقرہ	4	65
4.	إِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیِي أَن یَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا---	البقرہ	26	240
5.	وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا	البقرہ	31	38
6.	وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَ لَكُمْ ---	البقرہ	36	39
7.	قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی ---	البقرہ	38	39
8.	مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ ---	البقرہ	62	62
9.	قُلْ إِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الْهُدَی	البقرہ	120	2
10.	كَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِنَا ---	البقرہ	151	53
11.	وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ---	البقرہ	155	241
12.	لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ---	البقرہ	177	45
13.	یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ	البقرہ	185	57
14.	ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً	البقرہ	208	96
15.	اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ ---	البقرہ	285	62
16.	اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ	آل عمران	19	96
17.	وَ رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ---	آل عمران	49	199
18.	وَ لَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ	آل عمران	83	63
19.	قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ ---	آل عمران	84	65
20.	كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ ---	آل عمران	110	232

.21	قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ سُنَنٌ فَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَانۡظُرُوۡا ---	آل عمران	138-137	267
.22	وَشَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ	آل عمران	159	57
.23	لَقَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذۡبَعَثَ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ ---	آل عمران	164	51
.24	وَاٰتُوا الۡيَتٰمٰۤى اَمۡوَالَهُمۡ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الۡخَبِيۡثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا ---	النساء	3-2	171
.25	يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ ---	النساء	59	55
.26	اِنَّـاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتَابَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَاۤ---	النساء	105	58
.27	اِنَّاۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ كَمَاۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى نُوۡحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ---	النساء	163	149
.28	اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِىۡ ---	المائده	3	48
.29	اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّ نُوۡرٌ ۚ يَحۡكُمُ بِهَا النَّبِيُّوۡنَ ---	المائده	44	197
.30	وَ كَتَبۡنَا عَلَيۡهِمۡ فِيۡهَاۤ اَنَّ النَّفۡسَ بِالنَّفۡسِ ۙ وَالۡعَيۡنَ بِالۡعَيۡنِ ---	المائده	45	197
.31	وَ لۡيَحۡكُمۡ اَهۡلُ الۡاِنۡجِيۡلِ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فِيۡهِ ؕ وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ ---	المائده	47	198
.32	يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ ؕ وَ اِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ ---	المائده	67	53
.33	يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَ الۡمَيۡسِرُ وَ الۡاَنۡصَابُ ---	المائده	90	59
.34	اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ جَعَلَ ---	الانعام	1	274
.35	قد جَآءَكُمۡ بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّكُمۡ فَمَنۡ اَبۡصَرَ فَلِنَفۡسِه ---	الانعام	104	50
.36	وَ اَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ لَئِنۡ جَآءَتۡهُمۡ اٰيَةٌ لَّيُؤۡمِنُنَّ---	الانعام	109	50
.37	اَللّٰهُ اَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ	الانعام	124	64
.38	اَلَا لَهُ الۡخَلۡقُ وَ الۡاَمۡرُ	الاعراف	54	196
.39	لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰى قَوۡمِه فَقَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ---	الاعراف	59	27
.40	إِذۡ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الۡمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمۡ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ---	الانفال	12	218
.41	وَ اَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّةٍ وَّ مِنۡ رِّبَاطِ الۡخَيۡلِ ---	الانفال	60	153
.42	هُوَ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهٗ ---	التوبه	33	56

42	19	یونس	وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ ---	.43
196	40	یوسف	اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ	.44
68	28	الرعد	اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ؕ	.45
49	9	الحجر	اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَه لَحٰفِظُوْنَ	.46
229	43	النحل	فَسْــــئَلُــوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ	.47
57	44	النحل	وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُم---	.48
54	64	النحل	وَ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا ---	.49
246	123	النحل	ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرٰهِيْمَ حَنِيفًا وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ	.50
196	40	الکهف	وَّ لَا يُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا	.51
66	93	مریم	اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا	.52
51	9	طہ	وَ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰی	.53
288	41	الحج	اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ	.54
49	46	الحج	فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُور	.55
166	31	الفرقان	وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ وَ كَفٰی ---	.56
66	22	الشعرا	وَ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَیَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ	.57
55	21	الاحزاب	لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ ---	.58
220	72	الاحزاب	اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ ---	.59
49	29	ص	كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِه وَ لِيَتَذَكَّرَ اُولُوا ---	.60
274	63-62	الزمر	اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ ۚ وَّ هُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ وَّكِيْلٌ ○ لَه ٗ ---	.61
48	30	حم السجدہ	اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ ---	.62
116	23	الشوری	وَمَآ اَسْـــــــــَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ	.63
182	51	الشوری	وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَآئِ حِجَابٍ أَوْ---	.64
222	24	محمد	اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا	.65
36	47	محمد	أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ	.66
96	29	الفتح	هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَه ٗ بِالْهُدٰی وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَه ٗ عَلَى الدِّيْنِ---	.67

197	4-3	النجم	وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰیOاِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی	.68
43	55-50	النجم	وَاَنَّه اَهْلَكَ عَادَا الْاُوْلٰی، وَثَمُوْدَا فَمَآ اَبْقٰی ---	.69
66	25	الحدید	لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ ---	.70
60	2	الحشر	فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ	.71
55	7	الحشر	وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا---	.72
276	9-8	الممتحنہ	لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ لَمْ ---	.73
69	9	الصف	هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی---	.74
60	9	الجمعہ	یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ ---	.75
40	3-1	نوح	اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِه اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ ---	.76
64	12-10	الانفطار	وَ اِنَّ عَلَیْكُمْ لَحٰفِظِیْنَ ۙOكِرَامًا كَاتِبِیْنَ ۙOیَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ	.77
67	15-14	الاعلیٰ	قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰی ۙO وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰی ؕ	.78
38	8-7	الشمس	وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰاهَاO فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰاهَا	.79
63	10-9	الشمس	قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَاOوَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ؕ	.80
48	5-1	العلق	اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَOخَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍOاِقْرَاْ وَ---	.81
219	4-1	الاخلاص	قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌOاَللّٰهُ الصَّمَدُOلَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُوْلَدْ ---	.82

فہرست احادیث

نمبر شمار	حدیث مبارکہ	کتاب کا نام	صفحہ
1	إذا اجتهد الحاكم فأصاب فله أجران، وإذا اجتهد فأخطأ فله أجر واحد	ریاض الصالحین	4
2	أنَّ امْرَأَةً مِن جُهَيْنَةَ جاءَتْ إلى النبيِّ ﷺ، فقالَتْ: إنَّ أُمِّي نَذَرَتْ ---	البخاری	60
3	ان رسول الله ﷺ، لما اراد ان يبعث معاذا إلى اليمن ---	ابوداؤد	58
4	قال كنت فى مجلس من مجالس الانتصار انجاء ابو ---	البخاری	178
5	قالَ يا مُحَمَّدُ أخْبِرْني عَنِ الإسْلامِ، فقالَ رَسولُ اللهِ الإسْلامُ أنْ تَشْهَدَ ---	مسلم	44
6	لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ	مشکوۃ	149
7	لقيت امرأة وجد منها ربح الطيب ينفع ولذيلها اعصار---	ابوداؤد	42

فہرستِ اصطلاحات(Glossary of Terms)

- فکرِ اسلامی (Islamic Thought)– اسلامی نظریات اور اصولوں پر مبنی فکری نظام جو قرآن، حدیث اور اجتہادی اصولوں سے ماخوذ ہے۔
- تشکیلِ جدید (Reconstruction)– کسی فکری یا عملی نظام کی دوبارہ تشکیل، جس میں پرانے نظریات کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالا جاتا ہے۔
- اسلامی احیاء (Islamic Revivalism)– اسلام کی اصل تعلیمات کو دوبارہ زندہ کرنے اور عملی زندگی میں ان کی بحالی کی تحریک۔
- اجتہاد (Ijtihad)– اسلامی قانون میں نئے مسائل کے حل کے لیے قرآن و سنت کی روشنی میں غور و فکر اور استدلال کا عمل۔
- روایتی فکر (Traditional Thought)– اسلامی علوم و نظریات کی وہ شکل جو صدیوں سے چلی آرہی ہے اور قدیم تشریحات پر مبنی ہے۔
- تجدیدِ دین (Religious Renewal)– اسلامی تعلیمات کو وقت اور حالات کے مطابق دوبارہ مؤثر بنانے کا عمل، جیسا کہ مجددین نے کیا۔
- تصوف (Sufism)– اسلام کا روحانی پہلو، جس میں دل کی پاکیزگی، اللہ سے قربت، اور اخلاقی تربیت پر زور دیا جاتا ہے۔
- علم الکلام (Ilm al-Kalam)– اسلامی عقائد اور فلسفے کی بحث، جس میں نظریاتی و فکری دلائل کے ذریعے اسلامی عقائد کی وضاحت کی جاتی ہے۔
- استعماریت (Colonialism)– کسی طاقتور ملک یا قوم کا کمزور اقوام پر تسلط قائم کرنا اور ان کے فکری، سماجی اور سیاسی نظام پر اثر انداز ہونا۔
- اسلامی جدیدیت (Islamic Modernism)– اسلام کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق پیش کرنے کی تحریک، جو روایت اور جدیدیت میں توازن قائم کرتی ہے۔
- تحریکِ دیوبند (Deobandi Movement)– برصغیر میں اسلامی تعلیمات کے تحفظ اور اسلامی تشخص کی بحالی کے لیے شروع کی گئی اصلاحی تحریک۔
- سرسید تحریک (Sir Syed Movement)– سرسید احمد خان کی قیادت میں برصغیر میں مسلمانوں کی تعلیمی اور فکری اصلاح کی کوششیں۔

- مغل دورِ حکومت (Mughal Era)– برصغیر میں اسلامی حکومت کا وہ دور جب مغل بادشاہوں نے اسلامی طرزِ حکومت اور علوم کو فروغ دیا۔
- سیکولرازم (Secularism)– مذہب اور ریاست کو الگ رکھنے کا نظریہ، جس کے تحت مذہب کا ریاستی امور میں کوئی کردار نہیں ہوتا۔
- علمِ حدیث (Science of Hadith)–احادیث نبویہ کی تحقیق، جانچ، اور درجہ بندی پر مبنی اسلامی علم، جو حدیث کے مستند یا غیر مستند ہونے کا تعین کرتا ہے۔
- قرآنی علوم (Quranic Sciences)– قرآن کی تفسیر، تجوید، ناسخ و منسوخ، اور دیگر تحقیقی پہلوؤں پر مشتمل اسلامی علم۔
- اجماع (Consensus)–امت مسلمہ کے علما کا کسی شرعی مسئلے پر متفق ہونا، جو اسلامی قانون سازی میں ایک بنیادی اصول ہے۔

فہرست مصادر و مراجع

القرآن

ابو عمرو منہاج الدین عثمان، طبقات ناصری، (کتب خانہ نورس سٹریٹ اردو، لاہور، س۔ن)

ابو الفداء، اسماعیل بن محمد، تقویم البلدان، (دار صادر بیروت، 1953ء)

اختر احمد، میاں، اقبالیات کا تنقیدی جائزہ (اقبال اکیڈمی: کراچی، 1957ء)

اختر، محمد عباداللہ، خواجہ، مشاہیر اسلام (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1992ء)

اختر، احسان الحق، حضرت شاہ ولی اللہ، (سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، س۔ن)

اسحاق بھٹی، برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 2004ء)

اسماعیل پانی پتی، مکاتیب (دار المصنفین: اعظم گڑھ، 1978ء)

اسماعیل شہید، سید، صراط مستقیم، (دار کتب، دیوبند، 1985ء)

اسیر ادروی، مولانا، مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے، (شیخ الہند اکیڈیمی، دار العلوم دیوبند، 1987ء)

الاصفہانی، حسین بن محمد الراغب، المفردات فی غریب القرآن، (دار العلم للملابیین، بیروت، 2007ء)

اصلاحی، ظفر اسلام، سر سید احمد خان کا تصویر تعلیم، (اسلامک بک فاونڈیشن: دہلی، 2001ء)

الافریقی، محمد بن مکرم بن منظور، لسان العرب (دار صادر، طبع اول، بیروت، 1414ھ)

انصاری، عبد الحلیم، تذکرۃ الصالحین، (دار الاشاعت رحمانیہ پانی پت، انڈیا، 1968ء)

انصاری، مظہر، شاہ ولی اللہ، (فیروز سنز لمیٹیڈ، لاہور، 1985ء)

انیس احمد، ڈاکٹر، اسلامی فکر و ثقافت کی قرآنی بنیادیں (لاہور، 2010ء)

آباد شاہ پوری، سید بادشاہ کا قافلہ، (البدر پبلیکیشنز: لاہور 1998ء)

آزاد، ابو الکلام، مولانا، مسئلہ خلافت، (مکتبہ جمال حسن مارکیٹ: لاہور، 2006ء)

آزاد، ابو الکلام، مولانا، تذکرہ (ساھیتہ اکادیمی، دہلی، 1963ء)

آزاد، ابو الکلام، مولانا، غبار خاطر، (دار الاشاعت: لاہور، 1968ء)

آزاد، ابو الکلام، مولانا، خطبات آزاد، (ساھتیہ اکادمی: نئی دہلی، 1985ء)

آزاد، ابو الکلام، مولانا، خطبہ صدارت تحریری، سالانہ اجلاس جمعیت علماء ہند (رواج پرنٹنگ پریس: دہلی، 1985ء)

البخاری، محمد بن اسماعیل، جامع الصحیح بخاری، (دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1992ء)

برنی، ضیاء الدین، تاریخ فیروز شاہی (سر سید اکیڈمی، علی گڑھ، 1973ء)

بریلوی، احمد رضا خان، اعلام الاعلام، (مطبوعہ بریلی، 1304ھ)

بریلوی، احمد رضاخان، انفس الفکر فی قربان البقرہ، (مکتبہ النور: بریلی، 1962ء)

بریلوی، احمد رضاخان، فتاوی افریقہ السنیۃ الانیقہ (مکتبہ قصہ ملت، دہلی، 1999ء)

بریلوی، احمد رضاخان، مواہب ارواح القدس کشف حکم العرس، (نوری کتب خانہ: لاہور، 1324ھ)

بریلوی، احمد رضا خان، الزبدۃ الزکیہ لتحریم سجود التحیہ، (مرکز اہل سنت، برکات رضا: احمد رضا روز فور بندا بھند، 1998ء)

بریلوی، احمد رضاخان، فتاویٰ رضویہ، (رضافاؤنڈیشن جامعہ نظامیہ: لاہور، 2011ء)

بنگلوری، محمود، تاریخ جنوبی ہند (ناشر ترقی اردو، نئی دہلی: 1947ء)

بہاری، ظفر الدین، حیات اعلیٰ حضرت، (رضا اکیڈیمی: بمبئی، 1399ھ)

بھٹی، محمد اسحاق، فقہائے ہند (ادراہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ، لاہور، 2001ء)

پرویز، غلام احمد، تصوف کی حقیقت (طلوع اسلام ٹرسٹ: لاہور، 1981ء)

پرویز، غلام احمد، شاہکارِ رسالت (طلوعِ اسلام ٹرسٹ: لاہور، 1998ء)

پرویز، غلام احمد، اسباب زوال امت (طلوع اسلام ٹرسٹ: لاہور، 1983ء)

پرویز، غلام احمد، معارف القرآن، (طلوع اسلام ٹرسٹ: لاہور، 1979ء)

پرویز، غلام احمد، معراج انسانیت، (طلوع اسلام ٹرسٹ: لاہور، 1982ء)

پرویز، غلام احمد، نظام ربوبیت، (طلوع اسلام ٹرسٹ: لاہور، 1954ء)

تفتازانی، سعد الدین، التلویح علی التوضیح لمتن التنقیح، الرکن الرابع القیاس، (دار الکتب العلمیہ، بیروت، 2012ء)

تنولی، طاہر حمید، معاصر تہذیبی کشمکش اور فکر اقبال (اقبال اکادمی پاکستان، 2013ء)

ثریا حسین، سر سید احمد خان اور ان کا عہد، (ایجوکیشنل بک ہاؤس: علی گڑھ، 1993ء)

جابری، جمیل، ڈاکٹر، برصغیر میں اسلامی کلچر، (ادارہ ثقافت ملت اسلامیہ: لاہور، 1990ء)

جانباز مرزا، حیات امیر شریعت، (مکتبہ جمال حسین: لاہور، 1996ء)

جعفری، رئیس احمد، سیرت محمد علی (جامعہ ملیہ: دہلی، 1936ء)

جوزی، المنتظم (دار الکتب العلمیہ، بیروت: طبع ثانیہ، 1995ء)

چراغ علی، مولوی، اعظم الکلام فی ارتقاء الإسلام، ج اول (سرسید اکیڈمی: علی گڑھ، 1953ء)

چراغ علی، مولوی، تحقیق الجہاد، (مکتبہ اخوت اردو بازار: لاہور، 1967ء)

چراغ علی، مولوی، تہذیب الاخلاق، (منشر فضل الدین کتب خانہ، 1953ء)

چکڑالوی، عبد اللہ، مولانا، اشاعت القرآن (اشاعت القرآن: لاہور، 1988ء)

چکڑالوی، عبد اللہ، مولانا، ترجمۃ القرآن (مکتبہ اشاعت القرآن: لاہور 1998ء)
حالی، الطاف حسین، مولانا، حیات جاوید، (انجمن ترقی اردو ہند: دہلی، 1939ء)
حسن ریاض، پاکستان ناگزیر تھا، (کراچی یونیورسٹی، پریس، 1970ء)
حقانی، عبد القیوم، مولانا، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی۔ (مکتبہ شیخ الاسلام: عزیز آباد، 1995ء)
خان، اقبال حسن، شیخ الہند مولانا محمود الحسن حیات اور کارنامے، (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 1973ء)
خرداذبہ، ابن القاسم عبید اللہ بن عبد اللہ، المسالک ولممالک، (دار الکتب العالمیہ بغداد، 1929ء)
خلیفہ، عبد الحکیم، ڈاکٹر، اسلام کی بنیادی حیثیتیں (ادارہ ثقافت اسلامی، لاہور، 1975ء)
خلیفہ، عبد الحکیم، ڈاکٹر، خطبات تلخیص اقبال، (بزم اقبال: لاہور، 1988ء)
خورشید احمد، اسلامی نظریہ حیات (شعبہ تصنیف و تالیف کراچی، 1986ء)
ڈار، شبیر احد، انوار اقبال، (اقبال اکادمی: کراچی، 1966ء)
رزمی، ثاقب، اقبال ایک نیا مطالعہ، (طفیل آرٹ پرنٹرز سرکلر روڈ: لاہور، 1984ء)
رملی، خیر الدین، علامہ، بحر الرائق (دار الکتب العلمیہ: بیروت، 1993ء)
الزبیدی، محمود مرتضیٰ حسینی، (تاج العروس، دار الفکر، بیروت، 1994ء)
زبیر احمد، ڈاکٹر، عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ، (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1991ء)
زبیری، محمد امین، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مختصر تاریخ، (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، 1933ء)
الزرکشی، بدر الدین، الجر المحیط فی اصول الفقہ، (دار الکتب العلمیۃ، بیروت لبنان، 1411ھ)
الزیات، احمد حسن، الجمل فی تاریخ الادب العربي (مطبع امیریہ، قاہرہ، مصر، 1999ء)
السبکی، عبد الوہاب بن علی تاج الدین، جمع الجوامع، الاصل الرابع القیاس، (دار ابن حزم بیروت، 1387ھ)
السبکی، علی بن عبد الکافی، الابھاج فی شرح المنھاج، (دار المعرفۃ، بیروت، لبنان، 1399ھ)
السجستانی، سلمان بن اشعث، السنن ابی داؤد، (دار الکتب العربی، بیروت، 1988ء)
سرسید احمد خان، ابطال غلامی، (طبع شدہ محمد قادر علی خان: آگرہ، 1966ء)
سرسید احمد خان، اسباب بغاوت ہند، (مرتبہ، فوق کریمی (سرسید اکیڈمی: علی گڑھ، 1971ء)
سرسید احمد خان، تبین الکلام فی تفسیر التورات والانجیل علی ملۃ السلام، (دار المصنفین: اعظم گڑھ، 1988ء)
سرسید احمد خان، تحریر فی اصول التفسیر، (خدا بخش اورنٹل پبلک لائبریری: پٹنہ، 1992ء)
سرسید احمد خان، تفسیر القرن وھو الھدی والفرقان، (سرسید اکیڈمی: علی گڑھ، 1989ء)
سرسید احمد خان، تہذیب الاخلاق، (نازپبلیشنگ ہاوس: دلی، س۔ن)

سر سید احمد خان، خطبات احمدیہ، (ملی پبلیکیشنز: نئی دہلی، 1967ء)

سرہندی، شیخ احمد، شیخ مکتوبات امام ربانی، (مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی، 1976ء)

سلمٰی، عرام بن الاصبح، اسماجبال تھامہ وسکانھاومافیھا من القری، (الدار المصریہ اللبنانیہ، 2000ء)

سید عبد اللہ، ڈاکٹر، سر سید احمد خان اور ان کے رفقاء کا اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ، (ایجوکیشنل بک ہاؤس: علی گڑھ، 1994ء)

سید عبد اللہ، ڈاکٹر، سر سید کے ہم خیال علماء کے دینی نظریے، (اورینٹل پبلشرز: لاہور، 1992ء)

سید عبد اللہ، ڈاکٹر، ڈاکٹر سید عبد اللہ اور اردو کی خدمات، (مقتدرہ قومی زبان: پاکستان، 2003ء)

الشاطبی، ابی اسحاق ابراھیم بن موسی، الموافقات (ادارہ اسلامیہ دولہ قطر، 1421ھ)

شان محمد، ڈاکٹر، سر سید تاریخی اور سیاسی آئینہ میں، (ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، 1998ء)

شاہجہان پوری، عبد الحکیم اختر، مولانا احمد رضا خان کے رسائل، (مکتبہ حامدیہ: لاہور، 1988ء)

شاہجہان پوری، عبد الحکیم اختر، ابو سلمان، مولانا، شیخ الاسلام حسین احمد مدنی سیاسی مطالعہ، (مجلس یادگار شیخ الاسلام، پاکستان، 1993ء)

شاہجہان پوری، عبد الحکیم اختر، الاجازۃ الرضویہ لمبجل مکۃ البیحصیہ، (مکتبہ اعلیٰ حضرت: بریلی، 1327ھ)

شبیر احمد، قرون وسطیٰ کے ہندوستان میں فلسفہ وحکمت کا آغاز وارتقاء (اقبال ریویو، لاہور، 1976ء)

شورش کاشمیری، خطبات احرار، (مکتبہ احرار: لاہور، 1944ء)

شیخ الہند، محمود الحسن، مولانا، خطبہ صدارت مع فتوی، (از غنی المطابع، دہلی، 1339ھ)

شیر محمد اعوان، امام احمد رضا اور محاسن کنز الایمان (المیزان، 1396ھ)

صدیق حسن، مکی، ہمارے ہندوستانی مسلمان، (دار الکتب: لاہور، 2011ء)

صدیقی، عتیق، سر سید احمد خان ایک سیاسی مطالعہ، (مکتبہ جامعہ دہلی، 1977ء)

صدیقی، یسین مظہر، سر سید احمد خان اور علوم اسلامیہ (ادارہ علومِ اسلامیہ: علی گڑھ، 2002ء)

صدیقی، یسین مظہر، سر سید کے تفسیری اُصول (خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری: پٹنہ، 1999ء)

صدیقی، اقتدار حسین، سر سید احمد خان کا تاریخی شعور، (شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، 1987ء)

صفدر، محمد سرفراز خان، تفریح الخواطر رد تنویر الخواطر، (ادارہ نشر واشاعت نفرۃ العلوم، 1977ء)

ظفر الدین، مولانا، قادری، حیات اعلیٰ حضرت، (نعمانیہ بلڈنگ: لاہور، 1992ء)

ظفر چوہدری، ہندوستان کے لوگ (جنگ پبلیشرز لمیٹڈ، لاہور: طبع دوم، 2010ء)

عبد الوحید، خان، پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی شخصیت (انٹر نیشنل پبلیکیشن ہاؤس، ریاض، 2012ء)

عبید اللہ سندھی، مولانا، برصغیر میں تجدید دین کی تاریخ،(رحیمیہ مطبوعات:لاہور،2016ء)

عثمانی، قمر احمد، امام راشد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی،(فیروز سنز لمیٹیڈ،لاہور،1995ء)

الغزالی، ابو حامد محمد بن محمد، احیاء العلوم (پروگریسیو بک اردو بازار لاہور،2005ء)

الغزالی، ابو حامد محمد بن محمد، المستصفی، من علم الاصول،(مؤسسۃ الرسالہ بیروت،1997ء)

غلام حسین ذوالفقار، ظفر علی خان (خیابان ادب لاہور،1967ء)

فاروقی، برھان احمد، ڈاکٹر، قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل (ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور،1989ء)

فاروقی، ضیاء الحسن، فکر اسلامی کی تشکیل جدید (مکتبہ رحمانیہ،لاہور،2005ء)

فتح محمد ملک، اقبال کا فکری نظام اور تصور پاکستان (سنگ میل پبلشرز:لاہور،1997ء)

القادری، محمد طاہر، ڈاکٹر، تعلیمات اسلام (منہاج القرآن پبلیکشنز،لاہور،2005ء)

قاضی، جاوید احمد، برصغیر میں فکر اسلامی (پروگریسو بک ڈپو،لاہور، 2001ء)

قاضی البیضاوی، عمر بن عبد اللہ، انوار التنزیل واسرار التاویل، لبنان بیروت (دار الکتب العلمیہ،1408ھ)

القرطبی، ابو عبد اللہ محمد بن احمد، الجامع الاحکام القرآن (دار الکتب المصریہ، القاھرہ،1964ء)

القشیری، مسلم بن حجاج، الجامع الصحیح مسلم،(داروالاحیاء الثرات العربی، بیروت،1407ھ)

کاندھلوی، نور الحسن راشد، حالات طبیب قاسم نانوتوی،(کاندھلہ:انڈیا،2009ء)

الکرمانی، محمد بن، الکواکب، الدری فی شرح صحیح بخاری،(دار احیاء التراث العربی، بیروت،1414ھ)

گجراتی، امام دین، مجموعہ لیکچرز سرسید احمد خان،(سرسید اکیڈمی: علی گڑھ،1993ء)

گیلانی، مناظر احسن، حیات مولانا حکیم سید برکات احمد سید،(برکات اکیڈیمی، کراچی،2004ء)

گیلانی، مناظر احسن، سوانح قاسمی (مکتبہ دار العلوم، دیوبند،1955ء)

لاہوری، مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیاء (فیاض کرمانی پبلشرز لاہور،2005ء)

لطیفی، اعجاز انجم، ڈاکٹر، ڈاکٹر مسعود احمد کی ادبی اور علمی خدمات،(ضیاء الاسلام: کراچی،2002ء)

مبارک علی، ڈاکٹر، برصغیر میں مسلمان معاشرہ کا المیہ،(رنگارشات مزنگ روڈ:لاہور،1974ء)

مبارکپوری، قاضی اطہر، عرب وہند عہد رسالت میں،(ندوۃ المصنفین: دہلی،1962ء)

محبوب رضوی، سید، تاریخ دیوبند (دارالاشاعت: کراچی،1952ء)

محبوب رضوی، سید، تاریخ دار العلوم دیوبند،(ادارہ اہتمام دار العلوم، دیوبند،1993ء)

محمد اقبال، علامہ، بانگ درا،(ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ،1996ء)

محمد اقبال، علامہ، اسلام کے سیاسی تصورات،(نفیس اکیڈمی، حیدرآباد: دکن،1998ء)

محمد اقبال، علامہ، جاوید نامہ، (سنگ میل پبلیشرز، 1995ء)
محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال، (ایجو کیشن پبلشنگ ہاوس، دہلی، 2014ء)
محمد اقبال، علامہ، بال جبریل، (ایجو کیشنل بک ہاؤس: علی گڑھ، 2009ء)
محمد اقبال، علامہ، بانگ درا، (غلام علی سنز: لاہور، 1973ء)
محمد اقبال، علامہ، بانگ درا، (ایجو کیشنل بک ہاوس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ، 1955ء)
محمد اکرام، شیخ، موج کوثر، (ادارہ ثقافت اسلامیہ: لاہور، 2003ء)
محمد امین، امیر علی کی حیات و کردار (ساھتیہ پبلشر: دہلی، 1998ء)
محمد طیب، مولانا، قاری، روداد دار العلوم دیو بند، (رمز اہتمام دارالعلوم دیو بند، 1988ء)
محمد علی، چوہدری، ظہور پاکستان، (مکتبہ کاروان: لاہور، 1988ء)
محمد عمر دراز، دولتِ پرویز (النور پبلشرز: لاہور، 1992ء)
محمد مصطفی رضا خان، الطاری الداری لھفوات عبد الباری، رضا اکیڈمی: دہلی، 1974ء)
محمد میاں، سید، مولانا، علمائے حق (امرو یہ گیٹ: مراد آباد، 2000ء)
محمد میاں، سید،، تحریک شیخ الہند، (مکتبہ رشیدیہ، 2001ء)
محمد حمید اللہ، ڈاکٹر، خطبات بہاولپور، (اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور 1407ھ)
محمد عثمان، پروفیسر، فکر اسلامی کی تشکیل نو (سنگ میل پبلیکیشنز، 1975ء)
مدہولی، عبد الغفار، جامعہ کی کہانی، (قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان: نئی دہلی، 1953ء)
مدنی، حسین احمد، مولانا، نقش حیات، (دار الاشاعت: کراچی، 1979ء)
مدنی، حسین احمد، مولانا، تحریک ریشمی رومال، (مکتبہ محمودیہ کریم پارک، لاہور، 1993ء)
مصباحی، محمد یسین اختر، امام احمد رضا بریلوی ارباب علم و دانش کی نظر میں، (رضا اکیڈمی: اعظم گڑھ، 1977ء)
ملاجیون، شیخ احمد ابی سعد، نور الانوار شرح رسالۃ المنار، (دار الفاورق، عمان، الاردن، 1420ھ)
ملیح آبادی، آزاد کی کہانی (دار المصنفین: اعظم گڑھ، 1978ء)
منور حسین، ملفوظات امیر ملت، (مکتبہ اسلامیہ: لاہور، 1976ء)
منیری، شرف الدین احمد یحییٰ، مخدوم، مکتوبات صدی (اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، انڈیا: 1969ء)
مہر، غلام رسول، سید سر گزشت مجاہدین (شیخ غلام علی اینڈ سنز: لاہور، 1975ء)
مودودی، سید ابو اعلیٰ، مولانا، تجدید احیائے دین (مکتبہ جماعت اسلامی دار السلام جمال پور، پٹھان کوٹ، 1961ء)
مودودی، سید ابو اعلیٰ، مولانا، تفہیم القرآن (ادارہ ترجمان القرآن: لاہور، 2005ء)

مودودی، سید ابو اعلیٰ، مولانا، خلافت وملوکیت (اسلامیک پبلیکیشنز: لاہور، 1966ء)

مودودی، سید ابو اعلیٰ، مولانا، دینیات (مکتبہ جماعت اسلامی: لاہور، 1951ء)

مودودی، سید ابو اعلیٰ، مولانا، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی (مکتبہ جماعت اسلامی: لاہور، 1955ء)

مودودی، سید ابو اعلیٰ، مولانا، اسلامی تہذیب کے اصول مبادی، (اسلامک پبلیشرز لمیٹڈ: لاہور، 1955ء)

مودودی، سید ابو اعلیٰ، مولانا، تحریک آزادی ہند اور مسلمان (اسلامک پبلیشرز شاہ عالم مارکیٹ: لاہور، 1958ء)

مودودی، سید ابو اعلیٰ، مولانا، جہاد فی الاسلام (دار المصنفین، علی گڑھ، 1976ء)

مودودی، سید ابو اعلیٰ، مولانا، مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش (ادارہ ترجمان القرآن: پٹھان کوٹ، 1956ء)

مولوی، محمد حسین، الملفوظ، (حسینی پریس بریلی)، 1956ء)

میرٹھی، عاشق الٰہی، تذکرۃ الرشید، (کتب خانہ، اشاعت العلوم: سہارن پور، 1997ء)

ناصر، نصیر احمد، ڈاکٹر، اسلامی ثقافت، (مکتبہ رحمانیہ اردو بازار، لاہور، 1980ء)

نانوتوی، محمد یعقوب، مولانا، سوانح عمری مولانا محمد قاسم، (مطبع مجتبائی: دہلی، 1976ء)

ندوی، الو الحسن علی، تاریخ دعوت وعزیمت (مکتبہ اسلام اردو بازار، لاہور، 1999ء)

ندوی، الو الحسن علی، سیرت سید احمد شہید (مجلس تحقیقات ونشریات اسلام: لکھنو، 1986ء)

ندوی، مسعود عالم، مولانا، برصغیر ہند وپاکستان میں اسلامی تحریک کی تاریخ (اسلامک پبلیشرز، لاہور، 1972ء)

ندوی، مسعود عالم، مولانا، ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، (مکتبہ ملیہ اردو بازار: راولپنڈی، 1994ء)

ندوی، محمود حسن، سید، تذکرہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی، (سید احمد شہید اکیڈمی: بریلی، 1986ء)

ندوی، ابو الحسن، سید، سیرت سید شہید، (مکتبہ اسلام لکھنؤ، 1968ء)

ندوی، ابو الحسن، سید، اسلامی تہذیب وثقافت (دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی یونیورسٹی، اسلام آباد 1998ء)

ندوی، ابو الحسن، سید، تکملہ نزہۃ الخواطر وبھجۃ المائع والنوظر، لعبد الحی الحسینی (دار ابن حزم، بیروت، 1991ء)

ندوی، ابو الحسن، سید، نزہتہ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر، (مقبول اکیڈمی: لاہور، 1976ء)

ندوی، سید سلیمان، حیاتِ شبلی (دار المصنفین شبلی اکیڈمی، 1997ء)

ندوی، سید سلیمان، عرب وہند کے تعلقات، (درالمصفین، اعظم گڑھ، 1974ء)

ندوی، محمد فہیم اختر، فقہ اسلامی تعارف اور تاریخ (مکتبہ قاسم العلوم: لاہور، 2004ء)

نذیر، نیازی، سید، تشکیل جدید الہیات الاسلامیہ، (اسلامک بک سنٹر، دہلی، 1986ء)

نصر، سید حسین، جدید دنیامیں روایتی اسلام (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1992ء)

نظامی، خلیق احمد، مکتوبات: شاہ ولی اللہ، (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)، 1978ء)

نظامی، خلیق احمد، سر سید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے،(انجمن ترقی اردو نئی دہلی، 1993ء)

نظامی، خلیق احمد، شاہ ولی اللہ اور اٹھارہویں صدی کی سیاست (مکتبہ رحمانیہ اردو بازار: لاہور، 1951ء)

نعمانی، شبلی، مولانا، الفاروق (دار الاشاعت: کراچی، 1992ء)

نعمانی، شبلی، مولانا، حقوق الذمین،(دار المصنفین: اعظم گڑھ، 1995ء)

نعمانی، شبلی، مولانا، سیرۃ النبی ﷺ (دار المصنفین، اعظم گڑھ، 1999ء)

نعمانی، شبلی، مولانا، علم الکلام،(ادارہ دار المصنفین: اعظم گڑھ، 1993ء)

نعمانی، شبلی، مولانا، علم الکلام،(مسعود پبلشنگ ہاؤس: کراچی، 1976ء)

نعمانی، شبلی، مولانا، الغزالی (دار المصنفین شبلی اکیڈمی: اعظم گڑھ، 1989ء)

نعمانی، شبلی، مولانا، مقالات شبلی (دار المصنفین اعظم گڑھ، 1986ء)

نقوی، سید نور الحسن، ڈاکٹر، سر سید اور ہندوستانی مسلمان،(ایجوکیشنل بک ہاؤس: علی گڑھ، 1989ء)

نیازی، شیخ کوثر، امام احمد رضا بریلوی و شخصیتہ الموسوعہ،(رضا اکیڈمی: لاہور، 1995ء)

الہجویری، ابو الحسن علی بن عثمان، کشف المحجوب،(اسلامک بک فاونڈیشن لاہور، 1985ء)

ولی اللہ، شاہ، ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء (دار القلم: دمشق 1998ء)

ولی اللہ، شاہ، حجۃ البالغۃ،(قومی کتب خانہ، لاہور، 1953ء)

ولی اللہ، شاہ، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر مع فتح الخبیر (مقدمہ، سنگ میل، لاہور، 1383ھ)

- Ameer Ali, Syed, (1902)*The Spirt of Islam (Published by forgotten Boblesk Ergod.*
- Brown, *The Darvashes,(* 1997*) In Islam's Muslim Rules in India, Muqtadira Islamrabad.*
- Dani, Ahmed Hasan:ed:(1975)*Proceeding of The first congress of Pakistan, History & Culture Unversit of Islamabad·*
- Gopal, *Ram Indian Muslim. A Political History (Lahore book traders)*
- https://dictionary.cambridge.org/dictionary/english-arabic/renovation date: 10 Oct. 2023
- Iqbal, Muhammad, Dr, *The Recontstuction of Religios Thought in Islam, (Institute of Islamic Culture)*
- Molvi, chiragh Ali, *Perposed Political, Legal and Social reforms undere Moslem Rule*
- Nadvi, Abul Hassan, *Saviors of Islamic Spirit, Volume, iv, Hakim-ul-Islam Shah Waliullah (Academy of Islamic Research & PublicityNadw: India*

- Oxford English, *Dictionary*, *Oxford University Press*, Krachi, Pakistan 2013
- Shah Wiliullah Dehlvi,(2005) *Izalat-ul-khufa (Qadimi Kutbkhana : Karachi),*
- *The Oxford English Dictionary*, 2nd Edition, Oxford Press 1989
- W.W. Hunter, *The Indian Musalmans* (1-e)
- William Wilson Hunter,(1876) *The Indian mustin Musalmans (SANI. H. PANHWAR (Truber and company*: London).